زمانہ

مرتبہ دیا نراین نگم۔ بی۔ اے

نمبر ۱	جنوری سنہ ۱۹۲۳ء	جلد ۴۰

فہرست مضامین

تصاویر (۱) از محبت (۲) مقبرہ شہنشاہ اکبر (۳) غازی مصطفیٰ کمال پاشا اور آنکے ساتھی (۴) سر جیمس مسٹن اور آنکی اہلیہ و فرزند

قیمت سالانہ ۶ر
قیمت فی پرچہ ۱۲

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

معمولی اڈیشن

قیمت — ... سالانہ ... ششماہی ... ہندوستان کے لئے ششماہی ...

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم - بی - اے

جلد ۴۰ | فروری ۱۹۲۳ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

تصویر - اُمید

قیمت سالانہ ٥ر - قسم اعلیٰ ۸ر | زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا | قیمت فی نمبر ۸/-

معمولی اڈیشن

قیمت ممالک غیر سے ملے ۔ سالانہ ششماہی ۔ ہندوستان کے لئے ششماہی

[illegible]

دواخانہ فراق

[illegible]

جناب خواجہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کے کمالات سے سارا ہندوستان خبردار ہے۔ جس طرح آپ ایک انشا پرداز اور شاعر جادو نگار اور ایک صوفی صافی ہیں۔ اسی طرح آپ ایک طبیب ایک حکیم ایک معالج بالیاقت ہیں۔ اور اسی فن کے تجربہ میں ساری عمر گذاری ہے۔ آپ نے ہندوستان اور ممالک میں چل پھر کر اور مقامات کے طول البلد عرض البلد کو جانچ کر دوائیں بنائی ہیں اسی سبب سے دو چند فائدہ کرتی ہیں۔ اور ایک دواخانہ آپ نے قائم کیا ہے جس میں آپ کے مجربات اور ہر قسم کی ادویہ مہیا ہیں اور سب کی سب سچی اور بے ضرر ہیں۔ اس دواخانہ کی غائت یہی ہے کہ مخلوق اُن لوگوں کی جھوٹی دواؤں سے اپنے تئیں محفوظ رکھے جو نہ حکیم ہیں نہ ڈاکٹر ہیں بلکہ [illegible] روپیہ کمانے کے لئے جال پھیلا رہے ہیں۔ اگر سچی اور اچھی دوا گھر بیٹھے منگا کر صحت و سلامتی کے طالب ہیں تو حضرت فراق کے دواخانہ سے منگائیے۔ اس دواخانہ میں اتنی دوائیں مہیا کی گئی ہیں کہ اگر سب کی تفصیل لکھی جائے تو بڑی کتاب بنے بالفعل چند مجربات کے نام اور مختصر افعال و خواص ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔ باقی اہل حاجت کو جس قسم کی دوا مطلوب ہو بذریعہ ویلیو طلب فرمائیں۔ فوراً تعمیل ہوگی۔

حب اشراق۔ یہ گولیاں اپنی تاثیرات میں نادر اور یکتا ہیں انسان کے جملہ مرض اور بیماریوں پر حاوی ہیں۔ عورت مرد جوان بوڑھے بچے کو ہر موسم ہر زمانہ میں مفید ہوتی ہیں۔ سوداوی بلغمی دموی صفراوی ریاحی شکائتیں دور ہو جاتی ہیں۔ خون صاف ہو کر رنگ انار کے دانہ کی طرح سرخ ہو جاتا ہے۔ بھوک لگتی ہے۔ نیند وقت پر آتی ہے۔ قبض کو دفع کرتی ہیں۔ اگر پیشاب زیادہ ہو تو باندھ دیتی ہیں۔ [illegible] [illegible] ہو جاتے ہیں۔ اولاد تندرست پیدا ہوتی ہے۔ ایک چلہ تک انکا استعمال ضرور ہے۔ پرہیز مطلق نہ کیجئے۔ یہ دوا الا ثانی اور [illegible] پرانے ناسور بھگندر دیرینہ زخم ایک چلہ میں جاتے رہتے ہیں۔ جس شیشی میں اسی گولیاں ہیں اسکی قیمت علاوہ [illegible] اور جس شیشی میں چالیس گولیاں ہیں اسکی قیمت ایک روپیہ محصول اور خرچ بہر حال بذمہ خریدار ہوگا۔

لذت جان۔ بسا اوقات میاں بیوی تخلیہ کرتے ہیں اور کچھ لذت و لطف حاصل نہیں ہوتا اور اسی باعث سے اولاد کو ترستے ہیں۔ یہ دوا [illegible] لطف انگیز ہے اور عیش پرستوں کیلئے تو گویا لطف جنت پیدا کر دیتی ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ علاوہ محصول ڈاک

عرق [illegible] ہر قسم کے بخاروں کیواسطے سوائے دق کے بخار کے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت فی شیشی خورد ایک روپیہ۔ بڑی شیشی دو روپیہ علاوہ محصول

آنکھوں کا [illegible] **علاج**۔ آنکھوں میں پانی نہیں اُترنے دیتا۔ اُترا ہوا رک جاتا ہے۔ جالا۔ دھند۔ نگاہ کی کمزوری۔ رتوندہ۔ یا سی دکھائی ناخنہ۔ اور ہر طرح اور ہر قسم کی آنکھوں کی بیماریاں کھو دیتا ہے۔ رعایتی قیمت ایک روپیہ (عہ)

طلائے احمر [illegible]۔ مقوی باہ دوا ہے۔ اسکی خوبی اسکے نام سے ظاہر ہے۔ قیمت فی شیشی تین روپیہ (سے)

سانس دمہ ضیق النفس۔ تر ہو یا خشک نیا ہو یا پرانا تین روز میں افاقہ ہو کر صحت ہو جاتی ہے۔ رعایتی قیمت ایک روپیہ (عہ)

امساک۔ بسبب رقت اور کمزوری کے سرعت انزال کی شکائت پیدا ہو کر لذت نہیں ہونے دیتی آزما کر دیکھئے عجیب چیز ہے قیمت رعایتی ایک روپیہ عہ

سلیمانی۔ ہیضہ۔ بدہضمی۔ قے۔ طاعون۔ اور حشرات الارض کے کاٹنے کو خون کے فساد معدہ کی خرابی کو دور کرتا ہے قیمت عہ

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی۔ اے

نمبر ۵	مئی ۱۹۲۳ء	جلد ۴۰

فہرست مضامین

قیمت سالانہ ۵ر قسم اعلیٰ ۶ر

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت فی پرچہ ۸/

قیمت معمولی اڈیشن
ممالک غیر سے ۷ر سالانہ سکہ شاہی ۵ر و للعہ ۔ ہندوستان کے لیے سکہ شاہی سے ۳ر و ۵ر

زمانہ

جلد ۴۰ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء

مقبرۂ شہنشاہ اکبر

نوشتہ

حکیم سید شمس اللہ قادری

ایم-آر-اے-ایس-ایف-آر-ایچ-ایس

آگرہ کے پاس ایک قصبہ ہے - جسے سکندرہ کہتے ہین - اسکو سلطان سکندر لودھی نے آباد کیا تھا - شہنشاہ اکبر اپنی حکومت کے اخیر زمانہ مین جب آگرہ مین رہنے لگا - تو سکندرہ مین ایک باغ بنوایا - اور اسکا نام بہشت آباد رکھا - باغ مین اپنے دفن ہونے کیلیے ایک مقبرہ کی تعمیر شروع کی مقبرہ ابھی ناتمام تھا کہ (۱۳ جمادی الثانی سنہ ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۶ - اکتوبر ۱۶۰۵ء) کو اکبر کا انتقال ہو گیا[۱] - اور لاش اسی مقبرہ مین دفن کی گئی - بقیہ عمارت کو شہنشاہ جہانگیر نے مکمل کرایا تعمیر کا کام سنہ ۱۰۲۱ھ مین اختتام کو پہونچ چکا - جہانگیر نے تزک مین جلوس سوم کے حالات لکھتے ہوے اس مقبرہ کا حال اس طرح بیان کیا ہے - [۲]

روز دوشنبہ ہفتم ماہ رجب سنہ ... بارادہ بقصد زیارت روضۂ منورۂ حضرت

۱؎ دیباچہ تزک جہانگیری صفحہ ۱۸ ۲؎ تزک جہانگیری صفحہ ۴۳ ترجمہ اردو صفحہ ۴۲

عرش آشیانی متوجہ شدم - اگر میسری بود این راہ بہ سر می پیمودم - حضرت والد
بزرگ وارم بجہت ولادت من از فتح پور بہ اجمیر کہ ایکصد و بست کروہ است - پیادہ
بزیارت حضرت خواجہ بزرگ وار خواجہ معین الدین چشتی متوجہ گشتہ بودند - اگر من
بسر و چشم این راہ بہ پیمایم ہنوز چہ کردہ باشم - چون بسعادت زیارت مشرف شدم
و عمارتی کہ بر روضۂ منورہ شدہ بود - دیدم نوعی کہ خاطر خواہ من بود - بنظر در نیاید -
چرا کہ منظور آن بود - کہ روندہای عالم مثل این عمارت در معمورۂ دنیا نشان ندہند
چون در اثنائے عمارت مذکور از خسرو بے طالع این نوع امری بظہور آمد و بالضرورت
روانہ لاہور گشتم - معماران بسلیقہ خود یک طوری ساختہ بودند - آخر الامر بعضے تصرفات
نمودہ شد - باآنکہ مبلغ کلی صرف نمودہ - سہ چہار سال کار کردہ بودند - فرمودم کہ
دیگر بارہ معماران ماہر باتفاق مردم صاحب وقوف بعضے جاہا را بنوعی کہ قرار باید
بیندازند - رفتہ رفتہ عمارت عالی سامان پذیر گردد - و باغی در غایت صفا بر دور
عمارات مقبرۂ منورہ ترتیب یافت - و دروازہ در نہایت رفعت و عظمت مشتمل
بر مینارہا از سنگ سفید ساختہ پرداختہ شد - مجملاً پانزدہ لک روپیہ کہ موازی پنجاہ
ہزار تومان رائج ایران و چہل و پنج لک خانی مطابق زر توران بودہ باشد -
خرچ این عمارت عالی بمن شنوانیدند -

باغ (۱۵۰) ایکڑ زمین پر واقع ہے - اسکے اطراف کنگرہ دار دیوار بنی ہوئی ہے - اسمین
چارون طرف چار دروازے (۷۰) فیٹ اونچے بنے ہوئے ہین - انمین تین دروازے مسدود
اور محض برائے نمود ہین - جنوبی دروازہ مفتوح ہے - اسی سے آمد و رفت رہتی ہے - دروازے
کے بالائی حصہ مین نقارخانہ بنا ہوا ہے - اور اسکے چارون جانب چار مینارے ہین جنکے بالائی
حصہ کو بھرت پور کے جاٹون نے توڑ ڈالا ہے - باغ کے وسط مین مقبرہ ہے - اسکی عمارت سنگ سرخ
سنگ مرمر - سنگ موسی - سے تیار ہوئی ہے - اور تعمیر مین ہندو مسلمان دونون کے طرز تعمیر کا
پیوند لگایا گیا ہے - مقبرہ کی عمارت دو منزلہ ہے - اسکی بنیاد (۳۲۰) فیٹ مربع زمین پر رکھی
گئی ہے - اصل قبر عمارت کے نیچے تہ خانہ مین ہے - تعویذ اوپر ہے جسپر کوئی گنبد یا سقف نہین ہے

بلکہ آسمان کے نیچے کھلا ہوا ہے۔ اکبر کی قبر کے اطراف متعدد جالیاں بنی ہوئی ہیں مشرقی جالی میں آرام بانو بیگم اور مغربی جالی میں شکر النسا بیگم کی قبر ہے۔ اس کے پاس سلیمان شکوہ اور اسکی بیوی مدفون ہیں۔ انکے علاوہ چند اور قبریں بھی ہیں۔ مگر انپر کوئی کتبہ وغیرہ نہیں ہے۔ ان قبروں کے پاس ایک اور مقبرہ بنا ہوا ہے۔ اسمیں رقیہ سلطان بیگم مدفون ہیں[۱] عام طور پر مشہور ہے۔ کہ یہ قبر اورنگ زیب (عالمگیر) کی بڑی لڑکی زیب النسا بیگم کی ہے لیکن یہ غلط ہے۔ اسکا مقبرہ دہلی میں کابلی دروازہ کے باہر ہے جو ۱۱۱۳ھ میں تیار ہوا ہے۔ اور اسمیں قبر کے سرہانے یہ کتبہ لگا ہوا ہے[۲]

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ کل من علیہا فان۔ ہذا مرقد البنت الکبری للعبد المذنب العاصی وہی المغفوفہ۔ برحمۃ الرحیم الکریم الحافظ۔ زیب النساء المرحوم من عباد اللہ الصالحین۔ یدعوا لہا بالغفران الرضوان۔ تاریخ وفاتہا بقولہ سبحانہ ادخلی جنتی

شکر النسا بیگم اور آرام بانو بیگم کے متعلق شہنشاہ جہانگیر نے اپنے تزک میں حسب ذیل حالات لکھے ہیں[۳]

بعد از تولد دانیال از بی بی دولت شاد دختری متولد گشت شکر النسا بیگم نام نہادند۔ چون در دامن تربیت والد بزرگوارم پرورش یافت۔ بسیار خوب بیار آمد۔ نیک ذاتی و رحم بعموم خلایق فطری و جبلی اوست۔ از ایام خردی و طفلی سالی تا حال در محبت من بے اختیار است۔ این علاقہ میان کم خواہری و برادری خواہد بود۔ در طفلی اول مرتبہ چنانچہ عادت است۔ کہ سینہ اطفال می فشارند و قطرۂ شیری ازان ظاہری گردد۔ سینہ خواہر را فشردند۔ قطرۂ شیر بر آمد۔ حضرت والد بزرگوارم بمن فرمودند کہ بابا این شیر را بخور تا در حقیقت این خواہر تو بجائے مادر تو ہم باشد۔ عالم السرائر داناست کہ ازان روز باز کہ آن قطرۂ شیر را نوشیدہ ام با علاقہ خواہری و دختری مہری کہ فرزندان را با مادران می باشد۔ آن مہر را در خود ادراک می نمایم۔

---

[۱] تاریخ آگرہ صہ ۱۲۴ [۲] آثار صنادید صہ ۴ باب سوم [۳] تزک جہانگیری صہ ۱۷

بعد از چند دختر دیگر ہم از بی بی دولت شاد مذکور بعالم وجود آمد و بآرام بانو بیگم
مسمّٰی گردید۔ مزاجش فی الجملہ بگرمی و تندی مائل است پدرم او را بسیار دوست
می داشتند۔ چنانچہ اکثر بے ادبیہا او را بنج ادب برمیداشتہ و در نظر مبارک ایشان از
غایت محبت بدنمی بود۔ مکرر مرا سرافراز ساختہ می فرمودند کہ بابا بجہت خاطر من باین
خواہر خود کہ بعرف ہندوان دلا من است یعنی عزیز پروردہ بعد از من می باید
بروشی سلوک کنی۔ کہ من یادی کنم۔ نازِ او را برداشتہ بے ادبیہا و شوخیہا او بگذرانی۔

جہانگیر کے حکم سے مرزا محمد ہادی نے تزک کا جو تکملہ لکھا ہے اسمین تحریر ہے ۔ کہ ہشتم ماہ تیر سنہ ۱۰۳۳ فصلی
کو عارضہ اسہال سے آرام بانو بیگم کا انتقال ہوا ۔ اسوقت اسکی عمر ۴۰ سال کی تھی[1] ۔ بلاک مین نے
لکھا ہے شکر النساء بیگم کا نکاح سنہ ۱۰۰۱ھ مین مرزا شاہ رخ بن ابراہیم سے ہوا تھا[2]
مرزا سلیمان شکوہ ۔ شاہ عالم بادشاہ کا لڑکا ہے ۔ اور ۲۹ ۔ ذیقعدہ ۱۲۵۳ھ کو آگرہ مین
اسنے وفات پائی ہے ۔

رقیہ بیگم مرزا ہندال کی لڑکی اور شہنشاہ اکبر کی پہلی بیوی ہے ۔ ۷ ۔ جمادی الاول سنہ ۱۰۳۵ھ
م ۱۹ جنوری ۱۶۲۶ء کو آگرہ مین اسکا انتقال ہوا ہے ۔ معتمد خان نے اقبال نامہ مین اسکے
حسب ذیل حالات لکھے ہین ۔

در ین تاریخ (روز شنبہ ہفتم جمادی الاول سنہ ہزار و سی و پنج) خبر رسید کہ رقیہ سلطان بیگم
صبیہ مرزا ہندال منکوحہ عرش آشیانی انار اللہ برہانہ در دار الخلافت اکبر آباد بجوار
مغفرت ایزدی پیوستند۔ زن کلان آنحضرت ایشان بودند۔ چون ایشان فرزند
نداشتند۔ در زمانی کہ شاہجہان از صبیہ موتہ راجہ بعالم وجود آمدند۔ حضرت
عرش آشیانی آن یکتائے گوہر خلافت را بشکوئے تربیت بیگم بردند۔ آن پیرآرائے
خلوت سرائے قدس متکفل تربیت شہزادہ والا گہر شدند۔ آن صاحبہ در ہشتاد
و چہار سالگی بہ نہانخانہ عدم شتافتند[3]

بلاک مین نے آئینہ اکبری کے ترجمہ مین اور مسٹر بیورج نے ہمایون نامہ کے ضمیمہ مین رقیہ بیگم کے

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۳۹۵ ترجمہ اردو صفحہ ۲۲۶ [2] بلاک مین ۔ ج ۱ ۔ صفحہ ۳۱۰ [3] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۲۵۱

مفصل حالات لکھے ہین[1]۔ جہانگیر نے اپنی تزک مین لکھا ہے۔ کہ ۱۰۱۶ھ مین رقیہ بیگم نے اپنے والد ہندال مرزا کے مقبرے کو کابل مین تعمیر کروایا۔ جب مقبرہ تیار ہو گیا۔ تو اس کے پاس ایک مقبرہ خاص اپنے لیے بنوایا۔ اسکے دروازے پر جو کتبہ کندہ ہے۔ اُسے پروفیسر وارسٹیئر نے فرانس کے مشہور رسالہ ایشیا مین شائع کیا ہے[2] جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ عمارت ۱۰۲۲ھ مین بنی ہے۔ رقیہ بیگم کا جب انتقال ہوا تو اُسکی لاش سکندرہ مین سپرد خاک کی گئی۔ پھر ایک عرصہ کے بعد اُسے لے جا کر کابل مین خاص اُسکے بنائے ہوئے مقبرہ مین مدفون کیا۔

دروازے کی پیشانی پر باہر کی جانب حسب ذیل ابیات بخط نستعلیق کندہ ہین۔

طاقی کہ از رواق نہم چرخ بہتر است ٭ روشن ز سایہ اش رخ تابندہ دختر است

این طاق زیب نہ فلک و ہفت کشور ہست ٭ از روضۂ منورۂ شاہ اکبر است

ان ابیات کے ہر دو جانب بخط طغرا یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

شمال جانب

دوام و فلک قایم و بقائے نیست کس را ۔ خدا را ست بقاے ملک قدیم و دوام این ریاض فیض بخش بہشت مثال و این روضۂ متبرکہ فردوس تمثال مرقد مطہر و مضجع منور شاہ عالیجاہ خلد آرام گاہیست۔ کہ قعر رفیعش قدر پرواز اوج نوشش لازم الاعزاز است و بہشت آباد خلد بش و حریم کعبہ سعادت و قبلۂ اقبال تاج بخش سلاطین کامگار تخت نشان خواقین عالی مقدار مجدد سعادت کمال مجدد جہان اقبال صاحبقران ہمایون فرماصی ماثر کسری او قیصر احمی دارائے کسری حشمت آسمان جاہ ابو الغازی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کہ گوہر افسر تاجداران و افسر تارک جہانداران بود۔ و بعد از مدت پنجاہ و دو سال قمری کہ بہ یمن مواہب ایزدی با سطوت و حشمت جمشیدی و شکوہ و شوکت سلیمانی بر فراز تخت سلطنت و کامرانی نشست

---

[1] بلاک مین صفحہ ۳۰۹ و صفحہ ۳۰۹ و صفحہ ۵۰۹ و ہمایون نامہ صفحہ ۲۷۴ [2] رسالہ مذکور سلسلۂ ہشتم جلد یازدہم بابتہ ۱۸۸۸ء صفحہ ۲۹۵

و در تقدیم شرائط جہانبانی و مرحلہ پیمائے سنین عمر مبارکش از حدود ستین در مرحلہ شمسی گشت در چہارم ماہ آبان کہ صبح ولادت آن سپہر منزلت از افق تائید الٰہی طالع شدہ بود۔ موافق تاریخ دوازدہم شہر جمادی الآخر سنہ ہزار و چہاردہ ہجری بمقتضاے سنہ سنیہ سبحانی کہ در عرصہ گیتی دولت خانہ ہیچ شہریاری کامکاری نیست کہ خانہ تقدیر ازلی بر پیش طاق آن آیۂ کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ نہ نوشتہ و قصر ہیچ جلال صاحب اقبالی نماندہ کہ رقم قصر بہ کتابہ آن نبعت نہ گشتہ۔

درین حدیقہ بہار و خزان ہم آغوش ست زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

ازین عالم بیدار و خاکدان بے اعتبار کہ خلعت گاہ بسی وسلم و تورو خوابگاہ چندین قیصر و فغفور است۔ روے توجہ و التفات گردانیدہ بمشاہدہ جمال اجلال حی لایموت پرداخت۔ دو داعی واللہ یدعوا الی دارالسلام را بہ لبیک اجابت استقبال بمودائے ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ۔ رخت اقامت ازین جہان بے استقامت بربست و از طریق مضیق کدورات جسمانی تحیرو جنۃ قرین الانصاف درجات عملیہ در جوار مسند ملک منانی عفو غفران نشست۔ کتبہ عبد الحق شیرازی فی ۱۰۲۲

شاہ اکبر ز روے دانائے گو بظاہر ز دہر فانی رفت

دولتش بے زوال بود از ان دل بہ دنیائے باز دل نہ بہ بست

مرغ روحش چو بود طائر عرش رفت بہ آشیان خویش نشست

جانب جنوب

بیامن توفیقات صانع جہان آفرین کہ نہ بقیاس مہندس کامل خود ساخت بارگاہ کبریائی جلالش توان بمود۔ و بدستیاری معمار خیال و وہم مدروج بر معارج قصر عزت بیمثالش توان نمود۔ جل جلالہ این احاطہ ادراک بکنہ کمالہ این طاق رفیع و ایوان منیع کہ نقش کتابہ آن تعلیم رقم تزئین ابداع و تکوین یافتہ مناظر بدیعش و در قصر این رواق بمثل طاق زر اندود دست رضوان بلاجورد ولاکتابہ اش دام لک العزو البقا تحریر کردہ با اصل این عمارت عالی بنیاد فیض نہاد کہ

رسانندش فطرت ارجمند خاقان جہانگیر جہان ستان سلطان المعظم اعدل رفیع الشان ممہد قوانین عظمت و کشور کشائی موسس قواعد حشمت و فرمانروائے فہرست مکارم اخلاق قانون بخش ناظم آفاق شاہ بادپیم و فروگاہ خسرو پدر زیدہ بادشاہ بر آفاق ظل ہمائے گستردہ در آن پناہ خلق خدائے آسودہ صدر آرائے بارگاہ جاہ و جلال مسند نشین شرف و اقبال دارا شکوہ سکندر ظفر نوشیروان عدالت سلیمان حشر قدر قدرت قضا اقتدار کیوان رفعت عالمدار صاحبقرانی کہ بافر ہمایونی لوائے دولت جہانگیری از شرفات سماک گذرانیدہ و آوازہ عدالت گستری بذروہ افلاک برسانیدہ برایوان قدرش چون فلک صدپردہ دار بر سر بام جلالش چون زحل صد پاسبان شہنشاہ مجاہ فلک بارگاہ السلطان بن السلطان الخاقان بن الخاقان بن الخاقان ابو المظفر نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی بہ نسبت نبوت و جہانشینی نزوع بخش دودمان رفعت اقتران سلطان السلاطین جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازیست و از حیثیت سروری و سرفرازی نقاۃ خاندان سعادت بنیان صاحبقرانی و چنگیز خانی در سنہ ہفت جلوس مبارک جہانگیری موافق ۱۰۲۲ہ ہزار و بست و یک ہجری در ہفت سال صورت تمام اتمام و کتابہ اختتام یافت ؛

۱۰۲۲ ء

کتبہ عبد الحق بن قاسم الشیرازی

دروازہ کے اندر یہ ابیات بہ خط نستعلیق مرقوم ہیں ۔

بفرمان شاہنشہ ذوالجلال	کہ باشد شہنشاہیش بیزوال
شد آراستہ آن چنان روزگار	کہ حیران شد اندیشۂ ہوشیار
بگیتی ز فیض ازل بادشاہ	بود سایۂ نور ذات الٰہ
چو از دہر آن سایہ گردون نہان	فتد سایۂ دیگر اندر جہان
بدین سان بود تا سر انجام کار	بہ نزد خرد گردش روزگار
زمانہ دگرگون ہر نفس	نگیرد بیک گونہ ہا ہیچ کس

فلک مرتبہ اکبر عرش گاہ | کہ از ہیبتش کوہ گشتی چو گاہ
نشستی چو بر تخت شاہنشہی | گرفتی جہان فر ظل الٰہی
فروزندۂ افسر و تخت و بور | کریم و رحیم و جوان بخت پور
دل روشن و جان آگاہ داشت | جہان خورد و داد و گرفت و گذاشت
بباغ جہان تخم نیکی بکشت | بر آن گرفت از ریاض بہشت
ز ذاتش چو انوار خورشید و ماہ | فروزندہ یاد از نور نور الٰہ

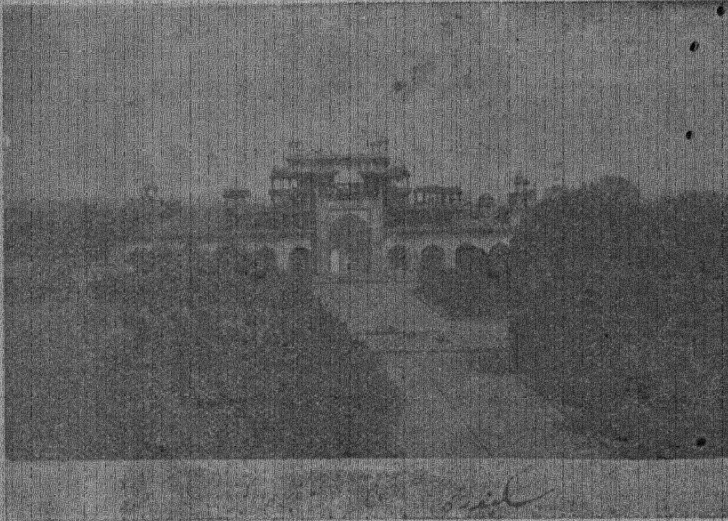
تعویذ پر باری تعالیٰ کے نود و نو نام کندہ ہین۔ جانب بالین اللہ اکبر اور جانب پائین جل جلالہ لکھا ہوا ہے۔ اسکا نقشہ صفحہ آخر پر تحریر ہے۔ قبر کے اطراف احاطہ کی جو دیوار ہے۔ اس پر چارون طرف حسب ذیل ابیات مسطور ہین۔

جانب مغرب

بنام شہنشاہ ملک قدم | کہ ذاتش مبرا بود از عدم
ہمہ بادشاہان روی زمین | زہ صاحب تاج و تخت و نگین
کند از عدم آشکارا وجود | بود ذات او مظہر عدل و جود
ز لطفش کہ دستہ طلبگار کام | بود درگہش قبلہ خاص و عام
نگارندۂ جوہر آب و خاک | طرازندۂ گوہر جان پاک
دو عالم ز فیض ازل آفرید | یکے کرد پنہان و دیگر پدید
ببخشد انکہ سرای سپنج | بشاہان با افسر و تاج و گنج
کہ از عدل ایشان شود روزگار | شگفتہ تر از باغ در نوبہار
داوری را چو گیرند پیش | شناسند بیگانہ راہم چو خویش

جانب جنوب

شہی کو چنین زیست در روزگار | بود سایۂ ذات پروردگار
ز نہصد فزون بود شصت و دو سال | کہ شاہ اکبر آن سایۂ ذو الجلال
بہ بالای زین سینہ سرور نشستہ | کہ بر تخت او گشت افلاک پست



سکندره ـ مقبره اکبر

جہان را بیاراست از عدل و داد — دل اہل عالم از و گشت شاد

بر پایہ تختش از بہر گودہ — شدہ جمع مردان صاحب شکوہ

بہر ار فگندی نظر سوے خاک — بگو ہر شدی بہتر از جان پاک

گرفتی بیک حملہ ملکی بہ رزم — بایماے ابرو بہ داوی بہ بزم

چو لطف خدا از عام بود — ہر کار چشمش بہ انجام بود

بدرگاہ او ہر کہ بودی پناہ — چو اندیشہ رفتے ز ماہی بماہ

جانب مشرق

چنان پر شد آوازہ اش در جہان — کہ در دل نگنجید راز نہان

بہ پرداخت آن گونہ روے زمین — کہ کرد آفرینش جہان آفرین

بہ گیتی دو افزون پنجاہ سال — چنین کرد شاہی ز روے جلال

چو از عدل آباد کرد این جہان — سوے آن جہان رفت روشن روان

شہ ہفت کشور از ین پیش بود — کنون ہشت جنت مسخر نمود

بہ نزد خرد مند ہشیار دل — سرائیست این عالم آب و گل

مجو مہر از جوہر نہ سپہر — کہ با کس بپایان نہ برداشت مہر

سپہر است پر کینہ مہر مدار — کہ با کینہ در مہر ناید بکار

جہان است مانند موج سراب — وز ان تشنہ دل کے شود کامیاب

جانب شمال

بہ بست است پیمان کس روزگار — کہ نشکست آن را بہ ہنگام کار

نماند بہ گیتی کسے جاودان — ز دست اجل کس نبرد ست جان

چہ خوش گفت آن کامل نکتہ سنج — کہ از گوہر دانش اندوخت گنج

جہان است بر او نماند بہ کس — دل اندر جہان آفرین بند و بس

شد از عدل شاہ اکبر کامگار — بسان بہشت برین روزگار

جہان گشت خرم بدوران او — زمین و زمان شد بفرمان او

مرے دہر بے مہر پایان گسل　　بکین مہر او کرد بیرون ز دل

ز تاثیر بے مہری این جہان　　روان شد سوے عالم جاودان

روانش ہمیشہ ز حق شاد شاد　　ازو عالم قدس آباد باد

آرام بانو اور شکر النسا بیگم کی قبروں پر جانب بالین بخط خفی اللھم اغفرلی ذنوبی اور جانب پائین نام کندہ ہیں ۔

ہذا القبر آرام بانو　　ہذا القبر شکر النسا بیگم

سلیمان شکوہ کی قبر پر یہ کتبہ نصب ہے ۔

اللہ ۔ محمد ۔ علی ۔ فاطمہ ۔ حسن و حسین

چو فرمود رحلت سلیمان شکوہ　　ز دار فنا سوے ملک بقا

بسال دو صد الف و پنجاہ و سہ　　بذیقعدہ بیست و نہم زین سرا

درآمد ز ہاتف صدا این رسید　　بگو کرد بر شاہ رحمت خدا

لوح منورہ مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ بہادر ابن محمد شاہ عالم بادشاہ غازی ۔

رقیہ بیگم کی تربت پر یہ عبارت کندہ ہے ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ لا الہ الا اللہ الملک الحق المبین ۔ لا الہ الا اللہ الخالق العلیم لا الہ الا اللہ رب الخلائق اجمعین ۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ و اشہد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ ۔ اشہد ان وعدہٗ حق و الموت حق و البعث حق ،، و النار حق و التوریۃ حق ۔ و الانجیل حق ۔ و الزبور حق ۔ و الفرقان حق ۔ و المیزان حق ۔ و الصراط حق ۔ و ان الساعۃ اتیۃ لا ریب فیہا و ان اللہ یبعث من فی القبور برحمتک یا ارحم الراحمین

ببلیوگرافی ۔ آثار الصنادید ۔ ڈاکٹر سر سید احمد خان ۔ طبع کانپور
آئین اکبری ۔ ترجمہ انگریزی ۔ بلاک مین ۔ طبع کلکتہ ۔ اقبال نامہ جہانگیری ۔ محمد شریف معتمد خان طبع کلکتہ ۔ تاریخ آگرہ ۔ محمد لطیف طبع کلکتہ ۔

پابند اور بے حس ہوتا ہے اسی کو اپنی آزادی سمجھتا ہے۔ اسکو اپنے دل و دماغ کی بھی محسوس نہین ہوتی اور خود کو صحیح الدماغ اور صائب الرائے جانتا ہے

جسطرح ایک دیوانہ اور مجنون خود کو صحیح الدماغ اور صحیح الخیال جانتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مین زندگی کے صحیح مسلک سے بیگانہ اور دور افتادہ نہین ہون اور اپنے ہر فعل کی عمدگی اور صحت پر دلیل لانے کا مدعی ہوتا ہے اسی طرح وہ شخص بھی خیال کرتا ہے جسکا دماغ و دل احساس غلامی کا شکار ہوتا ہے۔

بظاہر دنیا کے اکثر حصون سے جسمانی غلامی دور ہو چکی ہے اور لوگون کی توجہ اس طرف سے ہٹ چکی ہے لیکن اگر مزید غور سے کام لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ ابھی تک دنیا کے بعض حصون مین دماغی غلامی پر زور دیا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ قومون یا افراد اقوام کے دماغ زنجیر غلامی مین جکڑے رہین اور حسیات دماغی مین فتور پڑا رہے۔ دماغی غلامی باعتبار اپنے حالات اور خیالات کے دو قسم کی ہے۔

(الف) لازمی۔

(ب) متعدی۔

جب انسان دوسرون کے مقابلہ مین اپنی خود غرضی کے تحت مین اپنے اغراض اور اپنے مقاصد کو جان بوجھکر حقوق عائدہ کے خلاف مقدم رکھتا اور انھین خود غرضانہ طریقہ سے سلب کرنیکی کوشش مین رہتا ہے تو کہا جائیگا کہ وہ دماغی غلامی کی آفت اور مرض مین گرفتار ہے کیونکہ اس کا دماغ اس غلامی کی وجہ سے یہ تمیز نہین رکھتا کہ حقوق عباد کا تحفظ **اور تقدم** کیسا ضروری اور لازمی ہے اسکی دماغی غلامی خود داری سے محروم ہے نہ صرف دوسرون کے مقابلہ مین بلکہ خود اپنے مقابلہ مین بھی یہ نقص ہوتا ہے اس غلامی کی وجہ سے انسان پایۂ اخلاق سے گر کر حسیات اخوت اور اقتضائے انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ماؤف اور صدمہ رسیدہ دماغ مین آتا ہے وہی کر گزرتا ہے کچھ تمیز نہین کر سکتا خود غرضی اور خود پرستی اسقدر غالب ہوتی ہے کہ نیک و بد مین تمیز کرنا گویا فطرتاً مشکل ہو جاتا ہے یہ دماغی غلامی کا اثر ہے کہ بعض وقت قومین اجتماعی رنگ مین اور افراد اقوام انفرادی پہلو سے دوسرون کے حقوق کے سلب اور غصب مین

ذرا بھی تمیز نہین کرتے جسطرح ایک دیوانہ جوش دیوانگی مین اپنے اور پرائے مین تمیز کرنے سے عاری ہوتا ہے ویسے ہی یہ لوگ بھی ہوتے ہین ہر رنگ مین انکا مطمح نظر خود غرضی ہوتی ہے -

متعدی صورت مین انسان کوشش کرتا ہے کہ دماغی غلامی کی وجہ اور تحریک سے دوسرون کے دماغ اور قلوب پر اثر ڈالے اور انھین اس راستے پر چلانے کی کوشش کرے جس سے قومین اور افراد اقوام دماغی غلامی مین مبتلا ہو کر رفتہ رفتہ اپنے ذاتی - قومی اور ملی حقوق سے بیگانہ اور ناآشنا ہوتے جائین ایسے لوگون کے دماغ اور قلوب نفسیات فطری اور حسیات طبعی سے اسقدر بیگانہ ہو جاتے ہین کہ بدین حالات انکے خیال مین یہی غلامانہ زندگی ہی ایک آزادانہ زندگی ہے غلامی مین ہو کر بھی وہ خود کو آزاد سمجھتے اور حریت کا وارث جانتے ہین گو کبھی کبھی انکے بوسیدہ دماغون اور ماؤف قلوب مین اپنی اس حالت کا احساس تو کسی قدر ضرور ہوتا ہے مگر انکی روش غلامانہ باوجود اسکے بھی انھین مطمئن کرتی رہتی ہے کہ چندروزہ زندگی بسر کرنی ہے جس طرح گذرے گذرے زیادہ جدوجہد کی ضرورت نہین اگر کبھی انھین اس نقص غلامی کا احساس بھی ہوتا ہے تو وہ صبر و قناعت کو مقدم رکھکر اسی حالت پر خوش رہنے کی کوشش کرتے ہین -

دنیا کے تعلقات سے بیزار اور بیگانہ رہنا گویا انکے نزدیک ایک اخلاقی عظمت اور روحانی ضرورت ہوتی ہے انکی زندگی اور انکے خیالات مین ایک قسم کی سرد مہری اور جمود ساری ہو جاتا ہے اور ذہن مین غفلت سی پیدا ہو جاتی ہے یہ کیفیت قومون اور افراد اقوام مین مختلف طریقون سے پیدا ہوتی یا پیدا کی جاتی ہے -

"سوشل رنگ مین
"مذہبی رنگ مین
"اخلاقی رنگ مین
"تعلیمی - تدریسی اور تادیبی رنگ مین
"سیاسی اور قانونی رنگ مین

پھر وہ صورتیں ہیں جو بہ مختلف حالات پیدا ہو کر قومون اور افراد اقوام پر محیط ہوتی ہین کبھی سوشل رنگ مین اثر پذیر ہوتی ہین اور کبھی برنگ دیگر مثلاً بعض اوقات مذہب مین اس قسم کے خیالات اور احکام مل جاتے ہین جو ہوتے مذہب سے الگ ہین مگر رفتہ رفتہ رسمی رنگ مین مذہبی رنگ اختیار کر لیتے ہین -

مذاہب کی تفریق اور فرقہ بندیان اسی قبیل سے نشو و نما پاتی ہین ایک فرقہ جب دوسرے فرقہ کے مقابلہ مین اجتہادی پہلو لیتا ہے تو اس حالت مین اجتہادی تغیرات مذہب مین حائل ہو جاتے ہین اور ایسا فرقہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اسکے مقابلہ مین دوسرا فرقہ شکستنی و گردن زدنی ہے یہ وہ دماغی غلامی مذہبی رنگ مین ہے کہ جسکی وجہ سے مذہب پرست قومین رفتہ رفتہ اپنی عظمت اور ہمت کھو بیٹھتی ہین اور دوسرے مذاہب اور دوسرے اقوام پر انکا پول کھل جاتا ہے چونکہ یہ دماغی غلامی اعصاب مین ساری ہو جاتی ہے - اسواسطے باوجود لگاتار تنزل اور بے حسی کے بھی اسکا احساس نہین ہوتا - اور ایسے لوگ خود کو مذہب کا پرستار رکھکر خوش ہوتے ہین -

نصاب تعلیم

جب کبھی اس قسم کے خیالات رفتہ رفتہ نشو و نما پاتے رہتے ہین تو نصاب تعلیم و تدریس بھی اس قسم کا منتخب ہو جاتا ہے کہ اس سے رفتہ رفتہ قومون اور افراد اقوام کے دماغ اور ضمیر مین اس قسم کے بودے اور سطحی خیال بھر دیے جاتے ہین کہ قومی اور ملکی ضروریات کے مقابلہ مین تنازع للبقا کے رنگ مین بجاے افادت کے مضرت رسان ہوتے ہین طالبعلم برسون اور مدتون کی دماغ ریزی اور محنت کے سلسلہ مین جب سکولون اور کالجون سے اٹھتے ہین تو انکے پلے مین سواے چند رٹے ہوئے الفاظ کے اور کچھ بھی نہین ہوتا - خودداری معدوم ہو جاتی ہے اور ایثار براے نام بھی نہین ہوتا عصبیت رخصت ہو چکی ہوتی ہے - لوگ ڈگریان لے کر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہین کتابی اجرام کے ہجوم سے دماغی حسیات بوسیدہ ہو جاتی ہین اور جو بات ہر قومی اور ملکی پہلو سے ملک و قوم کے نوجوانون اور طالبعلمون کے دماغون اور قلوب مین متموج ہونی چاہیئے محض نمائش ہوتی ہے ترقی یافتہ ملک کے نوجوانون اور طالبعلمون کی امنگ بیداری ہمت بہ مقابلہ

تنزل یافتہ اور کشتگان دماغی غلامی کے کسی اور ہی رنگ مین متموج اور نمایان ہوتی ہے انگلستان فرانس اور جرمن مین جاکر دیکھو کہ ان قومون اور ان ممالک کے لوگون مین کس قسم کی ہمت خودداری اور اُمنگ ہے اور انکے مقابلہ مین ہماری حالت کیا اور کیسی ہے اسکی بڑی بھاری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان ممالک اور ان اقوام کی تعلیم و تدریس اُصولاً قومی اور ملی رنگ مین ہوتی ہے اور ہمارے ملک کی تعلیم اور نصاب تعلیم محض تعلیمی رنگ رکھتا ہے ایک طالبعلم تعلیمی مدارج قومی پہلو سے طے کرتا ہے اور دوسرا محض تعلیم یا امتیازات تعلیم کی خاطر ان دونون مین بڑا بھاری فرق ہے ایک شخص کوئی کام محض تفریح کی خاطر کرتا ہے اور دوسرا شخص علم اور معلومات کی خاطر۔ دونون مین فرق ہے۔"

قوانین اور سیاسیات

سیاست اور قوانین سیاست ہر ملک اور ہر قوم کے واسطے لازمی اور ضروری ہین بغیر انکے گزارہ اور ضبط ضروری ممکن نہین لیکن اگر قوانین کا ضبط و ربط کی خاطر ملک و اقوام پر اچھا اثر پڑتا ہے تو بُرا اثر بھی پڑتا ہے جب کوئی ضابطہ اور قانون سیاسی اور سوشل رنگ مین جاری ہوجاتا ہے تو محکوم افراد پر اسکا دو ہی طریق سے اثر ہوتا ہے۔

منصفانہ رنگ مین۔

غیر منصفانہ رنگ مین

پہلی صورت مین قانون پرست اپنی حدود ہی مین رہتے اور کاربند ہوتے ہین اور قانون قانون کی حدود مین ہی عمل پذیر ہوتا ہے دوسری صورت مین بعض اوقات قانون پرست اپنی حدود سے نکل جاتے ہین اور بعض اوقات قانون بھی اپنی حدود سے نکل کر دماغی غلامی کی زنجیر مین پھنسا رہتا ہے اور اس دار و گیر اور گرفت سے لوگون کے دماغ اور دل مین ایک قسم کا مواد غلامی بھر جاتا ہے اور رفتہ رفتہ قانون پرست لوگ دماغی غلامی کے بندھنون مین جکڑے جاکر اپنی حریت اور خودداری کھو بیٹھتے ہین جو حقوق اور جو دعاوی واجب بھی ہوتے ہین انکے طلب کرنے پر بھی جھجکتے ہین اور دوسری طرف سے بھی غلامانہ تقیدات کی وجہ سے ایفائے حقوق پر زور نہین دیا جاتا ایک شخص دیکھتا ہے کہ قانون سے انحراف

ہورہا ہے لیکن دماغی غلامی کی وجہ سے کوئی چارہ جوئی نہین کرسکتا۔ انصاف کی عدالتون
مین بھی جاکر منہ نہین کھول سکتا اور اگر کوئی چارہ جوئی کرتا بھی ہے تو اس رنگ مین کہ
جسمین دماغی غلامی کے اثرات زیادہ تر ہوتے ہین اور ایسے جرائم خودداری کو کھاجاتے ہین
قانون کبھی تو خودداری پیدا کرتا ہے اور کبھی خودداری کے منافی بھی ثابت ہوتا ہے
اور بعض حالات مین قانون کا یون منافی ہونا قومون اور افراد اقوام کے واسطے ایک
سخت صدمہ ہوتا ہے رفتہ رفتہ جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ قومون اور افراد اقوام کی دماغی اور
فطری حس ہی ماری جاتی ہے نہ صرف اسکا موجب قانون اور قانون کی گرفت ہی ہوتی ہے
بلکہ اسمین قانون پرستی کی عادت بھی بہت کچھ دخیل ہوتی ہے۔

قانون کا انحراف بہت برا ہے لیکن اسکے مقابلہ مین قانون کی طول طویل ور دور از
قیاس تعبیرات اور عملیات اس سے بھی زیادہ تر صدمہ رسان ہین ہر وقت انسان اس
خبط اور وحشت مین رہتا ہے کہ یہ بات قانون کے خلاف نہو کبھی کسی ملک اور کسی صوبہ کے
باشندے رشوت دینے کے زیادہ تر عادی ہوجاتے ہین تو اصلی محرک بھی یہی خبط اور
دماغی غلامی ہوتی ہے۔

رشوت اور دماغی غلامی ایک طرف راشی اور مرتشی دونون جانتے ہین کہ رشوت دینا اور لینا
انصاف اور قانون کے خلاف ہے لیکن دوسری طرف یہ سلسلہ باوجود چند در چند بندشون کے
بھی بند نہین ہوتا اسکی وجہ یہ ہے کہ دماغی غلامی کے عارضہ سے اہل مقدمات کا یہ اعتقاد
ہوجاتا ہے کہ عدالتون مین ہمارے خاطر خواہ انصاف نہین ہو سکتا اگر یہی دماغی غلامی نہو
تو کوئی بھی نہ رشوت دے اور نہ رشوت لے جب تک یہ دماغی غلامی دور نہو گی اسوقت تک
یہ سلسلہ بھی دور نہین ہوسکتا۔

بعض اوقات لوگ کہتے ہین کہ مقدمات کی دن بدن کثرت ہورہی ہے اسکے بہت
سے وجوہ ہوسکتے ہین لیکن ایک بڑی وجہ دماغی غلامی بھی ہوسکتی ہے جو قانون اور قانون پرستی
کے محرکات سے پیدا ہوتی رہتی ہے، قومون کے دماغ مین یہ بات عموماً بیٹھ جاتی ہے کہ سوائے
عدالتون کے ہماری دادرسی ہو ہی نہین سکتی۔ یہ کسی حد تک تو درست ہے لیکن عموماً ایسا

خیال کرنا ایک خبط ہے عدالتون مین جاکر قانونی پیچیدگیون کے نرغہ مین آکر بسا اوقات انصاف کی صورت ہی بدل جاتی ہے۔ قانون اپنے اغراض کے تحت مین جو ضروریات چاہتا ہے اُنکے مہیا کرنے پر بہت دفعہ فریقین اور مقدمہ لڑانے والون کو خود ہی قانونی حدود سے باہر نکلنا پڑتا ہے اور دماغی غلامی اُن اسباب کے تہیہ پر زور دیتی ہے جو دائرہ صداقت سے بہت دور ہوتے ہین۔

یہ نقص صرف اسواسطے پیدا ہو جاتے ہین کہ غیر منصفانہ قانون اور قانون پرستی ہی قانون پرستون کو ان مراحل سے گزرنے کی محرک ہوتی ہے۔ جب تک قانون آزادانہ پہلو نہ رکھتا ہو اور جب تک قانون پرستی محض قانونی رنگ مین نہ ہو تب تک یہ نقص باقی رہیگا قانون قانون کے اعتبار سے واجب التعظیم ہے لیکن قانون جب اس رنگ مین مانا جائے کہ قانون بنانے والے ہر صورت مین اسکا اقتدار کرانا چاہتے ہین اور لوگ قانون کے مقابلہ مین واجبی تغیرات کی اجازت نہین پاتے تو وہ اُس رہنما کی طرح ہی جو شاہراہ صداقت سے الگ لے چلتا ہو۔ قانون جبتک اپنا حقیقی فرض ادا کرتا ہے اُسوقت تک وہ تمدن اجماعی اور آزادی کا محافظ ہوتا ہے لیکن جب وہ خارجی اور خود غرضانہ قیود سے گھر جاتا ہے تو اسکی یہ تعریف باقی نہین رہتی اور وہ لوگون کے قلب و دماغ کو غلامی کی مصیبت بن مبتلا کر دیتا ہے۔

دماغی غلامی بھی ایک عارضہ ہے جو باوجود ایک عارضہ ہونے کے بھی بعض وقت حسیات کے کم ہونے کی وجہ سے کم محسوس ہوتا ہے، فتدبر

سلطان احمد

(ا) ہستی کے ہنگامہ اور زندگی کے طوفان مین۔ اے حسن۔ پتھرون پہ کندہ کیے ہوئے حسن تو ساکت غیر متحرک۔ تنہا اور علیحدہ قائم ہے۔

وقت اپنے تزک و احتشام کے ساتھ تیرے قدمون سے لگا ہوا ہے اور آہستہ آہستہ کہ رہا ہے "اے میری عروس مجھسے مخاطب ہو" اے غیر متحرک حسن تیری گویائی سنگ مین منجمد ہو گئی ہے۔

نلور

مترجمہ حضرت مجنون

ہندوستان مین پریس کی حالت

موجودہ زمانے مین کسی ملک کی ترقی کا معیار اس ملک کے اخبارات پر ہین۔ اخبارات اور رسالون کی تعداد اور ہر ایک اخبار کی اشاعت کتنی ہے اور کس قسم کی تعلیم یہ اخبارات اپنے ناظرین کو دیتے ہین کس قسم کے مضامین اُنمین شایع ہوتے ہین! یہ چند ایسے سوال ہین جنکے جواب سے اس ملک کی ترقی کا اندازہ ٹھیک ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ جو ممالک اس وقت ترقی کی اونچی چوٹی پر پہونچ چکے ہین وہ اخبارات کی اہمیت سے بخوبی واقف ہین۔ وہان اخبار بینی ضروریات زندگی مین شامل ہے۔ لندن مین ایک تانگے والا بغیر اخبار کے دکھائی نہین دے گا۔ امریکہ کا نانبائی یا بوٹ پر پالش کرنیوالا بغیر اخبار کے گذر نہین کرسکتا۔ جاپان کی وہ لونڈی جو ایک امیر گھرانے مین برتن صاف کرنے کا کام کرتی ہے۔ یہ گوارا نہین کرسکتی کہ اسکا ذاتی اخبار کوئی نہ ہو۔ وہان پر اخبار نہ صرف روزانہ شایع ہوتے ہین۔ بلکہ بہت سے اخبارون مین دو یا تین مرتبہ نکلتے ہین۔

اب ذرا ہندوستان کے اخبارون کا مقابلہ کسی اور تہذیب یافتہ ملک کے اخبارات سے کیجیے۔ سنہ ۱۹۱۵ء مین ہندوستان کے روزانہ ہفتہ وار ہفتہ مین دو دفعہ نکلنے والے اخبارون اور ماہواری رسالون کی تعداد ۱۶۲۳ تھی امریکہ مین صرف روزانہ اخبارون کی تعداد ۲۴۷۶ ہے وہان ۱۵۷۸۳ ہفتہ وار اور ۵۵۴ ہفتہ مین دو دفع نکلنے والے اور ۲۲۷۳۰ ماہواری رسالے نکلتے ہین۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ۱۶۲۳ اور ۴۱۶۱۶ مین کیا نسبت ہے۔ اگر امریکہ اور ہندوستان کی آبادی کا مقابلہ کیا جائے تو ہند مین ڈیڑھ ہزار کے بجائے ڈیڑھ لاکھ اخبارات کی ضرورت ثابت ہوگی۔

قدرتی طور پر یہ دو سوال پیدا ہوتے ہین کہ ہندوستان مین پریس کی ایسی افسوسناک حالت

کیون ہے اور کون سے ایسے ذرائع ہین جن سے پریس کو تقویت دی جا سکتی ہے - پہلے سوال کے جواب مین ہندوستان کی مالی حالت - لوگون مین تعلیم کی کمی اور پریس ایکٹ پیش کیے جا سکتے ہین - دوسرا سوال زیادہ دقیق اور مشکل ہے مین صرف پہلے سوال پر اس مضمون مین بحث کرونگا اور دوسرے سوال کو کسی زیادہ لائق آدمی کے سپرد کرتا ہون -

اپنے مضمون پر تحویلاً بحث کرنے سے پہلے پریس کی افسوسناک حالت کو واضح طور پر اپنے ناظرین کو ذہن نشین کرانے کے مقصد سے ۱۹۰۸ء کے رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ سے مسٹر مالاباری کے قلم سے نکلے ہوئے ایک مضمون کا اقتباس ذیل مین درج کرتا ہون وہ اپنے ہفتہ وار انگریزی اخبار انڈین اسپکٹیٹر (Indian Spectator) کی خراب حالت کی نسبت خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھتے ہین -

"سوائے اس مختصر زمانے کے جبکہ یہ اخبار میرے دوست مسٹر این - ایم - دوبیدجی کے زیر انتظام تھا ہمیشہ اسمین مجھے خسارہ ہی رہا ہے تضیع اوقات اور نقصان محنت کے علاوہ اس معاملے مین جسقدر مالی گھاٹا مجھے اٹھانا پڑا ہے - اسکی یاد جب کبھی دل مین تازہ ہوتی ہے تو میری پریشانی بہت بڑھ جاتی ہے - اخبار اسپکٹیٹر کی حالت اس بچے کی سی تھی جو ہمیشہ بیمار اور کمزور رہتا ہے اور اسی وجہ سے والدین اسکے ساتھ زیادہ پیار اور محبت کرنے لگتے ہین اس بچے کے والدین ہر چند کہ مالی لحاظ سے زیادہ خوشحال نہ تھے - مگر پھر بھی وہ جو شے مانگتا تھا اُسے مہیا کی جاتی تھی - اسکے بہت سے اجرتی اور آنریری مضمون نگار اور ریویو لکھنے والے تھے جنمین انگریزی اور ہندوستانی دونون قومون کے لوگ شریک تھے - ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر الگ الگ تھے - عام طور پر ہم اپنے مضمون نگارون کو تین روپیہ فی کالم کے حساب سے اُجرت دیا کرتے تھے - لیکن بعض اوقات پانچ سے دس روپیہ فی کالم تک بھی دیتے تھے - بعض موقعون پر مجھے یاد ہے کہ مین نے ایک ایک آرٹیکل کے لیے ساٹھ سے سو روپیہ تک اُجرت دی ہے میرے خیال مین ہندوستانی اخبار نویسی مین یہ اُجرت زیادہ سے زیادہ ہے - جو کسی مضمون نگار کو دی گئی ہو - برعکس اسکے ہمارے کئی انگریز نامہ نگار تھے جنھین صرف ۸ر فی کالم کے حساب اُجرت دی جاتی تھی - ان مضامین کو ہم اصلی مضامین کی کمی پورا کرنیکے کام مین لاتے تھے

یا وہ ہے۔غریب کرنیل ...... نے فوجی اصلاح کے مضمون پر ہمین متعدد بار آرٹیکل روانہ کیے تھے۔جب منیجر نے اسے قریباً ۱۲ کالم مضمون کے لیے چھ روپیہ بطور نذرانہ بھیجے تو مین نے اُسے ایک خط مین لکھا۔کہ اسنسے آپ کا سگریٹون کا ڈبہ خریدنے کا خرچ چل جائیگا۔اسکا جواب جو مجھے ملا اُسنے میری آنکھین کھول دین۔خط مین لکھا تھا "ہان اُسنے میری بچسالہ بے مان کے بچے کا چند روز کے لیے دودھ روٹی کا خرچ چل جائیگا" اس سے میرے دل کو اسقدر صدمہ پہونچا کہ مین نے فوراً اپنی دو چاندی کی گھڑیان جو شادی سے پہلے کی میرے پاس موجود تھین بیچ کر انکا روپیہ اپنے غریب پرانے مضمون نگار کو بھیجدیا۔مین نے پرائیویٹ طور پر ایک خط سر ڈونالڈ اسٹوارٹ صاحب کمانڈر انچیف کو لکھا۔کہ وہ کرنیل موصوف کی کچھ مالی امداد کا بندوبست کرین۔میری اس درخواست کا ایک نتیجہ یہ ہوا۔کہ کرنیل کی لڑکی تعلیم کے لیے آبو لارنس اسکول بھیجدی گئی"

جو حالت مسٹر مالاباری نے انڈین اسپکٹیٹر (Indian Spectator) کی بیان کی ہے۔بعینہ وہی حالت ہندوستان کے دوسرے بہت سے انگریزی اور ورنیکلر اخبارات کی ہے۔جو اخبار اسپکٹیٹر کی طرح مالاباری جیسے ہمدرد ہاتھون مین ہوتے ہین وہ کچھ نہ کچھ ضرور پبلک کی خدمت انجام دیتے ہین۔لاہور کے ورنیکلر اخبارون کے سردار روزانہ اخبار "بندے ماترم" کو اتنا خسارہ رہا لیکن چونکہ اسکی بنیاد مضبوط تھی اسلیے اسکو مالی خسارہ کی آندھی زمین کے ساتھ نہ ملا سکی۔لیکن جو اخبار ایسی مضبوط بنیاد پر قائم نہین ہین جنکی پیدائش کی ذمہ داری ایک ہی شخص کے سر پر ہے۔جنکا ایڈیٹر۔پرنٹر۔پبلشر اور پروپرائٹر ایک ہی شخص ہوتا ہے۔اکثر دیکھا گیا ہے۔کہ ایسے اخبار یا رسالے تھوڑے دنون کے بعد پبلک کے نام امدادی اپیل شایع کرنے لگتے ہین۔ہندوستان کی نیم تعلیم یافتہ پبلک پہلے ہی سے اخبار نویسی کی طرف کم متوجہ ہے اسلیے اگر کوئی اخبار بند ہو جاتا ہے۔تو اسکا افسوس سوائے اُسکے پروپرائٹر کے اور کسی کو نہین ہوتا۔ایسے اخبار ملک کے ہر حصے سے حشرات الارض کی طرح نکلتے اور برساتی مچھرون کی طرح غائب ہوتے رہتے ہین۔غرض ورنیکلر پریس کی حالت قابل رحم ہے۔

جب خود اخبارات کی زندگی اتنی ناپائدار ہے تو آسانی سے اندازہ ہوسکتاہے کہ ایسے

رسالون یا اخبارون کو مضمون نگار کس پایہ کے مل سکتے ہین - بہت سے ورنیکلر ماہواری رسالے تو بطور جنتری یا (CATALOGUES) فہرست کتب شائع ہوتے ہین - فرق صرف اتنا ہے کہ کارخانون کی فہرست اشیا عام طور پر سالانہ شایع ہوتی ہین اور انکا سارا خرچ کارخانے والون کے ذمہ ہوتا ہے - اور یہ رسالے بجاے سالانہ کے ماہواری نکلتے ہین اور انکے خرچ کا کچھ حصہ اُن عقل کے اندھے گاہکون کی جیبون سے نکلتا ہے جو انکے خریدار ہوتے ہین اس قسم کے رسالے خسارہ برداشت کر کے بھی نکلتے رہتے ہین - بعض رسالون مین ایسے مضامین درج ہوتے ہین جنکے مطالعے سے مضمون نگار کی علمیت غیر معمولی طور پر ٹپکتی ہے - میرا ارادہ تھا کہ بعض بعض رسالون مین سے کچھ مضمون قطع برید کر کے ناظرین کی خدمت مین پیش کرون لیکن مضمون کی بیجا طوالت کے ڈر سے درگذر کرتا ہون اور اسکا فیصلہ ناظرین کے تجربے پر چھوڑتا ہون ایسے مضامین یا تو بڑی لفاظی اور مخرب اخلاق جذبات کے اظہار پر مبنی ہوتے ہین یا انمین اس قسم کی تنقیدین اور موازنے درج ہوتے ہین جنکا ہر لفظ ذاتی رنجش اور دلی عناد کا نتیجہ ہوتا ہے جنمین واقفیت اور نیک نیتی کو ذرا بھی دخل نہین ہوتا جنمین بجاے دو بالمقابل چیزون کے عیب و صواب بلا کم و کاست دکھائے جائینگے - اُن ا کے مصنفین کی قا بلیت پر ایک طول و طویل بحث ہوتی ہے یا جو شروع سے لیکر اخیر تک بیجا اعتراضون اور مذہبی تعصبون کا آئینہ ہوتے ہین - ایسے مضامین ناظرین کو فائدہ پہونچانیکے بجاے انکو غلط واقفیت بہم پہونچاتے ہین اور بجاے اُنکے دائرہ علمیت کو وسیع کرنیکے انکو اور بھی زیادہ تنگ بناتے ہین - یہی رسالے ہین جنکی وجہ سے ورنیکلر پریس اتنا بدنام ہے اور تعلیم یافتہ پارٹی ورنیکلر پریس سے متنفر ہے -

اگر ایڈیٹر کی کوشش و قابلیت سے لائق نامہ نگار مل بھی جائین - تو وہ کب تک اپنی ضروریات کو نظر انداز کر کے محض ہمدردی کی خاطر اخبارون یا رسالون کی امداد کر سکتے ہین بہت سے ایڈیٹر اس بات کے خواہشمند ہوتے ہین - کہ مضمون نگار عمر بھر خون جگر پی کر اسکے رسالے کے لیے مضمون لکھتا رہے اور اس سے ایک کوڑی بھی اُجرت نہ مانگے - بیچارہ ایڈیٹر بھی کیا کرے جبتک اچھی خاصی اشاعت اسکے رسالے یا اخبار کی نہو اُسوقت تک تو اسکی لکھائی چھپائی اور کاغذ کا خرچ بھی نہین نکلتا - یہان تو ہر اچھے اخبار کی حالت انڈین اپکسپریس جیسی ہے اور ہر ایک ایڈیٹر

کا یہ مقدور نہین کہ مسٹر مالا باری کی طرح اپنی دو گھڑیان بیچ کر اپنے مضمون نگاری کا شوق پورا کر سکے۔

اخبارات اور رسالون کی کم اشاعتی کا سب سے بڑا سبب لوگون کا ناخواندہ ہونا ہی پرائمری اور ورنیکلر مڈل پاس شدہ لڑکون کو اخباری دنیا مین ناخواندہ ہی تصور کرنا چاہیے انکی تعلیم نہ تو انکو اخبارات کے سمجھنے کے قابل بناتی ہے اور نہ اخبار بینی کا شوق دلاتی ہے جو محض ہائی سکولون تک پڑھکر دفترون مین کلرک اور ریلوے مین ملازم ہو گئے ہین۔ انکی تنخواہین اتنی قلیل ہین۔ کہ وہ بمشکل اپنا اور اپنے بچون کی پرورش کا گزارہ کر سکتے ہین اگر یہ اخبار سمجھ بھی نہ سکین تو انکو اتنا شوق نہین ہوتا کہ اپنا پیٹ کاٹکر اخبار پر خرچ کرنا اپنا فرض سمجھین انکا خیال ہے کہ اخبار بینی انسان کے لیے غیر ضروری LUXURY ہے۔

اب رہے کالج کے گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ۔ ہندوستان کی ساڑھے کتیس کروڑ آبادی کے لیے صرف ۱۳۶ لڑکون کے کالج ہین۔ جبکہ امریکہ مین جہان کی آبادی صرف ساڑھے آٹھ کروڑ کے قریب ہے ۴۹۳ کالج ہین۔ ۱۹۱۵ء مین لڑکیون کے لیے سارے ہندوستان مین صرف ۱۱ کالج تھے لیکن امریکہ مین ۱۱۲ تھے ہندوستان مین ۴۰۶ عورتین کالج مین پڑھتی ہین جبکہ امریکہ مین ۱۶۶۷ عورتین کالجون مین تعلیم حاصل کرتی ہین۔ امریکہ مین ۴۸۴۳۸۰ عورتین سکولون مین پڑھانے کا کام کرتی ہین جبکہ ہندوستان مین ۹۹۶۳۴۱ عورتین لکھ پڑھ سکتی ہین انہین وہ بھی شامل ہین جو محض اپنے دستخط کرنا جانتی ہین۔ ایک دفعہ پنڈت مدن موہن مالویہ نے اپنے ایک لکچر مین کہا تھا کہ "ہند مین پانچ وشو ودیالاؤن مین ۲۸۰۰۰ لڑکے ہین۔ اور امریکہ مین ۲۴۰۰۰ پروفیسر ہین۔

اگر سکولون کے طلباء کو بھی خواندہ کی فہرست مین شامل کیا جائے تو بھی سوائے مایوسی کے اور کچھ ہاتھ نہین آئیگا۔ ۱۹۱۴ء مین ہندوستان مین ۹ر۲۳ فیصدی لڑکے سکولون مین پڑھتے تھے اور صرف ۳ر۶ فیصدی لڑکیان۔ امریکہ مین سٹیٹ کی طرف سے نہ صرف سکولون بلکہ کالجون مین تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ جاپان اور انگلینڈ مین بھی اسی طرح تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ لیکن ہندوستان مین گوکھلے کا پرائمری ایجوکیشنل بل خرچ کی کمی کی وجہ سے پاس نہ کیا گیا۔ جب تک تعلیم کی یہ حالت ہے اسوقت تک ہندوستان مین پریس زیادہ

ترقی نہین پکڑ سکتا۔

پریس ایکٹ نے بھی بعض بعض اچھے اخبارات اور رسالون کا گلا گھونٹ دیا تھا یہ زیادہ تشریح کا محتاج نہین - اب دیکھیے کہ پریس ایکٹ کے منسوخ ہونے کا اثر انڈین پریس پر کیسا پڑتا ہے -

کنور سین - سی آئی

جذبات اثر

حشر اور اُسکے بعد کا سامان کیے ہوئے — بیٹھا ہون دل کے داغ فروزان کیے ہوئے

نظارہ ہے اُمید تبسم مین گل بکف — دل کو فدائے جنبش مژگان کیے ہوئے

ناخن بدل فراق مین رہتا ہون روز و شب — سینے کو چاک مثل گریبان کیے ہوئے

پھر زخم تیغ کھانے پہ بیتاب عشق ہے — ہر لخت دل کو غرق نمکدان کیے ہوئے

خلوت مین دل کی آیا بصد غمزہ و ادا — اک مست ناز پردۂ دامان کیے ہوئے

صحرا نہین ہے کوئی ہمارے مذاق کا — بیٹھے ہین اپنے گھر کو بیابان کیے ہوئے

جاتا ہون نذر دینے اُسے دل کی آیتین — آنکھون کا نور زینت عنوان کیے ہوئے

گرداب ہین بلاؤن کے یا چشم خونچکان — پنہان ہر ایک قطرے مین طوفان کیے ہوئے

کہتا ہے کون حشر ہے صبح شب وصال — دل شام سے ہے حشر کا سامان کیے ہوئے

آلودگی جامۂ احرام دھوگئی — لوٹے طواف کوچۂ جانان کیے ہوئے

ساقی کا منتظر ہے ہر اک رند بادہ خوار — شب کو طلوع مہر کا سامان کیے ہوئے

بکنے چلا ہے عشق کے بازار مین وہ شوخ — عصمت کو اپنے حسن کا دربان کیے ہوئے

کرتا ہون سیر اپنے دل داغدار کی — آنکھون کو رشک بزم چراغان کیے ہوئے

پھر جوشش نگاہ سے اُبھرے ہین زخم عشق — دامان دل کو رشک گلستان کیے ہوئے

پہونچے گا تیرے در پر اثر ایک دن ضرور
آبادی خیال کو ویران کیے ہوئے

اثر لکھنوی

محلاتِ شاہی میں محبت

محلات شاہی کی دنیا میں، اگر نگاہ نکتہ رس تلاش کرے تو امیر چارلس ایڈورڈ اور اسکی بیوی لویزا کے افسانۂ رنگین سے زیادہ دردانگیز و حسرت خیز واقعہ مشکل سے نظر آئیگا۔ لویزا، چارلس کی نازنین بیوی، گوسٹاف اوورٹن آف اسٹولبرج کی بیٹی تھی۔

پرنس چارلس اڈورڈ دنیائے تاریخ میں اپنے حیرت آفرین حسن، اور فتنۂ دوران جمال کی بدولت اسقدر مشہور رہا کہ اب وہ کسی معرفی کا محتاج نہیں ہے۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ اُسکی سحر فروش آنکھیں خواتین کے محبت پرور دلوں کے لئے وہ کام کرتی تھیں۔ جو جادو نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے عالمِ شباب میں اسکاٹ لینڈ کا موضوع دل پذیر و مبحث جاں نواز تھا۔ وہ خاندانِ اسٹیوارٹ کی بیشمار نازنین آرزوں کا مرجع بنا ہوا تھا۔ وہ اپنی نیرنگیٔ حسن ہی کی بدولت ہر دل عزیز و مشہور آفاق نہیں تھا بلکہ اُسکی غیر معمولی بہادری وشجاعت، اور شیریں کلامی نے اُسکے آفتابِ شہرت کو اور زیادہ درخشاں کردیا تھا۔ ہر صنف نازک کی تمنائے عام تھی کہ کاش چارلس کے خاکِ قدم ہی میں جگہ ملجائے اور ہم اُسکے روئے جہاں تاب کو دیکھا کریں۔

لیکن ان تمام کمالات ظاہری کے ساتھ اُسکے قضائے تقدیر میں کوئی ستارۂ تاباں نہ تھا۔ وہ اس خوش نصیبی و کامرانی سے متمتع نہ ہوسکا۔ جسکے خواب زمانۂ طفلی ہی سے انسانی دنیا کے بہت سے افراد دیکھتے رہتے ہیں، عالم کائنات میں اُسکی جولانیوں نے، پرخطر کاموں میں گھس جانے اور بدنامی دشمنی کے لئے بے جگری سے میدانِ رزم میں کود پڑنے کے سوا اُسمیں اور کچھ اضافہ نہ کیا۔ نیز بچپن ہی سے وہ شراب بہت زیادہ پیتا تھا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بادہ پرستی نے اُسے ایک مہلک مرض کا شکار بنا دیا۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اُسکے زندانِ فرانس میں گرفتار رہنے کا سبب بھی یہی بادہ کشی ہوئی ہے۔ لیکن ہمیں اس بیان میں شک ہے۔ فرانس میں اُسکی اسیری کے اسباب اور ہی کچھ تھے جنکو روشنی میں

لانے کا یہ موقعہ نہیں تاہم تمام مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ اس کثرتِ شراب نوشی نے اُسکے حسن و جمال کو بشرۂ نورانی سے بالکل فنا کر دیا تھا۔

فرانس کی حکومت نے سیاسی مقاصد کی بنا پر چاہا کہ کوئی سرکاری خدمت اُسکے سپرد کیجائے اسلئے ایک حسین و نازنین عروس، اور گراں قدر سالانہ وظیفہ پیش کیا گیا جسکی مقدار چالیس ہزار پونڈ سے کم نہ تھی۔ اس معاوضۂ گراں کی خوشی میں وہ اُچھل پڑا، اور اس عروس جمیل کے لالچ میں اسنے بادۂ و ساغ سبو و مینا کو خیرباد کہدیا۔ مگر افسوس کہ یہ تقریب حسین کامیاب نہ ثابت ہوئی۔ عروسِ نازنین اور شاہزادۂ حسین میں جو تفاوت عمری تھا۔ اُسنے پرنس کے فیض محبت و شباب رفتہ سے کمسن دولہن کو فائز المرام نہ ہونے دیا۔ کیونکہ پرنس کی عمر پچاس سال سے متجاوز تھی۔ اور دوشیزہ لویزا کی بیس سال سے بھی کم۔

شاہزادی لویزا اب تک ایک معبد نسوان میں رہتی تھی۔ وہ زبردستی اپنی مرضی کے خلاف اسلئے وہاں سے لائی گئی کہ پرنس چارلس کے ساتھ اُسکا رشتۂ مودّت جوڑ دیا جائے۔ وہ اسطرح لائی گئی جس طرح ایک بیکس بکری مذبح میں لیجائی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے اس روز اُسے دیکھا تھا۔ اُنکا بیان ہے کہ نازنین لویزا کا جمالِ شاہانہ آج اسطرح عنقا تھا، جس طرح کوئی ایسی چیز جسکا وجود دنیائے تخیل کے سوا کہیں نہ ہو۔ اُسکے طلائی بال پریشان تھے۔ اُسکی سحرفروش آنکھیں نرگس کے پھول کی طرح کملائی ہوئی اور گلابی رخسار مرجھا رہے تھے۔ اُسے دیکھکر ہر متنفس کی زبان پر تھا۔ ان ھذا الا ملک کریم۔ بے شک ایک آسمانی دیوی (فرشتہ) ہے۔ مختصر یہ کہ اُسمیں اور اُسکے دولہے والے شریک زندگی میں فرق بیّن تھا۔ اور سوء اتفاق کہ نازنین لویزا کا عقد جمعہ کے دن ہوا۔ جو مغربی دنیا میں بدشگونی کا دن ہے۔ چنانچہ بہتوں کو زوجین کی سعادت و کامرانی میں ابھی سے شک پیدا ہو گیا تھا۔

نکاح ہو گیا۔ اور پرنس ایڈورڈ عرصہ تک اپنی جاں نواز بیوی کی خاطر ترک مئے و ساغر کئے رہا۔ اور اپنی مالکۂ قلب کی نسبت ہم نشینی میں وہ لطف شراب کو گویا بھول گیا تھا۔ لیکن افسوس اس دو پرست شاہزادہ کی یہ پاکبازی وقتی ثابت ہوئی۔ ممکن ہے کہ اس باب میں وہ کوئی عذر بھی رکھتا ہو۔ مگر شاہزادی نے جو رائے اپنے شوہر کی نسبت قائم کی، وہ اُسے نہ چھپا سکی۔ لویزا نے

اُسکا نام ا "دو سخرا" اور "فضول گو" رکھا تھا۔ جسکے اعصاب کو کثرتِ شراب نے شل اور بیکار کردیا ہو۔ اور زمانہ نے اُسکی کمر کو جھکا دیا ہو۔ اُسنے پرنس کو یہ بھی باور کرادیا کہ محض سیاسی مصالح کی مجبوریوں کے سوا وہ کسی طرح بھی اُسے شوہر بنانا پسند نہیں کرتی خاندانِ شاہی کے بہت سے ایسے امرا دل سے اُسکے آرزومند ہیں۔ جو اُسکے (لویزا کے) نقشِ قدم کو سجدہ گاہ نیاز بنائیں اور اُسکے تبسمِ ناز کو کونین کی دولت سمجھیں۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ لویزا اس شان وشوکت اور مرتبہ کی شاہزادی تھی کہ بڑے بڑے امرا و رؤسا اُسکی لذّتِ ہمنشینی کے مشتاق، اُسکی شیریں کلامی کے لئے ہمہ تن گوش اور اُسکے ظریفانہ نکات کے متمنی رہتے تھے۔ اُسکی خوشنودی اور ایک نگاہِ لطف پرورکی امید حصول میں ہرطرح کی قربانی مایۂ نازش سمجھتے تھے۔ لویزا کے اِن شیفتگانِ حسن میں، امرا رؤسا۔ سیاسی ماہرین۔ انشا پرداز۔ ادیب۔ شعرا۔ مصورین اور اطراف کے مشاہیر شامل تھے۔

شاہزادی لویزا اس صورت سے اپنی زندگی گزار رہی تھی کہ سلاطینِ یورپ اُسکے شوہر کی مدگی حسب ونسب کے بھی معترف نہ تھے۔ مگر وہ کچھ اسکی پروا نہ کرتی تھی۔ کچھ شک نہیں کہ لویزا کمال سعادت وکامرانی کی زندگی گزار سکتی تھی۔ اگر اُسے اپنے بدنصیب شوہر کی اصلاح حالت سے، اور عالمِ بیخودی وشکر سے دنیائے ہوش میں لانے کی طرف سے قطعی یاس نہ ہوتی۔

اس عقدِ رسمی کو ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ پرنس اس راز سے واقف ہوگیا کہ اُسکی نازنین بیوی اُس سے ملول ومتنفر رہتی ہے۔ اور اپنے شوہر کی ہمنشینی کے بجائے وہ اپنے اُن دیرینہ دوستوں کی ہم نشینی سے زیادہ مسرور رہتی ہے جو پرنس بادہ نوش سے زیادہ اُسکے نزدیک رفیع المرتبہ ہیں۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا تو شک وغیرت اور رنج وغصہ نے پھر اُسے بادہ وساغر کی طرف متوجہ کردیا۔ اُسکا دل حسد وغیرت کی آگ سے دہک رہا تھا۔ اُسنے جام وصراحی کے سوا کوئی اپنا شریکِ غم نہ پایا۔ اب اس نے قابلِ پرستش بیوی کے ایذا رسانی کا سلسلہ شروع کیا۔ اُسکو طرح طرح سے تنگ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک روز کمرے میں بند کردیا۔ تاکہ وہ اپنے عزیز دوستوں کی زیارت وملاقات سے محروم رہے۔

حیرت میں بھی شروع سے آخر تک وہ اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ جام ومینا بھی ساتھ ہوتا [illegible] ایک مہینہ بھی ختم نہ ہونے پاتا کہ وہ اپنی کرسی پر بیہوش ہوکر چت گر پڑتا تھا۔ جس حالت [illegible]

نہ کر سکتا تھا۔ تب اُسکے آدمی اُٹھا کر اُسے محل میں لیجاتے تھے۔ وہ زندہ مگر بحالت مردہ صبح تک پڑا رہتا تھا۔

اِن دونوں کی شادی کو پورا ایک سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یہ سب واقعات پیش آ گئے۔ لہذا شاہزادی کو بھی حق حاصل تھا کہ وہ دوسرے ذرائع سے پورا فائدہ اُٹھائے۔ اور اپنی زندگی کو پر لطف و پرمزہ بنانے کے اسباب پیدا کرے۔ اس زمانہ میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ روّمیہ میں رہتی تھی۔ جہاں اور بھی بکثرت شریف و امیرزادیاں رہا کرتی تھیں۔ جو متہم تھیں۔ کہ دربردہ احباب رکھتی ہیں۔ مگر لویزا نے اس قسم کے سہولیات اور ناجائز اسباب سے کبھی اپنے کو نشانہ ملامت بنانا نہ چاہا۔ بلکہ درس و مطالعہ سے راحت فکر و اطمینان قلب کا سامان بہم پہونچانے لگی۔

مگر تھوڑے ہی دن بعد اُسے روّمیہ سے فلورنس میں منتقل ہو کر آنا پڑا۔ باہمی معاملات پہلے سے زیادہ ناخوشگوار ہو چکے تھے۔ لویزا کا بدمزاج فوجی شوہر بدکلامی ہی سے پیش نہ آتا تھا بلکہ لبا اوقات تہدید بھی کرتا رہتا تھا۔ اسکا یہ نتیجہ ہوا کہ لویزا کو چارلس کی طرف سے اپنی جان کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ وہ اُس سے بہت زیادہ خائف رہنے لگی۔ بالخصوص اسوجہ سے اور بھی کہ چارلس لویزا کو صحت و تندرستی کی حالت میں دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ غرض لویزا، بدنصیب لویزا جن آلام و صدمات کا ہدف بنی ہوئی تھی۔ اُس سے بھی زیادہ ایسے خطرات کا اندیشہ اُسے اور ہلاک کئے دیتا تھا۔ جو انسان کے خواب خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ آخر اس مہلک گڑھے سے اُسے ایک نئے ایکٹر نے نجات دی۔ جو بہت جلد لویزا کی زندگی کے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ وہ کون تھا؟ فیکٹر فیری!

فیکٹر فیری یورپ کے تمام نوجوانوں سے زیادہ حسین و جمیل تھا۔ وہ عالمِ حسن میں درجۂ امتیاز رکھتا تھا۔ وہ سن میں شاہزادی لویزا سے صرف چار سال بڑا تھا۔ اِس حسین امیرزادہ میں وہ تمام صفات بدرجۂ کمال موجود تھے۔ جو شرفا کے لئے مایۂ نازش و مباہات ہو سکتے ہیں۔ وہ سیّاح بھی تھا۔ وہ یورپ کے تمام پایہ تختوں کی سیر کر چکا تھا۔ اور ہر جگہ اپنے پیچھے بہترین یادگاریں چھوڑ آیا تھا۔ بالخصوص محلاتِ شاہی کی دوشیزہ خواتین کے دلوں میں۔ اسکے علاوہ وہ ایک زبردست شاعر اور زندگی کے اسرار کا ماہر تھا۔ اُسنے ہر ساغر زندگی کا مزہ چکھا تھا۔ یہاں تک کہ زہر کا بھی۔ اُسکے لئے ایک ایسی عورت کے دل کو شکار کر لینا ذرا بھی مشکل کام نہ تھا۔ جسے قدرت نے خود اُسکے قدموں میں

ڈال دیا ہو یہی تھا۔ وہ نوجوان جسکے بشرہ کی تابشِ جمال نے لویزا کے ظلمت کدۂ قلب کو منور کر دیا۔ غیری نے لویزا کے نظارۂ اولیں سے متاثر ہوکر جو مکتوبِ محبت لکھا ہے۔ اُسکا ایک فقرہ ملاحظہ ہو۔ لکھتا ہے۔

"آخرکار میں نے تمھیں کو وہ عورت پایا جس سے میں محبت کر سکتا ہوں۔ جس وقت سے تمھارا نظارۂ ہوش رُبا دیکھا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ ایک روحِ تازہ مجھ میں پھونک دی گئی ہے۔ اور میرا ویرانہ دل تازہ ترین آرزوؤں سے معمور کر دیا گیا ہے"

اس مقابلۂ نظر کے بعد دورِ سعادت و کامرانی شروع ہوتا ہے جس میں لویزا، محبت کی دیوی لویزا رات کی تاریکیوں کے آغوش اور گھنے درختوں کے سائے میں اپنے حبیب جان نواز کی ملاقات سے لذت اندوز ہوا کرتی تھی۔ اور یہ دونوں پردہ پوش رات کی خاموشیوں میں محبت کی دلپذیر سرگوشیوں اور حسن و عشق کے نغمات و اشعار کے مزے لیا کرتے تھے۔ اُدھر ایڈورڈ اپنی بدمستی و مدہوشی میں تھکے ہوئے بیل کی طرح پڑا رہتا تھا۔ اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔

نازپروردہ لویزا اور اُسکے حبیب دلنواز کو اسی طرح سعادت و کامرانی سے متمتع ہوتے پورے تین سال گذر گئے۔ اس سے زیادہ اور کیا خوش نصیبی کا دور ہو سکتا ہے۔ اسکے بعد ایک ایسا حادثہ پیش آیا۔ جو وہم گمان میں بھی ممکن نہ تھا یعنی ایک روز ایڈورڈ شدید بدمستی کے عالم میں اندر گھسا۔ غیرت اور رشک و حسد نے اُسکے دل کو بالکل جلا دیا تھا۔ اسنے اپنی بیوی پر شدید حملہ کر دیا۔ اور چاہتا تھا کہ گلا گھونٹ کر اُسکا کام تمام کر دے۔ نازنین لویزا کے لئے اس سے بڑھکر ذلت و توہین کیا ہو سکتی تھی۔ لویزا کے لئے اب اُس شرابی شوہر کے گھر میں ایک منٹ بھی رہنا غیر ممکن تھا۔ اُسنے اُسی شب کو یہ طے کر لیا کہ صبح ہوتے ہوتے وہ بھاگ جائیگی۔ چنانچہ صبح اپنی سہانی روشنی لیکر عالم کو منور کرنے کے لئے بڑھی ہی تھی کہ لویزا اپنا تھوڑا سا ذاتی سامان لیکر خفیہ گھر سے نکل کر ایک معبد میں چلی آئی جو اُسکے گھر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ نامراد چارلس نشۂ خواب و بدمستی سے ہوشیار ہوا تو اپنی زیادتی اور تشدد پر بہت نادم ہوا۔ جو حالت شکر و رشک میں گذشتہ شب کو اُس سے عمل میں آچکی تھی۔ اور معلوم ہوا کہ اُسکی بیوی بھاگ کر گرجا میں پناہ گزیں ہوئی ہے۔ وہ بھی پہونچا مگر انتہائی اظہار ندامت، اور منت و سماجت، خوشامد کچھ کام نہ آئی لویزا کسی طرح ملنے پر راضی نہ ہوئی۔ اور وہ گرجا کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہوا۔ زور زور سے اُسنے کھٹکھٹایا۔ تو رئیس معبد نکل آیا اور چارلس کو سمجھایا کہ وہ قانوناً اندر نہیں آ سکتا۔ اور اُسکی بیوی آیندہ کبھی اُس سے

نہیں مل سکتی۔ وہ نہایت پشیمانی و پریشانی کے ساتھ ناکام ونامراد واپس ہوا۔ اوراس زندہ نعمت کے ہاتھ سے نکل جانے پر کفِ افسوس ملنے کے سوا کیا فائدہ تھا۔ اب کوئی امید نہ تھی کہ وہ سونے کی چڑیا پھر ہاتھ آسکے گی۔ اِس دلچسپ ڈرامے کے پہلے باب کا یہ آخری سین تھا۔

اسکے بعد چار پانچ سال اور زندہ رہا۔ مگر اس صورت سے کہ جام وساغر کے سوا کوئی اُسکا رفیق زندگی اور شریکِ غم نہ تھا۔ آخر اسی رفیق نے رفتہ رفتہ اُسے گوشۂ قبر تک پہونچا دیا۔ خود اُسنے بھی راحت ابدی پائی۔ اور اپنی نازنین ومظلومہ بیوی کو بھی کلفتِ دیرینہ سے نجات دی۔

اب مستِ ناز لویزا بالکل آزاد تھی۔ وہ اور اُسکا حبیب دلنواز فیری دونوں یہاں سے چلدیئے۔ مختلف ممالک اور بڑے بڑے شہروں کی سیر وسیاحت اُنکا مشغلہ تھا۔ کانٹا نکل چکا تھا۔ دونوں کی زندگی قابلِ رشک وکامیاب تھی۔ وہ تھے اور دنیائے عیش ونشاط، لذّت سرور وانبساط، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لویزا اور فیری دونوں کو کبھی نکاح کے خیال نے پریشان نہ کیا۔ اُسی محبت کے استوار رشتہ سے وابستہ رہے۔ خوشیوں کے سال منٹوں کی طرح گزرتے رہے۔ کبھی یہ خیال بھی پاس تک نہ آتا تھا کہ دنیا میں اس راحت وشادمانی کی زیست سے بہتر کوئی اور زندگی ہو بھی سکتی ہے۔

ع "حُوریاں رقص کناں ساغرو پیمانہ زدند"

(ترجمہ)

محوی صدیقی

اے میرے بار بار دھڑکنے والے دل صرف ایکبار دھڑک اور ساکت ہو جا۔

اے میرے ہر لحظہ تڑپنے والے قلب ایک دفعہ تڑپ اور تڑپ کر خاموش ہو جا۔

اے محبت کی خلشِ غم۔ ہاں کوئی ایسا نشتر بھی چبھے جسکی آخری کھٹک کے بعد مجھے سکونِ جاوید نصیب ہو۔

اے ہر دم یاد آنیوالی تصویر۔ بس ایک ہی بار یاد آ۔ اور مجھے قیامت تک کے لئے خود فراموش کردے۔

ہاں ہاں اے لیلۃ الفراق کے سیاہ اور بھاری پردو" جس طرح تم نے مجھے اس مجسّمۂ حسن سے جدا کیا ہے اسی طرح اب میری روح اور جسم کے درمیان بھی حائل ہو جاؤ اور دونوں کو جدا کردو۔

مترجمہ حضرت مجنون

شیلے

پرسی بیشی شیلے انگلستان کے ایک معزز گھرانے مین ۱۷۹۲ء مین پیدا ہوا۔ اُسکے آبا و اجداد بڑے بڑے عہدون پر ممتاز تھے اُسکا دادا بیرونٹ تھا جو اُسوقت خاندان کا سرپرست تھا۔ شیلے کا باپ ٹیموتھی شیلے پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ مگر دونون کی طبیعتون مین زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شیلے نے قدرت سے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ وہ بحید ذکی الحس تھا اُسنے اپنی زندگی کا مطمح نظر بنا لیا تھا کہ وہ حتی الامکان مختلف علوم مین اپنا وقت صرف کرکے اُنمین ترقی حاصل کریگا۔ یونانی شعرا کا کلام اُسے بہت مرغوب تھا۔ اسکے علاوہ کیمیاگری اور ساحری سے بھی اُسے کچھ نہ کچھ اُنس تھا اور اُسکا اکثر وقت اسی خطرناک تجربون مین گذرتا تھا۔ شیلے نہایت خلیق اور بامروت تھا۔ اُسے اپنے عزیزون سے اسقدر محبت تھی کہ اُنکے لیے جان دینا بھی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ محبت اُسے اپنی بہنون سے تھی۔ اور اُسکا اکثر وقت اُنھین کے ساتھ کٹتا تھا۔ وہ ہر وقت اُنکے خوش کرنے اور اُنکو ہر کام مین مدد دینے کا خواہشمند تھا اور جب بھی موقع پاتا دریغ نہ کرتا۔ شیلے کی ابتدائی تعلیم برانٹ فورڈ اور ایٹن کے مشہور سکولون مین ہوئی۔ مگر وہان اُسے بالکل ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ سکول کے لڑکے اور اُستاد ہر وقت اُسے تنگ کرتے تھے اور اُس سے کسی قسم کی ہمدردی نہ کرتے تھے یہ کہدینا بھی ضروری ہے کہ شیلے کے عادات و اطوار ہی کچھ اس قسم کے تھے جنھون نے اُسے اُستادون اور لڑکون کی نظرون مین ذلیل بنا دیا تھا۔ بارے سکول کا زمانہ ختم ہوا۔ اب اُسنے کالج مین داخل ہونیکی ٹھانی چنانچہ وہ آکسفورڈ کالج مین داخل ہوا جہان اُسکے اور بھی بہت سے رشتہ دار تعلیم پا چکے تھے مگر وہان بھی اُسے اطمینان نصیب نہوا۔ اندنون کچھ شیلے کی طبیعت مذہب کی طرف زیادہ مائل تھی۔ ایک رسالہ خدا کی ہستی کو نہ ماننے کی ضرورت پر لکھ مارا۔ وہ کسی طرح یونیورسٹی کے اعلیٰ

افسر ڈین“ کے پاس پہونچ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کالج سے نکالے گئے۔ شیلے کے باپ نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح شیلے اپنی غلطی کا اقرار کرے اور معافی مانگ لے تاکہ اُسکی آیندہ زندگی برباد نہو جائے۔ مگر اُسنے ایک نہ مانی۔ اپنی ضد پر قائم رہا اور باپ سے ناراض ہوکر لندن مین ایک دوست کے پاس چلا گیا۔ انھین دنون مین شیلے کی بہنین لندن کے کسی دارالعلوم مین تعلیم پاتی تھین اور وہ انسے اکثر ملنے جایا کرتا تھا۔ اُسی اسکول مین ایک اور لڑکی ہیرٹ وسٹ برک بھی پڑھتی تھی جسکا شیلے کی بہنون سے بہت ارتباط و اتحاد تھا۔ ہیرٹ کا باپ ایک سخت مزاج آدمی تھا اور ہیرٹ اُس سے سخت تنگ آئی ہوئی تھی۔ شیلے کو اُس سے کچھ ہمدردی سی ہوگئی جسنے آخرکار محبت کی صورت اختیار کر لی آخرکار شادی ہوگئی۔ مگر یہ رشتہ بہت دیر تک نہ رہ سکا۔ کیونکہ شیلے کو اُسکے متعلق کچھ بدگمانیان سی ہوگئی تھین۔

شیلے غضب کا حسن پرست تھا۔ وہ بہت جلدی دل دے دیتا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اُسے اخیر مین پچھتانا پڑتا تھا۔ بعضون کا خیال ہے کہ اسکا چال چلن درست نہین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجنون شیلے کے نام سے مشہور ہوگیا تھا مگر دراصل بات یہ تھی کہ وہ ایک ابدی محبت کا پجاری تھا۔ وہ اُس محبت کا خواہشمند تھا جو کبھی فنا نہین ہوتی وہ اس محبت سے بیزار تھا۔ جو اس دُنیائے جد و جہد مین فنا ہو جاتی تھی۔

لندن مین اُن دنون ولم گاڈون ایک سوداگر رہتا تھا جسکی ایک نہایت خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ میری گاڈون علاوہ حسن ظاہری کے حسن باطنی سے بھی مزین تھی۔ شیلے اکثر وہان آیا جایا کرتا تھا۔ کشش دونون طرف ہونے لگی آخرکار ایک دن موقع پاکر دونون بھاگ نکلے ہیرٹ کیلیے یہ ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ وہ زیست سے بیزار ہوگئی۔ وہ سکون چاہتی تھی سکون مطلق، اُسے خلوت پسند تھی خلوت محض، اُسنے حصول مسرت کی آرزو چھوڑ دی تھی ہرگز نہین چاہتی تھی کہ کوئی اور خواہش کامیاب ہوکر اُسکی روح مین کوئی تحریک پیدا کرے، انسانی دل برگ گل سے زیادہ نازک ہے۔ اُسکا دل ٹوٹ گیا۔ آخرکار ایک دن خودکشی کرکے اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ شیلے کے دل پر اس خبر نے بہت بڑا اثر کیا۔ شاعر کے جذبات اور احساسا فطرتاً نہایت نازک لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہین۔ ایک مونس کی جدائی ہر شخص پر

اثر کرتی ہے۔ لیکن شاعر اس موقع پر بیتاب ہو جاتا ہے یہی حال شیلے کا تھا۔ اسکی آیندہ زندگی کو ہیرٹ کا خیال بہت بے مزہ کردیتا تھا اُسکا کلیجہ شق ہو جاتا تھا۔ اس خیال سے
کہ زندگی کی مہلت قلیل مین اگرچہ تعلقات ہم پیدا کرتے ہین تو اس اعتبار پر کہ رفاقت روحانی رنگ مین دائمی ہوگی لیکن موت ہمین اس سے مایوس کردیتی ہے۔ اسیلیے وہ کہا کرتا تھا
کسی کے ساتھ تاحیات رشتۂ محبت قائم کرنے کی آرزو کرنا سخت غلطی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آے دن نئی محبت مین گرفتار پایا جاتا تھا۔

اب شیلے نے اٹلی مین سکونت اختیار کی اور اپنی خداداد لیاقت کے جوہر دکھانے لگا۔ دنیا کے ہر کونے مین اسکی تعریف ہونے لگی اسکی نظمون مین ایک یہ خاصیت تھی کہ اُنمین ایک قسم کی شیرینی پائی جاتی تھی جو اور شاعرون مین کم دیکھنے مین آئی ہے۔ اُسکے خیالات اور جذبات کی پاکیزگی۔ تخیل کی رفعت نے اُسے دنیا مین اور بھی مشہور کردیا۔ وہان لارڈ بائرن سے اسکی پہلی ملاقات ہوئی جو دونون کیلیے مفید ثابت ہوئی وہان کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اسکی دوستی ایک لڑکی امیلیا ویونی سے ہوگئی۔ یہ لڑکی بلا کی حسین اور ذہین تھی۔ اسکا باپ نہایت سخت مزاج آدمی تھا اُسکا خیال تھا کہ لڑکی کا چال چلن کچھ مشتبہ ہے۔ اسیلیے اُسنے ایک آیجے مین اُسے نن بناکر سزا کے طور پر بھیجدیا۔ ایک دفعہ شیلے کو بھی اُس سے ملنے اور اُس سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا نتیجہ یہ ہوا کہ شیلے اور اسکی بیوی میری کو اُس سے بہت محبت ہوگئی۔ وہ اُسے نہایت پاک دامن اور نیک لڑکی خیال کرتا تھا۔ دونون میان بیوی اکثر ملنے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اسکی یاد مین ہمارے شاعر نے ایک نظم بھی لکھی ہے جو قابل دید ہے۔

شیلے کی موت کا قصہ بھی نہایت عجیب ہے۔ ایک روز سمندر کی سیر کر رہا تھا۔ کہ طوفان آگیا اور تاریکی مین کچھ پتہ نہ چلا کہ کون کدھر جاتا ہے جب طوفان تھم گیا۔ تو شیلے کی کشتی کا پتہ نہ لگا آخرکار دو دن کے بعد اسکی لاش ساحل سمندر پر ریت مین دبی ہوئی ملی۔ لاشہ جلایا گیا مگر کہتے ہین کہ شاعر کا نازک دل آگ کے شعلون سے بالکل محفوظ رہا۔

آہ! شیلے! تو موجود نہین گو تیری یاد ہمارے دل مین اور تیرا کلام ہمارے پیش نظر ہے ہم دیکھتے ہین کہ تیرے شعرون مین تیرے دل کی تصویر جھلک رہی ہے

افتخار الرسول بد

ماں یا ڈائن

(۱)

شام ہوگئی۔ تاریکی بڑھتی جاتی ہے لیکن ابھی تک گھر میں چراغ نہیں جلا۔ نئی بہو کو ابھی شرم ہی سے چھٹی نہیں ملتی۔ گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے شرماتی ہے، پھر اُٹھکر چراغ کیونکر جلائے۔

ایک پرکاش ہے۔ اُسے اتنی سمجھ کہاں کہ روشنی کا سامان کرے آخر بابو گنیش داس جی نے خود ہی کپڑے کی بتی بنائی، اور چراغ میں رکھکر تیل ڈھونڈنے لگے، مگر تیل کا برتن کہیں بھی نہ ملا۔ نئی بہو سے پوچھا:۔

"کیوں جی! کچھ تیل کے برتن کا بھی پتہ ہے"؟

لیکن ابھی گھر کے کام کاج سے اُسکا تعلق ہی کیا تھا کہ اُسے تیل کے برتن کا پتہ معلوم ہوتا۔ سر جھکا کر چپ ہو رہی۔ تیل کے برتن کا پتہ کیا بتاتی۔

(۱) ننھے پرکاش نے البتہ اپنی معصوم اور تتلائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بابو جی تیل کل ہی کھتیم ہوگیا (ختم) بلتن (برتن) الماری میں پلا (پڑا) ہے۔" اور جھٹ برتن اُٹھا کر لے آیا۔"

اِتنے میں ہوٹل کا نوکر کھانا لیکر آیا۔ اُس سے کھانا چوکے میں رکھوا کر بابو گنیش داس نے چار آنے کا تیل منگوا لیا۔

تیل آیا۔ اور دیا جلا

دیئے کی روشنی سے اندھیرا دور ہوگیا۔

پرکاش نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جے!"

سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے کسی شخص نے کہا "تیری بھی جے ہو۔ اِس دیئے کی طرح تو بھی روشن ہو" آواز سُنکر "بھیا! بھیا! نمشکار" کہتا ہوا پرکاش سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ آنیوالا پرکاش کا بھائی تھا۔ اُسکا نام گیان تھا۔ اُسنے پرکاش کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور پیار سے کہا۔ جیتے رہو

پرکاش چرنجیو ہو۔"

باہر ہوا تیز چل رہی تھی۔ ایک جھونکا کھڑکی کے کواڑوں سے لڑ جھگڑ کر اندر آ ہی پہونچا۔ اور چراغ بجھ گیا!

گیان کا دل دھک سے رہ گیا۔" ہیں۔ تو کیا پرکاش بھی اسی طرح ... نہیں نہیں یہ وہم ہے"

بابوجی بولے "ارے بجھ گیا۔ ایسے دیئے سے کیا فائدہ۔ کل ہی کنکشن کے لئے لکھیں گے۔ کیوں گیان۔ چار بتیاں کافی ہونگی نہ؟"

گیان اپنے ہی خیال میں غلطاں تھا۔ کچھ نہ بولا۔

پرکاش نے کہا "ایک بجلی کا پنکھا بھی"

بہت اچھا۔ بابوجی نے کہا۔ اور کھڑکی کو اچھی طرح بند کرکے پھر دیا جلایا۔

پرکاش گیان کی گود سے اتر آیا۔ اور نئی بہو کا آنچل پکڑ کر کہنے لگا۔ اٹھ سبھدرا۔ رو ٹی تو پلوس دے۔ بھیا کو بھوک لگی ہے۔

بابوجی بولے "ہشت پگلے۔ نام نہیں لیتے۔ ماں جی کہہ"

"ماں جی؟ کیوں بھیا۔ یہ ماں جی ہیں"

گیان کا چہرہ اداس ہو گیا۔ ماں کا پرجلال چہرہ آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ محبت اور ایثار کی دیوی۔ جس نے تمام عمر اپنے دل کو اپنے خاوند اور لڑکوں کے دکھ سکھ کا آماجگاہ بنائے رکھا۔ جیتے رہتے ہوئے گھر پر شانتی کی حکومت تھی۔ موت نے ہمیشہ کے لئے اسکو اس گھر سے جدا کر دیا۔ اسکی جگہ یہ کل کی چھوکری آگئی ہے۔ تب شانتی تھی۔ اب سنسان ہے۔ شانتی اور سنسان میں بڑا فرق ہے۔

پرکاش نے کوئی جواب نہ پاکر پھر پوچھا۔ "ہاں بھیا۔ یہ ماں جی ہیں؟"

گیان نے دلمیں سوچا "کیا یہ پرکاش کی بیماری میں رات بھر جاگے گی۔ یا سکھ کی نیند سوئیگی اسکو تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے گی۔ یا خوشی منا دے گی؟ جب یہ رو دے گا تو کیا اسکا دل بھی رو دیگا یا خوشی منائے گا؟ مرحوم ماں کی طرح کیا یہ اسے محبت کی نگاہوں سے دیکھے گی یا حسد سے جلتی رہے گی؟ کیا یہ ماں بنے گی یا ڈائن؟ پتہ نہیں کیا بنے۔۔ دیکھیں یہ ماں بنتی ہے

یا ڈائن . . .''

گیان نے آہستگی سے جواب دیا "ہاں - یہ ماں ہی ہیں"

یہ سُنکر پرکاش نے پھر کہا "اچھا ماں جی بوئی پلوس دو نہ" لیکن نئی بہو یعنی سبھدرا اس سے مس نہ ہوئی - آخر باوجی نے ہی روٹی پروسی - اور تینوں باپ بیٹوں نے کھائی - کھانا ختم ہونے پر گیان نے کہا "آج میں بورڈنگ ہاؤس میں کشن چند کے پاس ہی رہوں گا - واپس نہیں آؤنگا - کل امتحان ہے - اسلئے کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے"

پرکاش نے پرنام کیا - اُسکو پیار کرکے گیان گھر سے چلا گیا -

(۲)

دیئے کی روشنی اور پرکاش کی زندگی - کیا دونوں ایک سی ہیں ؟ روشنی نے ایک منٹ کیلئے فتح حاصل کرلی - اندھیرے کو دور بھگا دیا - اور پھر خود ختم ہوگئی - کیا اسی طرح پرکاش بھی . . . ؟"

انسانی زندگی کیا ہے - فقط کچی مٹی کا گھڑا - کبھی سطح آب پر ادھر لڑھکتا ہے - کبھی اُدھر - لیکن پانی کا ایک جھکولا آیا - اور بس ختم - پتہ ہی نہیں کہ تھا بھی یا نہیں - مگر کیا . . . پرکاش بھی اسی طرح . . . ؟"

خیالات پریشان زبردستی گیان کے دماغ میں جگہ حاصل کر رہے تھے - وہ اُنھیں دور کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ اور بھی زور شور سے گھُستے چلے آتے تھے - چلتی ہوئی رو بند نہ ہوئی - سلسلہ ختم نہوا -

شبنم صبح صبح چمکتے ہوئے غنچوں اور کھلے ہوئے پھولوں کی شان کو دوبالا کرتی ہے - اُسوقت لعل اور یاقوت بھی اُس سے شرماتے ہیں - لیکن زرا سورج بڑھا - اور بس - فنا -

ہوا کے جھونکے نے دیا گُل کردیا - گھڑا پانی کے جھکولے سے ٹوٹ گیا - شبنم کو سورج نے مٹا دیا - یا پرکاش بھی اسی طرح . . . . ،

گیان نے بہت کوشش کی لیکن خیالات ہٹانے سے نہ ہٹے - سر ہلایا - آنکھیں بند کیں - بندھ کو کون باندھ روک سکتا ہے - سلسلہ قائم ہی رہا -

ہاں تو پرکاش . . . کو کون ستائے گا ؟ . . . کیا نئی ماں ہی اُسکی ہتیا کریگی ؟ کیا سبھدرا ہی ڈائن بنے گی ؟ . . . برے برے شبہ ہوا - عورت ذات تو پریم مجسم ہے - دوسرے کا بچہ دیکھا اُسکا دل کچی ہو جاتا ہے "تو کیا اپنے ہی خاوند کے بیٹے کا بُرا چاہے گی - مگر عورت تو . . .

تو ڈائن بھی ہوتی ہیں . . . تو سبھدرا کیا بنے گی؟ شفیق ماں - یا سنگدل ڈائن؟

(۳)

ہوش سے روٹی آنی بند ہوگئی - اور سبھدرا خود پکانے لگی - گھر کا سب کام کاج اُس نے سنبھال لیا - سودا سلف بابوجی لے آتے تھے - پرکاش کو بھی کچھ کام کرنا پڑتا تھا - پہلے تو لئی مہینے سبھدرا پرکاش سے بولی تک نہیں - وہ ماں جی ماں جی کہتے تھک جاتا - مگر کیا مجال جو کبھی سبھدرا نے اُس غریب پر شفقت کی نظر ڈالی ہو -

اسی طرح دن گذرتے گذرتے سال ختم ہوگیا اور گیان کے وہم نے عملی صورت اختیار کرنی شروع کردی -

ایک دن خلافِ معمول سبھدرا پرکاش سے کہنے لگی "اس کتاب کے ورق جڑے ہوئے ہیں انھیں علیحدہ علیحدہ تو کردے "

پرکاش خوشی سے پھولا نہ سمایا - شکر ہے - ماں بولی تو سہی - بہت اچھا ماں جی " یہ کہکر وہ چاقو سے ورق علیحدہ علیحدہ کرنے لگا - بچّہ تھا - علیحدہ کرتے کرتے ایک دو ورق پھٹ گئے - بس پھر کیا تھا - وہ تو گویا موقعہ ہی ڈھونڈھ رہی تھی - کڑکتے بادلوں کی طرح گرج اُٹھی - خوب دل کھول کر گالیاں سنائیں - غصّے سے اُسکے چہرہ کا رنگ سُرخ ہوگیا - جسم کانپنے لگا -

پرکاش نے میٹھی میٹھی باتوں کے سوا کبھی کچھ نہ سُنا تھا - سبھدرا کی یہ کیفیت دیکھ کر سہم گیا - اسکی جان آدھی رہ گئی - ڈر سے پیشاب خطا ہوگیا -

اسپر بھی سبھدرا کو اسکی بیکسی پر ترس نہ آیا - گھونسوں - تھپڑوں - لاتوں کی بوچھار کردی -

پرکاش ہائے ماں جی، ہائے ماں جی چلّاتا رہا -

پڑوسی عورتوں سے بھی سبھدرا کا میل جول نہ تھا، وہ گلی میں کبھی جھانکتی بھی نہ تھی - ہروقت ناول قصّے پڑھنے میں مشغول رہتی تھی - اب جو گلی والی عورتوں نے پرکاش کی چلاہٹ سُنی تو مکان میں چلی آئیں - سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی عورتوں کی آواز سُنکر سبھدرا کا ہاتھ ذرا تھما - مگر اُس کا غصّہ اپنا کام کرچکا تھا - پرکاش بیہوش پڑا تھا!

بسنتی کی ماں نے غصہ سے کہا - اری ماں ہے کہ تو - نردئی راکششنی! ادھر پرکاش کو دیکھ کر بولی

ہائے ہائے! ننھا تو بیہوش ہے۔ ذرا پانی تو لاؤ کوئی"
دو تین لڑکیاں دوڑی دوڑی اور چوکے سے پانی لے آئیں۔ بسنتی کی ماں نے پرکاش کو گود میں لے لیا۔ منھ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ چند منٹ بعد اُسے ہوش آیا۔ آنکھیں کھولیں۔ لیکن پھر ڈر کے مارے بند کرلیں۔ بسنتی کی ماں نے چمکار کر کہا۔
کھول دے آنکھیں میرے لال۔ ہم سبھدرا کو ماریں گے"
پرکاش نے آنکھیں کھول کر دھیمی آواز سے کہا۔ نہ۔ نہ۔ اُنھیں نہ مارنا (مارنا)۔ وہ میلی (میری) ماں جی ہیں۔ مجھ سے کتاب پھٹ گئی تھی"
دیوکی نے کہا" ارے یہ اور ماں۔ یہ تو ڈائن ہے ڈائن۔ اسکے بس میں ہو تو کچا کھا جائے۔
سومترا بولی۔ آج جب گیان آئے۔ اُسے اس ڈائن کی کرتوت بتا دینا"
رامی نے کہا۔ بابو سے کہوگی تو وہ اُلٹا تمھیں ہی ڈانٹیں گے"
دیوکی نے کہا" وہ تو اس ناگنی کے بس میں ہو گئے"
اس پر سب ہنس پڑیں۔ سبھدرا بوکھلا گئی۔ پرکاش کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔
بازار سے کچھ دودھ منگوا کر پرکاش کو پلوایا۔ اور پھر سب عورتیں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔
اُسی روز یہ پردہ کھل گیا کہ جو ماں بنی تھی وہ ڈائن ہے۔ سوت تو نہ تھی مگر سوت کے بیٹے تو تھے۔ اُنھیں کے جلاپے میں جل گئی۔
اُس رات پرکاش نے اپنی مار کی بابت گیان کو کچھ نہ بتایا۔ لیکن اب شاید ہی کوئی دن جاتا۔ جسدن اُسے سبھدرا نہ مارتی۔ گالیوں اور بے دریغ مار نے اُسکا سب بھولا پن چھین لیا۔ اب پرکاش پہلا بھولا بھالا پرکاش نہ تھا۔ وہ پرکاش جو کبھی کھلونوں سے کھیلتا رہتا تھا۔ اُچھلتا تھا۔ کودتا تھا۔ جو ایک دم بھی نچلا نہ بیٹھتا تھا۔ اب ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں پڑا رہتا تھا۔ جو کھانے کو ملگیا۔ کھا لیتا۔ کبھی مانگتا یا ضد نہ کرتا تھا۔ پھول سے گال کمھلا گئے۔ رنگ پیلا پڑ گیا۔
گیان اُسکی دن بہ دن بری صحت اور چپ کو دیکھکر چوکنا ہو گیا۔ ایک دن اُسنے پرکاش کو گودی میں بٹھا کر پیار کیا۔ اور پوچھا:۔"کیوں پرکاش تم اب ہر وقت چپ چاپ کیوں رہتے ہو"
"نہیں بھیا کوئی بات نہیں"

گیان نے پیار سے پوچھا "متیں ماں جی تنگ تو نہیں کرتیں"؟
یہ سوال سنکر پرکاش کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے "ہاں بھیّا وہ مجھے بہت مارتی ہیں۔
بسنتی کی ماں کہتی تھی۔ کہ مائیں ایسی بے دردی سے نہیں مارا کرتیں۔ کیا وہ ماں ہو بھیّا؟"
گیان سارے دن بورڈنگ ہاؤس میں اپنے دوست کشن چند کے پاس پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتا تھا۔ صبح اور شام دو وقت صرف روٹی کھانے گھر آتا تھا۔ اُسے پرکاش کی مار اور گالیوں وغیرہ کی بابت کچھ بھی علم نہ تھا۔ پرکاش کی بات سنکر اُسکا رنگ اُڑ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور خود بخود اُسکے منھ سے نکل گیا "تو کیا وہ ڈائن ہی بنے گی" اور پھر دسیئے کی پیشینگوئی یاد آگئی۔ آنکھیں آب گوں ہوگئیں "ماں! پیاری ماں!! آ اور دیکھ تیری امانت پر کیسا ظلم ہو رہا ہے!!!
پرکاش نے روتے ہوئے کہا "مت روؤ بھیّا۔ اب میں کبھی سبھدرا کو ماں نہیں کہوں گا۔
سبھدرا بھی دروازے کے پاس چھپی سب باتیں سُن رہی تھی۔ غصّے سے پاگل ہی تو ہوگئی۔ گیان کی موجودگی میں پرکاش کو کچھ کہنے کی اُسکی ہمّت نہ ہوئی۔ چپکے سے اوپر چوکے میں چلی گئی۔ گیان نے اُسکے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز سُن لی۔ سمجھ گیا کہ اُسنے سب کچھ سُن لیا ہے۔ اور سوچا کہ اگر پرکاش کو گھر چھوڑ گیا تو وہ ضرور ماریگی۔ آنسو پونچھ کر کہنے لگا۔ چلو پرکاش تمھیں ایک جگہ ضیافت میں لے چلیں۔ نئے کپڑے نکلوا کر پہن لو۔ زرا جلدی کرو۔

پرکاش سبھدرا سے چابیوں کا گچھا لے آیا۔ اور کہنے لگا "سبھدرا کہتی ہے خود ہی نکال لو"
"اچھا میں کپڑے نکالتا ہوں۔ اور تم جا کر کہہ آؤ کہ آج ہم دونوں کے واسطے کھانا نہ بنائیے"
پرکاش جا کر کہہ آیا۔ گیان نے کپڑے نکالے اور پرکاش کو پہنا کر گھر سے باہر لے گیا۔ بچے کا بہلانا کونسی مشکل ہے۔ بورڈنگ ہاؤس میں جا کر گیان نے مٹھائی منگوائی اور کشن چند کے کمرہ میں بیٹھکر خود بھی کھائی اور پرکاش کو بھی کھلائی۔ بورڈنگ ہاؤس کے اور لڑکے آگئے۔ پرکاش کے گرد کھڑے ہوگئے۔ بھولے بھالے پھول سے بچہ کو دیکھکر کون خوش نہیں ہوتا۔ سبھی اُسے پیار کرنے لگے۔ پہلے تو کچھ دیر وہ شرماتا رہا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد گھُل مِل گیا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ اور ایک دفعہ پھر وہی ہیلا پرکاش بنگیا۔ گیان کا دل خوشی کے مارے دھڑکنے لگا۔ پرکاش نے سمجھا۔ بس اب مار کے دن گئے۔ لیکن مار سے بچانے کیلئے نقلی ضیافت آخر کار ختم ہوگئی۔

اُس دن تو پرکاش مار سے بچ گیا۔ لیکن اُسکی ساری کسر دوسرے دن نکل گئی۔ مار کی تکلیف پرکاش کو بھگتنے پڑتی تھی۔ لیکن گیان کے دل پر ایک خاص اثر پڑتا تھا۔ وہ بھی اندر ہی اندر گھلتا جاتا تھا۔ بابوجی نے شادی کی تھی کہ گھر کی رونق بڑھے۔ لیکن اُلٹی گھر کی سب خوشی مفقود ہو گئی۔ دفتر سے آتے تو سبھدرا کا بشاش چہرہ دیکھنے کے بجائے۔ پرکاش کے خلاف شکایتیں سُننی پڑتیں۔ آخر سنتے سنتے اُنپر بھی اثر ہوا اور پرکاش کی گوشمالی اپنا فرض سمجھنے لگے۔

ماں کی مار۔ باپ کی جھڑکیاں۔ پھر بچے کی نشو و نما ہو تو خاک۔ پرکاش روز بروز سوکھتا رہا!

(۴)

گیان نے ایم۔ اے۔ پاس کر لیا مگر کوئی نوکری نہ ملی۔ بابو گنیش داس اور دوسرے رشتہ داروں نے بہت کوشش کی لیکن کوئی انتظام نہ ہوا۔ سرکاری نوکری گیان کو پسند نہ تھی۔ دوسرا کوئی کام نہ ملتا تھا۔ اسلئے وہ چھ سات ماہ بیکار ہی بیٹھا رہا۔

ایک دن ایک اخبار میں یہ اشتہار نظر پڑا۔

ایک ہفت سالہ لڑکے کے لئے اُستاد کی ضرورت ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ حسب لیاقت۔

ذیل کے پتہ پر درخواست آنا چاہیے

سیٹھ گنگا پرشاد رئیس دریبہ کلاں

(دھلی)

اشتہار پڑھکر گیان نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ دھلی چلکر قسمت آزمانی چاہیے۔ اسی دن اُسنے بابوجی سے ذکر کیا پہلے تو وہ نہ مانے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اسکو کہیں تو کام کرنا ہی ہے۔ لاہور نہیں تو دھلی ہی سہی۔ آخر اُنھوں نے دھلی جانے کی اجازت دے دی۔

دوسرے دن گیان گاڑی میں سوار ہو کر دھلی جا پہونچا۔

وہاں ایک روٹی والے کی دوکان پر کھانے سے فارغ ہو کر سیٹھ گنگا پرشاد کا مکان ڈھونڈنے نکلا۔ سیٹھ صاحب دھلی کے نامی گرامی رئیس تھے۔ آسانی سے پتہ مل گیا۔ عالیشان حویلی کے بڑے پھاٹک میں سے گذر کر گیان اندر پہونچا۔ اور سیٹھ صاحب کو اطلاع کرائی۔ سیٹھ صاحب نے

فوراً اندر بلا لیا۔

سیٹھ صاحب کے پاس اب تک کئی امیدوار آچکے تھے۔ لیکن اُن میں سے آپ نے کسی کو بھی اپنے بیٹے کا اتالیق بننے کے قابل نہ سمجھا۔ کسی میں لیاقت کی کمی تھی۔ تو کسی میں شرافت کی۔ کوئی جسم کا کمزور تھا۔ تو کوئی شکل کا بھونڈا۔ گیان سے باتیں کرکے آپ بہت خوش ہوئے۔ اور بولے "بابو صاحب میں اپنے آپ کو نہایت ہی خوش نصیب سمجھوں گا۔ اگر آپ اندر کا اتالیق بننا منظور فرمائیں۔ میں فی الحال آپ کو ایک سو روپیہ ماہوار دے سکتا ہوں"

گیان نے جواب دیا "مجھے بسر و چشم منظور ہے"

"تو پھر آج سے ہی اندر کو اپنی حفاظت میں لے لیں۔ آپ ہی اُسکے محافظ ہونگے۔ اور آپ ہی اُسکے اتالیق۔ مجھے امید ہے کہ آپ اُسے خاص توجہ سے نیک راہ پر چلانے کی کوشش کریں گے"

تھوڑی دیر کے لیئے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر ایک لمبی سانس بھر کے بولے "بس۔ آج سے اندر آپکے سپرد ہے۔ اِسوقت اسکا دل کورے کاغذ کی مانند صاف ہے۔ اُسپر کسی قسم کا نشان نہیں۔ وہ بےلوث ہے۔ وہ دنیا کے حالات سے بیخبر ہے۔ آپ اُسے فرشتہ بنائیں یا شیطان۔ سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اور ایک چھوٹے سے لڑکے کی پیٹھ پر تھپکی دیکر کہنے لگے۔

"اُٹھو بیٹا۔ یہ تمھارے گُرو ہیں۔ پرنام کرو"

لڑکے نے اُٹھ کر پرنام کیا۔ گیان نے کہا "جیتے رہو۔ آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ"

اندر بڑا ذہین تھا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ گیان نے اُسکے عادات و خصائل کو اچھی طرح دیکھکر سیٹھ صاحب سے کہا۔

"بڑا ہو کر آپ کا لڑکا خوب نام پیدا کریگا"

سیٹھ صاحب بڑے خوش ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ اندر کی قسمت گیان کے ہاتھ میں ہے۔ انکساری سے اُنھوں نے جواب دیا۔

"بابو جی۔ جیسا آپ بنائیں گے ویسا ہی ہو جائیگا"

سیٹھ صاحب کو اندر پر بڑا فخر تھا۔ گیان بھی اندر سے کچھ کم محبت نہ رکھتا تھا۔ ذہین۔ فرمانبردار شاگرد پر اُستاد کو فخر ہونا لازمی ہے۔ وہ اُسے خوب دل لگاکر پڑھاتا تھا۔ وہ بھی شوق سے پڑھتا تھا

گیان کے پڑھانے کا طریقہ نرالا تھا۔ ہندوستان کے سکولوں میں کتابوں پر زور دیا جاتا ہے، یہ اُسے بالکل پسند نہ تھا۔ زبانی پڑھانے کو وہ اچھا سمجھتا تھا۔ زبانی پڑھانے سے سوال و جواب کا خوب موقعہ مل سکتا ہے۔ اور کتابوں کو رٹنے میں تو فضول وقت ضائع جاتا ہے۔ وہی ذہانت اور قوت لڑکوں کی جسمانی صحت اور دماغی تربیت میں مفید طور پر خرچ ہو سکتی ہے۔

گیان عملی مشاہدہ پر بڑا زور دیتا تھا۔ جس چیز کو پڑھانا ہوتا۔ اُسکو سامنے رکھ لیتا۔ گائے پر سبق دینا ہوتا۔ تو گائے کے پاس کھڑے ہوکر۔ دریا کی بابت کچھ بتانا ہوتا۔ تو دریا پر جاکر۔ پڑھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ وہ سکول کے کمروں میں بند نہ تھا۔ تمام زمین اور آسمان اُنکے سامنے کھلے پڑے تھے۔

اس طرح اندر کو علم کا ایک اعوطہ خور بنانے میں گیان مشغول ہو گیا۔

ایک دن اُستاد شاگرد دونوں باغ میں سیر کر رہے تھے۔ خوبصورت پھولوں کو دیکھکر اندر بہت خوش ہوا۔ اُسنے اُنکے نام گیان سے پوچھے۔ اُس نے بتائے۔ تھوڑی دیر بعد اندر اپنی دوربین سے دور دور کی چیزیں دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔

گیان کو پرکاش یاد آگیا۔ اُسی میں محو ہو گیا۔

"بدقسمت پرکاش! اُس چکی میں پس رہا ہے۔ جسکا ایک پاٹ سگا باپ اور دوسرا پاٹ سوتیلی ماں ہے۔ میں تو گھر سے چلا آیا۔ لیکن پرکاش کا کیا حال ہوگا؟ چکی کے پاٹوں سے کب تک بچا رہیگا؟ ... کاش! ہمیں ماں کی جدائی نہ دیکھنی پڑتی۔

اُتنے میں اندر چلّا کر بولا۔ گروجی۔ گروجی۔ وہ دیکھو سامنے آم پر کوئل کے گھونسلے میں کوّے کا بچّہ!"

گیان نے اندر سے دوربین لیکر دیکھا۔ آم پر کے گھونسلے میں ایک کوئل ایک چھوٹے سے کوّے کے بچّہ کو چونچ سے چوگا کھلا رہی تھی۔ گیان نے سوچا۔ بچّہ پرایا ہے۔ لیکن کوئل کے دل میں اُسکے لئے بڑا پیار ہے۔ سگی نہیں تو سوتیلی ہی سہی۔ آخر تو ماں ہے۔ لیکن افسوس۔ نسل انسانی میں ایسا نہیں۔ اُن میں سوتیلی ماں کے معنی ڈائن بھی ہو سکتے ہیں۔ آہ! ماں کے لفظ کی کیسی توہین ہو رہی ہے۔"

گیان کا دُکھی دل اور بھی دُکھی ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ دوربین آنکھوں سے ہٹا کر بھرّائی ہوئی آواز سے بولے۔

"اندر! تم کیسے خوش نصیب ہو کہ تمھیں ماں کی محبت میسّر ہے"
اندر نے تعجب سے پوچھا "خوش نصیب"؟ اسمیں خوش نصیبی کون سی ہے؟
"کیا دنیا میں کوئی ایسا بھی بچہ ہے۔ جسے ماں کی محبت نصیب نہ ہو؟"
"ہاں میرا ہی ایک چھوٹا بھائی ہے"
"آپ کا چھوٹا بھائی اسکی عمر کتنی ہے؟"
"تم سے ایک سال چھوٹا ہے"
"ہیں! کیا پیاری ماں کی۔ پیاری پیاری لوریاں سُننی اُسکے نصیب میں نہیں؟ کیا اُسے کوئی پیار سے گودی میں نہیں بٹھاتا ہے"
"نہیں"
"تو پھر آپ کے بابوجی نے اُسے اور ماں کیوں نہ لا دی؟"
"لا تو دی۔ لیکن وہ ڈائن نکلی"

(۵)

پرکاش کی حالت اب آگے سے بھی بری ہو گئی۔ کھانے کو جھوٹے ٹکڑے۔ پہننے کو پھٹے پرانے چھیتھڑے۔ بابوجی اُسے دیکھ کر بہت کڑھتے۔ سبھدرا سے کہتے "دیکھو لڑکا چھوٹا ہے۔ اسکی خوراک اور پوشاک کا اچھی طرح دھیان رکھنا چاہیئے۔ اور نہیں تو کم از کم اپنی عزت کا ہی خیال کرو۔ پھٹے پرانے چیتھڑوں میں بھنگی کا بیٹا معلوم ہوتا ہے"
لیکن وہ صرف اتنا جواب دیتی کہ "میں کیا کروں؟ پہنتا پیچھے ہے۔ پھاڑ پہلے دیتا ہے۔ اب اتنے کپڑے کہاں سے لاؤں۔ آپ ہی تھان لے آئیں میں اور جوڑے سی دوں گی"
تھان آتا لیکن پرکاش کے جسم پر پھر بھی وہی چیتھڑے رہتے۔ ماں کی گود کیا چھنی۔ پرکاش عذاب میں پھنس گیا!
چور کا دل کتنا؟ گلی میں سر اونچا کر کے نکلنے کی بابوجی میں ہمت نہ رہی۔ اُنھیں ہر شخص کی نگاہ یہی کہتی معلوم ہوتی تھی کہ دیکھو ایک لڑکے کو تو دھکا نکال دیا۔ اب دوسرے کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے۔ دفتر سے آتے۔ چپکے سے سر جھکائے گھر میں گھس جاتے۔ وہاں پژمردہ۔ زرد چہرہ۔ چیتھڑے

لگا پرکاش کو دیکھکر اُن کا دل باغ باغ ہو جاتا - پاس ہی ریشم و مخمل میں ملبوس حسن و جوانی کی ملکہ سبھدرا - ناز و انداز سے اُنکے دل کو اپنا کھلونا بنانے کے لئے موجود ہوتی - لیکن اُن کا دل اب اُس جال میں پھنسنے کی خواہش نہ رکھتا تھا - غم و اندوہ نے اُس پر اپنا قبضہ جما لیا تھا - دُنیا میں حسن و جوانی ہی سب کچھ نہیں - اور بھی بہت سی باتیں ہیں!

وہ اب ہر وقت بے چین رہنے لگے - ایک دھندلا سا خیال اُنکے دماغ میں پیدا ہو گیا - اُس خیال کا سایہ ہر وقت اُنکی طبیعت پر چھایا رہتا تھا - لیکن اُنکی سمجھ میں نہ آتا کہ تکلیف کیوں ہے؟ کیا خیال ستا رہا ہے؟

آخر رفتہ رفتہ اُنھیں اپنی بے چینی کا احساس ہونے لگا - بے اختیار یاس و حسرت بھرے لہجہ میں اُنکے منھ سے نکل گیا "گھر کا گھر بگڑا - جگ ہنسائی علیحدہ - کاش میں دوسری شادی نہ کرتا -"

بیاہ کے دو سال بعد تک سبھدرا ہی اُنکی خوشیوں کا مرکز تھی - اُسی کے سبب سے اُنھیں تمام جہان دلپسند نظر آتا تھا - وہ اُسکے غلام بے دام تھے - اُسکی خواہشات و فرمایشات پوری کرنے میں اُنھیں خاص حظ حاصل ہوتا تھا - لیکن گیان کے دھلی جانے کے بعد اُنکا دھیان اکیلی سبھدرا ہی کی طرف نہ رہا - بلکہ اُنکے دل میں دنیا کی اور فکریں بھی آ گئیں -

اس نئے خیال کے پیدا ہونے پر سبھدرا سے بے التفاتی بڑھ گئی - غلامی کی زنجیروں کو اُنھوں نے توڑ دیا - اپنی عقل سے کام لینے لگے -

جنگل میں خود رو پودے اُگتے ہیں - اُنھیں کی طرح پرکاش بھی چوٹھا کھا کر اور پٹا پس کر چھ برس کا ہو گیا - لیکن اگر ایک چھوٹے پودے کے گرد اور بڑے بڑے درخت اُسکی روشنی اور ہوا چھین لینے والے ہوں - تو اُسکی زندگی مشکوک ہو جاتی ہے - وہی پرکاش کے ساتھ ہوا -

بابو جی پرکاش کی بری حالت زیادہ دیر نہ دیکھ سکے - اُنھوں نے اُسکی خوراک اور پوشاک کا سب انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا - درزی سے چند جوڑے کپڑوں کے سلوائے - صبح اُٹھ کر خود نہلا دُھلا کر کپڑے پہناتے - اور پھر اپنے سامنے ناشتہ کھلا کر سکول بھیجتے -

لیکن جس پودے کی جڑیں خراب ہو جائیں - وہ پانی کے بجائے دودھ سے سینچا جائے تو بھی بار آور نہیں ہو سکتا - سکول گھر سے ذرا دور تھا - بارہ بجے چھٹی ہوتی تھی - دھوپ میں گھر آنا پڑتا تھا -

کمزور جسم جولائی کی کڑکتی دھوپ برداشت نہ کر سکا۔ پرکاش کو ایک دن بخار آ گیا۔

زور کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ پرکاش مشکل سے گھر پہونچا۔ بابوجی اُس وقت دفتر گئے ہوئے تھے سبھدرا اپنے کمرے میں بیٹھی "آنکھ کی کرکری" پڑھ رہی تھی۔ اُسکے آنے کی آہٹ پاکر وہیں سے بولی چوکے میں روٹی پڑی ہے۔ جاکے کھالے"۔ پرکاش نے اپنے بخار کی بابت اُسے کچھ نہ بتایا۔ اُسے روٹی کھانے کا ہوش نہ تھا۔ بغیر کھانا کھائے دالان میں زمین ہی پر ٹاٹ بچھا کر لیٹ گیا۔

سارا دن وہیں بیہوش پڑا رہا۔ شام کو بابوجی دفتر سے آئے۔ اُنکو حقہ پینے کی عادت نہ تھی۔ اسکے علاوہ اور بھی کوئی شغل نہ تھا۔ روزانہ پرکاش پاس آ بیٹھتا تھا۔ اور سکول میں پڑھا ہوا سبق سناتا تھا۔ لیکن آج وہ بھی نہ آیا۔ سبھدرا اوپر چوکے میں کھانا پکا رہی تھی۔ کچھ دیر پرکاش کا انتظار کرکے بابوجی اوپر گئے۔ اور سبھدرا سے پوچھنے لگے "پرکاش کہاں گیا؟"

وہ ترکاری کاٹ رہی تھی۔ ہاتھ سے چاقو زمین پر رکھکر بولی۔ "سکول سے آتے ہی پتہ نہیں کدھر مر گیا۔ میں خود پکارتے پکارتے تھک گئی ہوں۔ سبزی بھی لسنتی کے بیٹے سے منگوائی ہے"

بابوجی نے یہ سمجھکر کہ کسی لڑکے کے گھر کھیلنے چلا گیا ہوگا۔ چُپ ہو گئے۔ اور نیچے اُتر آئے۔ باغ کی سیر کا ارادہ ہوا۔ دالان میں اُنکی چھڑی پڑی ہوئی تھی۔ اُسے لینے وہاں گئے۔ زمین پر لیٹے ہوئے پرکاش کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بولے "ارے یہاں گرمی میں پڑا ہے۔ اُٹھ اوپر ہوا میں جاکر سو"

لیکن وہ بیہوش تھا۔ اُسنے کچھ نہ سُنا۔ بابوجی نے جھک کر شانہ ہلایا۔ اُسکا جسم اُنھیں کچھ گرم معلوم ہوا۔ پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہی بولے۔ "اُخوہ! بڑے زور کا بخار ہے"۔ سبھدرا کو آواز دی "یہاں آنا۔ ذرا چارپائی پر بستر تو کر دو"۔ سبھدرا نے آکر چپکے سے بستر لگا دیا۔ بابوجی نے پرکاش کو اُٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ اور کہنے لگے۔ "بڑے زور کا بخار ہے"۔

سبھدرا لاپرواہی سے بولی "اچھا!" اور تھوڑی دیر خاموش کھڑی رہکر پھر اوپر چوکے میں چلی گئی۔ بابوجی چارپائی کے قریب ایک کرسی کھینچکر بیٹھ گئے۔

بیٹھے بیٹھے نو بج گئے۔ سبھدرا اوپر چوکے میں بیٹھی اُکتا گئی۔ بابوجی کا کھانا وہیں لے آئی۔ اُنھوں نے بادلِ ناخواستہ چند لقمے کھائے۔ اور پھر وہیں ایک چارپائی بچھا کر لیٹنے کی تیاری کرنے لگے۔

سبھدرا نیک ماں نہ تھی لیکن نیک بیوی ضرور تھی۔ وہ دل سے اپنے شوہر کی محبت کرتی تھی۔

پرے بیٹھی ہے۔ چھوڑ دو۔ مجھے اُسکے پاس جانے دو۔"

بھدرا کے دل پر چوٹ لگی۔ بیاہ کے بعد کی زندگی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ اُسنے سوچا۔ جب پہلے پہل یہاں آئی تھی۔ یہ کتنا خوبصورت تھا! لیکن میں نے اسکی خوبصورتی، اسکے بھولے پن کی قدر۔ نہ کی۔ یہ مجھے ماں جی۔ ماں جی۔ کہتا رہا۔ لیکن میں اسکی ماں نہ بنی۔ اسکو بہت تکلیف پہونچائی۔ اسے بہت ستایا۔ ۔ ۔ اب ۔ ۔ ۔ کیا یہ نہ بچے گا؟ کیا اسیطرح دنیا سے نامراد چلا جائیگا؟ ۔ ۔ ۔ اگر ایسا ہوا تو اسکی ہتیا میرے ہی سر ہوگی۔ میں ہی ڈائن کہلاؤنگی۔

اُسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

پرکاش پھر چلایا "چھوڑ دو! تم میری ماں نہیں ہو۔"

روتی ہوئی بھدرا نے اُسے چمکار کر کہا "چُپ میرے لال! آج سے میں تیری ماں بنتی ہوں۔"

اتنے میں بابو جی ڈاکٹر کو لیکر آ گئے۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح دیکھکر کہا "کوئی ڈر کی بات نہیں۔ معمولی بخار کا زور ہے۔ برف منگوا کر اسکے سر پر لگائیے۔ بخار کم ہو جائیگا اور ساتھ ہی بے چینی بھی دور ہو جائیگی۔ نسخہ صبح لکھ دوں گا۔ اسوقت دَوَا کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ڈاکٹر اپنی فیس لیکر چلا گیا۔ بابو جی برف لے آئے۔ اور پرکاش کے سر پر رکھی۔ پندرہ بیس منٹ میں بخار کا زور کم ہوا۔ بے چینی دور ہو گئی۔ پرکاش آرام سے سو گیا۔ بابو جی نے باقی برف کمبل میں لپیٹ کر پرے رکھدی۔ بھدرا بڑے غور سے پرکاش کے چہرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُسنے نیچی نظر کئے ہوئے بابو جی سے کہا "اب یہ سو گیا ہے۔ آپ بھی جا کر سو رہیں۔ میں یہاں بیٹھی ہوں۔"

بابو جی کو نیند بہت آ رہی تھی۔ اگر مجبوراً بیٹھنا پڑتا تو دوسری بات تھی۔ لیکن جب بھدرا بیٹھنے کو تیار تھی۔ اور ساتھ ہی پرکاش بھی آرام سے سو گیا تھا۔ تو اُن کے اوپر جانے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اُنھوں نے کہا "اچھا۔ لیکن تمھیں بھی تو نیند آئی ہوگی؟"

"نہیں میں دن کو سو لوں گی۔ آپ جا کر سوئیں۔"

بابو جی اوپر چلے گئے۔ وہ سوچنے لگے۔ کیا بھدرا میری خاطر نیچے بیٹھی ہے۔ یا پرکاش کی تکلیف سے متاثر ہو کر؟ خیر کوئی سبب ہو۔ بہرحال وہ نیچے گرمی میں بیٹھی ہے۔ میری خاطر بھی ہو۔ تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُسکا دل محبت سے خالی نہیں۔"

اُن کا دل اس نئی دریافت پر بڑا خوش ہوا۔ بستر پر لیٹے تھے۔ لیکن خوشی سے آئی ہوئی نیند بھی دور بھاگ گئی۔ چارپائی کے قریب ہی چھت میں ایک روشندان بنا ہوا تھا۔ اس روشندان میں سے نچلا دالان نہایت اچھی طرح سے نظر آتا تھا۔ آپ اُٹھ کر اُس میں سے دیکھنے لگے۔ دیکھا سبھدرا پرکاش کے سرہانے گردن جھکائے بیٹھی ہے۔ اور پرکاش کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اُنھوں نے خیال کیا " شاید بیکار سمجھ کر وقت کاٹ رہی . . . لیکن نہیں۔ اگر بیکار سمجھتی تو کھڑکی میں بیٹھا وقت کاٹتی۔ اس طرح پرکاش کے سرہانے نہ بیٹھتی . . . اچھا اگر بیکار نہیں سمجھتی۔ تو کیا پھر اسکا دل پرکاش کی تکلیف سے متاثر ہوا ہے ؟ کیا ڈائن سبھدرا ماں بن گئی ہے ؟

اطمینان کرنے کے لئے۔ وہاں سے اُٹھکر پھر نیچے دالان میں چلے گئے۔ اور سبھدرا سے پوچھا " کیوں اس طرح بیٹھی ہو۔

اُسنے سر اُونچا نہ کیا۔ بھرّائی ہوئی آواز میں آہستگی سے بولی " کچھ نہیں "

بابوجی نے دیکھا۔ وہ رو رہی ہے۔ مسرت کی ایک لہر برقی رَو کی طرح جسم میں سے گذر گئی خوشی سے آپ اچھی طرح سے بول بھی نہیں سکے۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہنے لگے۔ گھبراؤ نہیں اچھا ہو جائیگا۔ سبھدرا نے دوپٹے سے آنسو پونچھے۔ لیکن وہ رُکے نہیں۔ لگاتار بہتے رہے۔ بابوجی نے دل میں کہا۔ رو لینے دو۔ آنسو رہی سہی کدورت کو بھی دھو دیں گے " اور وہ پھر اوپر چلے گئے۔

سبھدرا ساری رات اُسی طرح بیٹھی رہی۔ پرکاش آرام سے سوتا رہا۔ بالکل ہلا جلا نہیں۔ دوسرے دن سویرے بابوجی ڈاکٹر سے نسخہ لکھوا کر دوا لے آئے۔ سبھدرا کو پلانے کی ترکیب بتا دی۔ اور پھر کھانا کھا کر دفتر چلے گئے۔

دوپہر کو پرکاش کا بخار پھر زیادہ ہو گیا۔ رات کو پہلی رات کی طرح ہی بے چینی بڑھ گئی۔ سبھدرا پھر ساری رات جاگتی رہی۔

بابوجی نے کہا " اس طرح کب تک جاگتی رہو گی۔ دو راتیں جاگتے ہو گئیں۔ کہو تو کوئی دوسرا انتظام کر دیں ؟ اسکی پھوپھی کو بٹالہ سے بلوالیں ؟"

اُسنے جواب دیا " آپ کوئی فکر نہ کریں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ کسی کو بلوانے کی کوئی ضرورت

روز صبح کو حرارت ذرا کم ہوتی تھی۔ لیکن دوپہر کو بخار زیادہ ہو جاتا تھا۔ ہر رات قہر کی رات ہوتی تھی۔ پرکاش بے چینی سے تڑپتا تھا۔ چیختا تھا۔ چلاتا تھا۔ سبھدرا رات دن اُسکے پاس بیٹھی رہتی۔ جب ذرا تھک جاتی۔ اُسی چارپائی پر ذرا کمر سیدھی کر لیتی۔ کھانا ہوٹل سے آجاتا تھا۔

اسی طرح پانچ چھ روز گزر گئے۔ ڈاکٹر نے کہا "بخار میعادی ہے۔ میعاد کے بعد اُترے گا۔" سبھدرا کو سخت صدمہ پہونچا۔ اُسنے پرماتما سے پرارتھنا کی "ہے ناتھ۔ دیا کرو!"

بیس دن اُسی طرح بخار چڑھا رہا۔ اکیسویں رات کو یک لخت حرارت کم ہو گئی۔ جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ پرکاش سُست ہو گیا۔ بابوجی گھبرا گئے۔ سبھدرا کے ہاتھ پانوں پھول گئے۔ گھبراہٹ سے بولی "ہے رام! ہے رام!"

اتنے میں بابوجی کو یاد آگیا کہ ڈاکٹر نے ایک شیشی دے رکھی ہے کہ اگر حرارت یکدم کم ہو جائے تو اسکا ایک چمچہ پلا دینا۔ اور جسم کو باہر کی گرمی سے حرارت پہونچانا۔ انھوں نے فوراً شیشی کھولی اور برانڈی کا ایک چمچہ پرکاش کے حلق سے اُتارا۔ اور انگیٹھی میں آگ جلا کر چارپائی کے نزدیک کر دی۔ جسم کی حرارت بڑھنی شروع ہوئی۔ پرکاش ہوش میں آگیا۔

اور پھر بخار اُترا ہی رہا۔ لیکن اکیس دن کا لگاتار بخار معمولی بات نہیں۔ پرکاش سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق مقوی ادویات کھا کھا کر پرکاش ایک دفعہ پھر اپنی پہلی حالت پر آگیا۔ سبھدرا کی محنت پھل لائی۔

اب سبھدرا پرکاش سے نفرت نہ کرتی تھی۔ اپنی کوکھ کا بیٹا سمجھنے لگی۔ بابوجی اس تبدیلی کو دیکھکر بہت خوش ہوتے تھے۔

پرکاش کی بیماری گھر پر رحمت ثابت ہوئی۔ گھر پُر رونق بن گیا۔ پرکاش! سبھدرا! بابوجی سبھی خوش تھے۔

کبھی کبھی گیان بھی ملنے آجاتا تھا۔

گوپال کرشن یاس

تنقید کتب

سلسلہ معارف ملت، جذبات فطرت، مناظر قدرت

مرتبہ محمد الیاس برنی ایم اے ال ال بی معلم معاشیات حیدرآباد دکن

یہ سلسلہ منتخبات اُردو شاعری کے خوشرنگ پھولون کا ایک چمن زار ہے جسمین ہر قسم کے پھول موجود ہین، پھر لطف یہ کہ ہر پھول کو اُسی کی شاخ مین نمایان کرنے کی کوشش کی گئی ہے - انتخابی حیثیت سے یہ کام بظاہر آسان نظر آتا ہی مگر حقیقتاً مشکل ہی پھولون کا چن لینا زیادہ مشکل نہین مگر اُنھین قرینے سے سجانا، اُنکے لیے موقع و محل کا انتخاب کرنا، اُنکے بہار آفرین نظارون کے لیے ایک باقاعدہ جلوہ گاہ بنانا - ایک تجربہ کار گلچین کے ذوق سلیم پر منحصر ہے - -

جناب الیاس برنی نے ان گلدستون کی ترتیب مین اپنی نظر انتخاب اور ذوق ادب کا پورا پورا ثبوت دیا ہے، اور اس سلسلۂ انتخاب کو ایسے اچھے عنوانون مین تقسیم کیا ہے کہ خود شعرا کے کلام کی تین قسمین ہوگئی ہین - مناظر قدرت - جذبات فطرت، معارف ملت -

تخیلات شاعرانہ کے سلسلۂ لامتناہی کی حدبندی اس سے بہتر نہین ہوسکتی - شاعری ہی پر کچھ منحصر نہین جتنے خیال انسان کے دل مین گزرتے ہین وہ اُنھین عنوانون کے تحت مین آجاتے ہین - حضرت مؤلف نے سلسلۂ انتخاب کی ان تین کڑیون کا الگ الگ سلسلہ قائم کیا ہے - پھر ہر سلسلہ کو مختلف کڑیون پر تقسیم کردیا ہے، اسطرح ہر کڑی بجاے خود ایک مستقل سلسلہ بن گئی ہے یعنی ہر عنوان ایک مستقل کتاب کی صورت مین ظاہر ہوا اور ہر کتاب مختلف عنوانات اور اشعار کا مجموعہ بن گئی -

ابتک اس سلسلۂ انتخاب کی نو جلدین شایع ہوچکی ہین جنمین شعراے ماضی و حال کی بہترین نظمون اور غزلون کا انتخاب موجود ہے، ہر حصے کے شروع مین حضرت مولف کی ایک مشترکہ تمہید ہے، اور

آخر مین منتخب شعرا کے نام مع سکونت و تاریخ پیدائش و وفات درج ہین، جن شعرا کی سکونت، پیدائش یا وفات کی تاریخ معلوم نہ تھی، انکے نام کے سامنے خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے لیکن تعجب ہے کہ دوسرے اور تیسرے حصہ کی اشاعت مین بھی یہ کمی پوری نہ ہوئی، بہرحال اس حصہ کی ترتیب و تصحیح مین پوری توجہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ کا ہر حصہ ایک ہی تمہید سے شروع ہوتا ہے۔ شاید حضرت مصنف کا یہ خیال ہو کہ سلسلہ منتخبات ایک ہے اسلیے ایک مقدمہ یا تمہید کافی ہے، لیکن ہر حصہ کتاب بجاے خود ایک کتاب ہے تو ضرورت تھی کہ تمہیدین بھی جداگانہ لکھی جاتین اور انمین کلام مندرجہ کے متعلق مختصر سی تنقید بھی ہوتی۔ آغاز تمہید مین مولف صاحب کا یہ فقرہ کہ "اردو شاعری پر عجیب افتاد پڑی ہے" بجاے خود عجیب وغریب ہے، اگر یہ مدعا ہے کہ اردو شاعری کی پستی و بیکسی کا اظہار کیا جائے تو "اردو شاعری پر عجیب افتاد پڑی" لکھنا چاہیے تھا اور اگر دنیاوِ شاعری کی طرف اشارہ ہے تو مطلب ادا نہین ہوتا۔

حقیقتاً یہ سلسلہ جلوہ گاہ شاعری ہے۔ جذبات فطرت، معارف ملت، اور مناظر قدرت کے بیشمار جواہر اسکے دامن مین پوشیدہ ہین، ہم حضرت مولف کو اس بےنظیر سلسلہ کی تالیف پر مبارکباد پیش کرتے ہین لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتے ہین کہ آیندہ انتخاب اور ترتیب مین ذرا اور محنت سے کام لیا جائے تو یہ نقائص بھی دور ہوسکتے ہین جو موجودہ سلسلہ مین خال خال نظر آتے ہین، مثلاً معارف ملت حصہ اول مین میر کی وہ غزل جسکا مطلع غالباً یہ ہے

جو اس شور سے میر روتا رہے گا　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

بالکل مقررہ اصول کے خلاف ہے یا غالب کا یہ شعر

یون ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہان　　دیکھنا ان بستیون کو تم کہ ویران ہوگئین

یہ ہم مانتے ہین کہ اس قسم کے اشعار گریہ نے نعت مین لکھے گئے ہین۔ لیکن کیا انکا معارف ملت سے بھی کوئی تعلق ہے۔ معارف ملت کی شرح خود حضرت مولف یون بیان فرماتے ہین "حمد و نعت اور اخلاقی و قومی نظمون کا مجموعہ" غور کیجیے یہ اشعار کہان تک اس معیار پر پورے اترتے ہین اسی طرح جذبات فطرت کے سلسلے مین بعض ایسی نظمین نظر آتی ہین جو معارف ملت سے متعلق ہین مثلاً ترانہ ہند اور گلزار وطن وغیرہ کیونکہ انکا تعلق ملک اور قوم سے ہے، جذبات فطرت انمین ضرور موجود ہین لیکن اسطرح تو حمد و نعت اور قومی نظمین بھی جذبات فطرت سے معرا نہین کہی جاسکتین

حالانکہ انکا تعلق معارف ملت سے ہے" ہماری رائے ہے کہ انتخاب مین اُنھین نظمون کو جگہ دینا چاہیئے جنکا تعلق اصل عنوان سے ہو۔

یہ طریقہ انتخاب بھی زیادہ پسندیدہ نہین کہ غزل کے مختلف اشعار، مختلف عنوان کے سلسلہ مین پیش کردیے جائین۔ کیونکہ پھر انتخاب کی کوئی حد نہ قائم رہ سکے گی۔ اور ہر شاعر کا دیوان اس سلسلہ کا جزو اعظم بن جائیگا، غالب و میر ہی پر کیا منحصر ہے کسی شاعر کا کوئی شعر بھی ان عنوانات کی حدود سے باہر نہ ملے گا، حضرت مولف معاف فرمائینگے کہ ہم (بقول مؤلف) "انکی "جدت گری" اور آزادی کی دل کھول کر داد نہین دیسکتے"۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلۂ انتخاب کو مسلسل نظم یا پوری غزل تک محدود رکھنا چاہیے۔ ورنہ ایک ایک اور دو دو شعر اگر غزل سے انتخاب کریے گئے تو غیر معمولی طوالت کے علاوہ کوئی امتیاز خاص بھی نہ قائم رہ سکے گا۔

حضرت مؤلف کو تو اُن حضرات کا ضرور ممنون ہونا چاہیے جن لوگون نے ترتیب و تالیف مین مدد دی ہے، لیکن اظہار شکریہ کا یہ طریقہ مناسب نہین کہ ہر نظم کے نیچے یہ لکھدیا جائے کہ فلان صاحب نے اسکی تصحیح کی ہے۔ مثلاً جذبات فطرت حصہ سوم کے نیچے صفحہ ۱۰۰ پر محمدی بیگم صاحبہ مرحومہ کی نظم کے نیچے لکھا ہے، "بعد نظر ثانی از سید محمد ہادی مچھلی شہری" اول تو حضرت مولف یا مددگاران مولف کو تحریف یا اصلاح کا حق ہی حاصل نہین پھر اگر کچھ ادبی غلطیان ایسی تھین جنکی تصحیح ضروری تھی تو اعلان تصحیح کی کیا ضرورت تھی۔ کیا جناب مؤلف یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہین کہ سلسلہ انتخاب مین اب ایسی نظمین موجود نہین جو غلطیون سے پاک ہون اور جنہین اصلاح کی ضرورت نہ ہو۔ اگر قابل اصلاح نظمین موجود ہین تو پھر کیا وجہ ہے کہ صرف محمدی بیگم صاحبہ کی نظم نشانۂ اصلاح بنائی جاتی ہے اور ایک دوست کی شان اُستادی کے لیے اعلان بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

اس انتخاب مین جناب داغ کے اشعار بہت کم نظر آتے ہین، صرف معارف ملت حصۂ اول مین اُنکے کلام کا کچھ انتخاب درج ہے، جناب داغ کا مطمح نظر، جذبات فطرت تھا نہ کہ معارف ملت لیکن جذبات فطرت کے سلسلہ مین اُنکا کوئی شعر نظر نہین آتا۔ حالانکہ مولف کی "جدت گری" اور آزادی کی نظر سے اگر داغ مرحوم کے کلام کا انتخاب کیا جائے تو جذبات فطرت کی ایک جلد مرتب ہو سکتی ہے۔

آخر مین ہم جناب مؤلف کی خدمت مین ایک مرتبہ اور اس تالیف لطیف کی مبارکباد پیش کردینا ضروری سمجھتے ہین اور دُعا کرتے ہین کہ آپ اس مفید سلسلہ کو جاری رکھ سکین۔

کاغذ، کتابت وطباعت کے لحاظ سے بھی یہ سلسلہ انتخاب قابل قدر ہے۔ قیمت فی جلد عہ ملنے کا پتہ۔ محمد مقتدی خان شروانی علیگڈھ۔

اعظمی

بلدان (ہندی)

مترجمہ شری یت گنیش شنکر ودیارتھی

کانپور کی خاک پاک سے نشوونما پاکر سیاسی اُفق پر جو ہستیان روشن ستارہ بنکر وقتاً فوقتاً چمکی ہین اُنمین سری یت گنیش شنکر ودیارتھی اڈیٹر پرتاب کا نام بہت منور رہیگا۔ آپنے اخبار پرتاب کے ذریعہ ملک وقوم کے اندر بیداری کی ایک پُرجوش لہر پیدا کردی ہے اور مختلف تصنیف وتالیف کے ذریعہ آپنے ہندی لٹریچر پر احسانات عظیم کیے ہین۔

ہم اسوقت آپ کی تصنیفات پر سرسری نظر ڈال کر یہ دکھانا چاہتے ہین کہ آپنے پرتاب پشتک مالا کی تالیفات وتصنیفات کا ایک نیا سلسلہ قائم کرکے ہندی لٹریچر کا دامن بیش بہا جواہر پارون سے بھر دیا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یعنی فرانس کی مشہور لیڈی جون آف یارک کی لائف نہایت مقبول ہوچکی ہے۔ اسوقت ہم آپ کی تازہ تالیف "بلدان" سے ناظرین کو روشناس کرانا چاہتے ہین یہ کتاب مشہور نامور فرانسیسی مصنف وکٹر ہوگو کے ایک مشہور ناول نائنٹی تھرد کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے شروع مین انقلاب فرانس کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس سے فرانس کی انقلابی حالت پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً انقلاب کی سختیون کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ

> ساٹھ ہزار والنٹیر ملک کی حفاظت کے لیے بھرتی کیے گئے۔ وہ قیدی جو ملک کے لیے ذرا بھی نقصان دہ ثابت ہوئے تلوار کے گھاٹ اُتار دیے گئے اور چار دن کے اندر صرف پیرس مین چودہ سو آدمیون کے سر جسم سے علیحدہ کردیے گئے۔

اسکے بعد جمہور کو پورے حقوق حاصل ہوجانے اور ظالم سے چھٹکارا پاجانے اور جمہوری سلطنت قائم ہوجانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

ایک سال کے اندر ملکی غداری کے نام پر قریب سترہ ہزار مردون اور عورتون کے سر کاٹے گئے۔ دوسرے طریقون سے کسقدر آدمی مرے۔ کتنے جیل خانون مین سڑکر ختم ہوئے اور گولی سے مار دیے گئے۔ اسکا کوئی حساب نہین۔ لاکھون آدمی ملک چھوڑکر بھاگ گئے اور انکی جائدادین ضبط ہوگئین۔ ملک کو چھوڑکر بھاگ جانیوالے ملک مین واپس آنے پر موت کی سزا کے مستحق قرار دیے گئے اور اُنکے جو عزیز اور دوست ملک مین رہ گئے تھے انھین صرف اسی وجہ سے وقتاً فوقتاً طرح طرح کی تکلیفین اُٹھانا پڑین۔

جمہورکی ایثار اور قربانی اور عملی ہمدردی کے متعلق دیباچہ مین لکھا ہے کہ

"غریب لوگ سڑک پر برہنہ پا چلا کرتے مگر کبھی کبھی یہان تک دیکھا جاتا کہ وہ ٹھیلے پر جوتہ فروخت کرنیوالے کا ٹھیلہ روک لیتے۔ اور چندہ کرکے جوتون کے بہت سے جوڑے خرید ڈالتے اور پھر فرانس کی جمہوری سبھا کے پاس اُن جوڑون کو اسلیے بھیجدیتے کہ ملک کے لیے لڑنے والے سپاہیون کو جوتے دیدیے جائین۔"

انقلاب مصائب و عوام کی روش اور انکی ایمانداری اور سچائی اور ملکی جدوجہد کی حمایت و ہمدردی اور جدید گورمنٹ کی قدردانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قومی پنچایت کا حکم تھا کہ ہر ایک آدمی کو دسوین دن آدھ سیر گوشت ملے۔ گوشت کی کمی تھی۔ گوشت والون کی دوکان پر خریدارون کا مجمع رہتا۔ آخر کو یہ حالت ہوگئی کہ لوگ رسی کو پکڑکر ایک لائن مین کھڑے ہو جاتے اور جب سب سے آگے کا آدمی گوشت لے چکتا تو اُسکے پیچھے کا آدمی لینے کے لیے آگے بڑھتا۔ اکثر یہ لائنین بہت لمبی ہوتین اور دوکان سے بہت دور کی گلیون تک نکل جاتین۔ روٹیون کی دوکان پر بھی یہی حالت رہتی تھی۔ اکثر عورتون کو روٹیان حاصل کرنے کے لیے بڑی ہمت کے ساتھ رات بھر دوکان کے سامنے کھڑا رہنا پڑتا۔ چوریان بہت کم ہوتین مفلسی کی وجہ سے لوگون کو بہت تکلیف تھی تو بھی اُنھین بجید ایمانداری تھی۔ ننگے پیرون گھومتے، بھوکے رہتے، لیکن جوہری دوکان کے پاس سے جب نکلتے تو آنکھین نیچی کرکے نکلتے۔"

ا م ل ح

دیباچہ کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ جمہوری فوج کو جنگل مین ایک بیکس عورت اور تین غریب بچے ملے سردار فوج کو اُنپر ترس آیا اور اُنکی پرورش کا بار اپنے ذمہ لے لیا۔

اتفاقاً ایک گانوٗن مین شاہ پرستون اور جمہوریت پسندون کا تصادم ہوا جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے، آخرکار جمہوری فوج کو شکست ہوئی۔ عورت زخمی ہوکر بیہوش ہوگئی۔ لڑکے فتحمند شاہ پرستون کے قیدی بن گئے اور اسطرح مان بیٹے ایک مدت کے لیے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

شاہ پرستون کے جس قلعے مین یہ لڑکے قید تھے اُسپر جمہوریت پسندون نے حملہ کیا، شاہ پرستون کو شکست ہوئی اور قلعے مین آگ لگ گئی۔ شاہ پرستون کا سردار اپنی بقیۃ السیف فوج کے ساتھ بھاگ نکلا اتفاقاً اُسنے اُسی عورت کی گریہ وزاری کی آواز سُنی، جو اپنے بچون کی تلاش مین یہان تک پہونچ گئی تھی۔ سردار قلعہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اسی بیکس کے لڑکے ہین جو اس جلتے ہوے قلعے کے ایک برج مین قید ہین تو وہ ترس کھاکر دوبارہ قلعہ مین واپس آیا اور لڑکون کو رہا کرنے مین خود پنجۂ دشمن مین گرفتار ہوگیا، جمہوری فوج کا سردار شاہ پرست فوج کے سردار کی رحمدلی سے اسقدر متاثر ہوا کہ اُسنے اسکو رہا کردیا اور اسکے بجاے خود قیدی بن گیا چونکہ بادشاہ پرست سردار کو سزاے موت کا حکم دیا جاچکا تھا اسلیے وہی سزا اُس رحمدل افسر کو بھگتنی پڑی

غرض پوری کتاب ایسے ہی سبق آموز اور حیرت انگیز واقعات سے لبریز ہے۔ قصہ کی دلچسپی کے علاوہ قومی ایثار، انسانی قربانی اور حسن صادق کی ایسی جیتی جاگتی تصویرین موجود ہین کہ مطالعے سے ایک کیف روحانی پیدا ہوتا ہے اور بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ کتاب کاغذ وطباعت کے لحاظ سے بھی ممتاز ہے۔ قیمت عہ ۱۲/ر منیجر پرتاب پریس کانپور سے مل سکتی ہے۔

ندیم

اُردو نظم ونثر کا بینظیر مرقع، شاہد ادب کا حقیقی جلوہ گاہ، عروس معنی کا حجلۂ رنگین شائقین ادب کی نگاہ التفات کا آرزومند، ملک کے بہترین انشاپردازون کا پرتو جمال نگاہ یعنی ندیم جو بھوپال سے ماہوار شایع ہوتا ہی ہمارے دوست مولانا سعید رزمی فاضل الٰہیات کا زور قلم اس علمی وادبی رسالے کی دلچسپیون کا ضامن ہی کاغذ عمدہ کتابت وطباعت دیدہ زیب قیمت للعہ سالانہ۔ پتہ۔ دفتر ندیم بھوپال۔

سہاگن بیوہ

نیک تلسی داس گنگا کے کنارے وقت شام
جا رہا تھا اک طرف بشاش "جیتا ہر" کا نام

چرخ کی نیرنگیوں سے گفتگو کرتا ہوا
رنگ عرفان قلب کی تصویر مین بھرتا ہوا

جھاڑیان تھین سبز دریا کے کنارے جا بجا
پھول کمھلائے ہوئے تھے سست تھی موج ہوا

شام کا چہرہ غم پنہان سے کچھ اترا سا تھا
پانی تھم تھم کر جو بہتا تھا تو سنّاٹا سا تھا　(۱)

راہ مین جاتے تھے تھے پتیون پر گرد تھی
لانبی لانبی گھانس ہلتی تھی، پتا دہ زرد تھی

ذرہ ذرہ پر خموشی تھی، بلا کا خوف تھا
مینڈکون کی تھین نہ آوازین، نہ جھینگر کی صدا

سالے سے شاخون سے کیا کیا تن مین آتی تھی نرخ
تیرگی تھی اور سیہ پانی سے گھبراتی تھی روح

جاتے جاتے ایک گوشے کی طرف پہونچی نظر
فرط غم سے ہلگیا شاعر کلیجہ تھام کر

دیکھتا کیا ہے کہ دریا کی .دانی ہے اُداس
جل رہا ہے اک جنازہ، روشنی ہے آس پاس

کانپ کانپ اٹھتی ہے جنگل کی سیاہی بار بار
لاش سے شعلے نکلتے ہین فضا ہے بیقرار

روشنی شعلون کی اک پیشانی نورین پہ ہے
تیرگی آہون کی بیوہ کے رخ غمگین پہ ہے

فرق پر تھرا رہی ہے یاس پر تولے ہوے
غمزدہ بیٹھی ہے زلفین دوش پر کھولے ہوے

اور یہ عالم ہے کہ اب تک آ رہی ہے برملا
جسم سے شادی کے پھولونکی شمیم جان فزا　(۲)

اہتمام مرگ مین یہ شاعری لبریز یاس!
ہاتھ میں مہندی رچی ہے، بر مین چوتھی کا لباس

نوعروس نازنین جسکی جبین گلزار ہے
داس نے دیکھا کہ مرنیکے لیے تیار ہے

کہہ رہی ہے "کیا بتاؤن کیا تمنا" دل مین ہے
شمع یہ کسکے جنازے کی مری محفل مین ہے!"

لاش سے شوہر کی کہتی ہے "اجازت دیجیے
اب تو اس ایندھن کو بھی جلنے کی رخصت دیجیے"

آپ کے سینے سے شعلے اُٹھ رہے ہین بار بار   جل رہی ہے یہ مری اُٹھتی جوانی کی بہار"
آپ کو موت آ گئی مین نذرِ حرمان ہو گئی   گو دھرنے بھی نہ پائی تھی کہ ویران ہو گئی"
یاد ہے سب مجھکو شادی کا ترنم یاد ہے   ہان، انھین ہونٹون پہ آیا تھا تبسم، یاد ہے
خستۂ غم، تشنۂ داغِ تمنا ہو گئی   ہائے گھونگٹ بھی نہ اُلٹا تھا کہ بیوہ ہو گئی"
سحر تھا میری ادا مین تیری عشرت کے لیے   لوچ تھا آواز مین تیری سماعت کے لیے"
پھنک گئی میری تمنا، جل گیا میرا سنگار   میری زینت کا تری بے نور آنکھین ہین مزار
آج قربانگاہ حسرت پر چڑھانے کے لیے   موت آئی ہے مرا گھونگھٹ ہٹا جانے کے لیے"
خاک سے یہ کہکے اُٹھی آنسوؤن کو کر کے صاف   اور کہا کہ اے شرم کی دیوی! مجھے کرنا معاف
کہکے یہ پہلی چتا کی سمت وہ نازک خرام   اور کہا اے آگ کے انبار لے میرا سلام"
دل بستہ بچھین ہے آغوش راحت کے لیے   آتی ہون کچھ دیر مین اب تیری خدمت کیلیے"

دوڑ کر پہونچے چتا کے پاس تلسی داس جی   دیکھتے ہی آپ کو کمسن تو تھی گھبرا گئی
پھر سنبھل کر یہ کہا "بابا دعا دیجیے مجھے   زندگی کے پاپ سے جلدی چھڑا دیجیے مجھے"
"اب دعا دیجیے، دعا دیجیے کہ جینا بار ہے   آگ میرے دل مین روشن ہے، چتا تیار ہے"
سُنکے اسکی بات تلسی داس نے اُس سے کہا   "اے مری نادان بیٹی! سوچ تو کہتی ہے کیا؟"
مرنا جینا ایک ہے جنکو ذرا بھی گیان ہے   "اسقدر روتا ہے کوئی! اسقدر نادان ہے!!"
"زندگی دھندلا سا اک جلوا ہے اور کچھ بھی نہین   موت اک باریک سا پردا ہے اور کچھ بھی نہین"
"ہم فنا سمجھے ہین جنکو وہ فنا ہوتے نہین   (۳) مرنے والے اصل مین ہمسے جُدا ہوتے نہین"
"عشق کے مالے کا اک موتی بکھر سکتا نہین   اتحادِ باطنی مرنے سے مر سکتا نہین"
"جسم پر بنیادِ عشقِ حق بنا ہوتی نہین   روح اس تبدیلِ ہیئت سے فنا ہوتی نہین"
"غور کر دل مین کہ ہو جائے حقیقت بے نقاب   ٹوٹتے دیکھے تو ہونگے سیکڑون تو نے حباب"
"مرکے بھی دریا کے سینے سے کہین جاتے نہین   کھیلتے پھرتے ہین لہرون پر نظر آتے نہین"
"ہان ترا محبوب بھی یونہی ترے آنسو مین ہے   خون کی گردش مین ہے، اور سانس کی خوشبو مین ہے"

کہہ کے، یہ شاعر نے تھوڑی دیر آنکھیں بند کیں، | دیکھتے ہی دیکھتے بیوہ کی آنکھیں کھل گئیں!
اُسنے جس ذرّے کو دیکھا رُوے دلبر ہو گیا | دل سے پردے ہٹ گئے، سینہ منوّر ہو گیا

ہنسکے تلسی سے کہا "بابا وُہی بو باس ہے (۴) دور میں جسکو سمجھتی تھی وہ میرے پاس ہے"
دل میں اطمینان، چہرے پر چمک پیدا ہوئی | بات میں شوخی، نفس میں اِک مہک پیدا ہوئی
زیر لب کہنے لگی "عالم ہے کیا تنویر کا! | دل مرا شیشہ ہے اُسکی چاندسی تصویر کا"
"کہدو مشاطہ سے زینت کا مری سامان کرے | چوڑیاں کشتی میں لائے، مانگ صندل سے بھرے"
"ہاتھ اور پاؤں میں پھر مہندی لگائی جائیگی | پھر نئے سر سے مری شادی رچائی جائے گی"
"پھول برسیں جلد میرا صحن بھرنے کے لیے | شہد کی مکھی بھی آئے رقص کرنے کے لیے"
"ہاں کدھر میری سہیلی ہیں مرے چندن لگائے | کہدو مالن سے کہ تازہ کیتکی کے پھول لائے"
"آگے آگے پرچم فتح و ظفر کھولے ہوئے | تتلیاں ہر قسم کی حاضر ہوں پر کھولے ہوئے"
"کہدو بادل سے کہ میری زلف پر سایا کرے | عیش کی دیوی کدھر ہے بزم میں جلوا کرے"
"ہاں تجلّی سے کسیکی میرا سینہ عرش ہے | میرے من موہن کا جلوا عرش سے تا فرش ہے"

خاک "تلسی" کی نظر سے جوش گلشن ہو گئی
معرفت میں ڈوب کر بیوا سہاگن ہو گئی

جوش ملیح آبادی

حضرت مائل نیوتنوی

ہجر کی تاب نہیں وصل کا مقدور نہیں | قصہ کوتاہ یہ جینا مجھے منظور نہیں
وحشت آبادیٔ دل مانع بربادی ہے | یعنی ویران بھی نہیں ہے جو یہ معمور نہیں
ایک ہم ہیں کہ بہر حال ہیں مجبور ازل | ایک وہ ہیں جو کسی حال میں مجبور نہیں
یا تمھیں کو ہے یہ نفرت کہ نہ لو بھول کے نام | یا یہ کہدو کہ وفا دہر میں مذکور نہیں
ہائے اے حسرت دلدادۂ لطف آزار | درخور حد ستم آب دل رنجور نہیں
ایک وہ ہیں کہ ہیں منت کش صد ناز حیات | آہ اک ہم ہیں کہ جینا ہمیں منظور نہیں

شباب کا سبز باغ

پیری یہ کہہ رہی ہے کسی نامراد کی
کل سبز باغ دیکھ چکے ہم شباب کا

موسم بھی خوشگوار تھا، منظر بھی خوش بہار
دلچسپ تھا بلا کا، غروب آفتاب کا

کچھ کچھ غروب ہونے پہ بھی روشنی رہی
جیسے حسین چہرہ پہ عالم نقاب کا

پھولی ہوئی فلک پہ شفق تھی بصد جمال
پھولا ہوا تھا باغ میں تختہ گلاب کا

ملنا وہ دونوں وقتوں کا راز و نیاز سے
آنا وہ شام اور شبِ ماہتاب کا

شامِ اودھ تھی شام، شبِ مالوہ تھی شب
مضمر تھا جسمیں حسن سے راز انقلاب کا

جھینگے چنگ بجے تھے ترنم ہوا میں تھا
تھا اک طرف تغزلِ سیال آب کا

مضراب زن وہ پانی میں مچھلیاں ہوا کی تھیں
اِک ساز چھڑ رہا تھا سرودِ حباب کا

طبلہ کی تھاپ تھی کہیں سارنگیوں کی گونج
رقصاں تھا ہر شجر چمنِ لاجواب کا

بیلے کے دستِ ناز میں بیلا تھا دلنواز
برگِ درخت ساز لیے تھے رباب کا

سوسن غزل سرا تھی بڑے سوز و ساز سے
سنبل کا راگ، راز تھا اک پیچ و تاب کا

بلبل الاپتی تھی بڑے زور شور سے
دل جس سے پاش پاش ہوا تھا گلاب کا

عیش و طرب کے جمع تھے سامان ہر طرف
اور دور چل رہا تھا شراب و کباب کا

نرگس کی چشم مست میں جوش مئے نشاط
لالہ کے دست شوق میں ساغر شراب کا

گیندے کے ساغروں میں درخشاں شرابِ ناب
گویا تھا چاندنی میں طلوع آفتاب کا

تھا فرد فرد باغ کا محوِ بہارِ عیش
دھڑکا نہ تھا خزاں کا، نہ دورِ انقلاب کا

شاخِ شجر، ہوائے نسیم و فضائے باغ
رگ رگ میں سب کے کیف بھرا تھا شراب کا

غنچوں کی آنکھیں بند تھیں مدہوش پھول تھے
لطف آ رہا تھا سب کو جوانی کے خواب کا

رقص و سرود و باغ و بہار و شراب و کیف | پھر حسن بے پناہ کسی خوش حجاب کا
وہ حسن جلوہ زار تجلی فروش تھا | لذت خرید دل تھا ہر اک شیخ و شاب کا
حسن و شباب، ناز و ستم، غمزہ و حجاب | تھا لاجواب عشوہ گر لاجواب کا
دل مین مرے بھرا تھا محبت کا شوخ رنگ | رنگ اسکے حسن سے تھا ٹپکتا شہاب کا
پھیکا تھا رنگ گل رخ رنگین کے سامنے | فق ہو گیا تھا رنگ رخ ماہتاب کا
ان میگسار آنکھون کا عالم کہون مین کیا | دریا بہا رہی تھین وہ کیف شراب کا
اعجاز تھا کلام، ترنم نواز لب | آفت خرام ناز تھا مست شباب کا
نقش خرام ناز وہ انداز نقش پا | تھا قفل بے کلید قیامت کے باب کا
کیا اسکے حسن کا مین بیان کرسکونگا حال | کیا کرسکون گا ذکر مین اسکے شباب کا
دیکھا کیا مین اسکو جہان تک بھی ہو سکا | اسنے معائنہ نہ کیا اضطراب کا
گردش ہوئی نہ کچھ نگہ التفات کو | ثمرہ ملا نہ کچھ نظر انتخاب کا
صرف نظر مین اسکے، ہوا دل کا جوش صرف | مطلب نہ حل ہوا دل خانہ خراب کا
ارمان تھا کہ دیکھ لے حال تباہ کو | روشن ہو اسپہ حال مرے اضطراب کا
دل سے نگاہ ناز کو کچھ رسم و راہ ہو | موقع ملے زبان کو کلام و خطاب کا
آنکھین ملین، نگاہ ملے، دل سے دل ملے | یہ اشتیاق تھا ہوس ناصواب کا
اک کشمکش تھی دل مین مرے اشتیاق کی | دریا ابل رہا تھا مرے اضطراب کا
اس عیش و انبساط مین گذری تھی نصف شب | سارے جہان پہ دور عمل اب تھا خواب کا
سوتی تھی ساری خلق، زمانہ خموش تھا | عبرت فزا جواب تھا یہ، اضطراب کا
راحت طلب تھا اب وہ مرا مست خواب بھی | اس چشم مست پر بھی تسلط تھا خواب کا
انگڑائی اسنے لی تھی کہ بجلی چمک گئی | یہ رخصتی سلام تھا مست شباب کا
پھر کیا ہوا؟ مین کیا کہون بس قہر ہو گیا | چھپنا وہ رشک مہر کا گرنا حجاب کا
پردہ ادھر گرا تھا کہ غش کھا کے مین گرا | اندیشہ تھا نہ قلب کو اس انقلاب کا
کچھ دیر بعد آنکھ کھلی، دل ہوا بجھا | حسرت زدہ تھا حال جہان خراب کا

اب کیا بیان ہو مری مایوسیون کا حال
اظہار حال کیا ہو مرے پیچ و تاب کا

حسرت نصیب قلب تھا، اندھیر تھا جہان
ختم اب ہوا تھا دورِ شب ماہتاب کا

دورِ بہار و رقص و طرب سب ہوئے تھے ختم
اب دور تھا چمن مین خزان خراب کا

دل بجھ رہا تھا میرا، نمودار تھی سحر
شمعِ سحر تھا حال جوانی کے خواب کا

افسردہ وہ سحر تھی کہ پیری کی صبح تھی
سب جوش سرد تھا دل خانہ خراب کا

تھی صبح، صبح حشر کہ صبحِ شب وصال
جسکی نمود حشر تھا میرے شباب کا

اب سوچ ہے، سکوت ہے، چہرہ اُداس ہے
ہوتا ہے افتتاح تحیّر کے باب کا

ح - م - ع لکھنوی

غزل جناب خورشید لکھنوی مرحوم

غیر مطبوعہ

سمجھ مین کچھ نہ فلک کا یہ انقلاب آیا
ہماری خاک سے کیون نکلے جام آب آیا

اسی سے بزم مین وہ شوخ بے نقاب آیا
گلے کا مسّن مین دھبہ اگر حجاب آیا

کسی کا ناز حسینون سے اُٹھے کیا ممکن
یہی خلاف ہوا کھنچ کے کیون گلاب آیا

اُٹھائی تیغ پئے قتل تمنے ہم ہوسے ختم
تمھین تو شرم نہ آئی ہمین حجاب آیا

تڑپ کے برق نے دکھتے جگر کو چھیڑ دیا
دلِ ملول سنبھل - وقت اضطراب آیا

گیا جو مین تو غبار اُڑ کے اُسنے یون بولا
پھر آج در پہ کوئی خانمان خراب آیا

سمجھ لیے دل پرخون گم شدہ اپنا
ہمارے ہاتھ مین جب ساغر شراب آیا

ہمیشہ آگ پہ پہلو بدل بدل کے رہا
مری طرح تجھے جلنا نہ اے کباب آیا

جھکایا اسلیے سر میرے خون ناحق پر
کوئی یہ جسمین کہے انکو بھی حجاب آیا

مین دیکھ شیشہ ساعت بنا تھا کیا خورشید
گھڑی گھڑی مری خاطر جو انقلاب آیا

لطفِ سخن

جناب ابوالمعانی مرزا یاس صاحب

نگاہ شوق ہوتی یا نگاہ واپسین ہوتی
بہر صورت زبانِ گنگ معنی آفرین ہوتی

جو رو سکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مل جاتے
شریکِ رنج و غم دامن سے پہلے آستین ہوتی

خزان سے پہلے ہی کاش اپنی آنکھین بند ہو جاتین
بہارِ اولین ہوتی نگاہِ واپسین ہوتی

اُمید و بیم روز افزون وبالِ جان و دل ٹھہری
فنا کے بعد بھی تا حشر یکسوئی نہین ہوتی

قیامت خانۂ دل جنتِ صبر و سکون ہوتا
محیطِ چرخ کے باہر اگر یہ سرزمین ہوتی

وہ محرم ازل ہین دھیان مین لاتا نہین کوئی
محبت کیا ہم ایسون سے عداوت تک نہین ہوتی

نہین سُنتا کسی کی پائے نافرمان نہین سُنتا
سفر کیا اُس مسافر کا طلب جس کی نہین ہوتی

ازل سے کشتیِ امید تھی بیگانۂ ساحل
جہان پایاب ہو دریا وہان بھی تہ نشین ہوتی

نگاہِ مضطرب کی حد ہے فانوسِ خیالی تک
قیامت تھی اگر پروانۂ شمعِ یقین ہوتی

غضب ہو منھ چھپانا سجدۂ ناحق کے پردے مین
بلا سے تختۂ مشقِ ستم لوحِ جبین ہوتی

یہ آبِ آتشین ہے اور یہ دریا خونِ ناحق کا
مگر نفسِ شقی کی پیاس مین تسکین نہین ہوتی

فقط دل کی بدولت گرم ہو پہلوے جان ورنہ
جسد مین روح اِک دیوانہ تنہا نہین ہوتی

دمِ آخر فریبِ جلوۂ بیرنگ نے مارا
نگاہ یاس ورنہ کیون گنہگارِ یقین ہوتی

حضرت صفدر مرزاپوری

جوانی جا چکی، سینے مین دل بھی مر چکا میرا
رہا کیا مجھ مین اب کیا دیکھتی ہے منھ قضا میرا

بری صورت کو دیکھو کچھ نہ پوچھو ماجرا میرا
جو کچھ گذری ہے مجھ پر خوب واقف ہے خدا میرا

قفس مین ایک بیمارِ محبت جان دیتا ہے
چمن والون سے یہ پیغام کہدینا صبا میرا

مری ناکامیِ امید بھی ہے رحم کے قابل
مین وہ مایوس ہون اُٹھتا نہین دستِ دعا میرا

نہ سن بیدرد کا تو نے کبھی چھیڑا ذکر اے ناصح / وہ چٹکی دل مین لی ظالم، کلیجا دُکھ گیا میرا

مجھی پر آج پڑتی ہین نگاہین اہلِ محفل کی / تمھاری بزم مین ایسا جما رنگِ وفا میرا

یہ کب کہتا ہون تم صورت دکھاؤ اپنی بے پردہ / ذرا چلمن تک آجاؤ بر آئے مدعا میرا

بتون کی بے نیازی دیکھ کر کہنا ہی پڑتا ہے / سمجھتے ہین مجھے ایسا، نہین جیسے خدا میرا

نشانِ پا سے چلتا ہے پتا گوندون کے چھالون کا / جما ہے دشت مین بھی دور تک نقشِ وفا میرا

مرے دل سے تو ابتک درد کی لذت نہین جاتی / بھلا ہو چارہ گر کا کھو دیا سارا مزا میرا

دمِ آخر جو آئے ہین تو مرنے بھی نہین دیتے / مجھے وہ یاد دلواتے ہین پیمانِ وفا میرا

اسے کہنا خدا سے کچھ نہ کچھ کہنا حسینون سے
مزے کی چیز ہے صفدر دلِ بے مدّعا میرا!

حضرت احسن سنبھلی

دل خاک ہوکے اور بھی پرجوش ہوگیا / اک ایک ذرّہ محشرِ خاموش ہوگیا

اب مین ہون اور میری شبِ غم کی تیرگی / عالم کا ذرّہ ذرّہ سیہ پوش ہوگیا

دُنیا سمجھ رہی ہے کہ تابِ فغان نہین / کیا جانے کیا سمجھ کے مین خاموش ہوگیا

یہ ابر، یہ ہوا، یہ تماشا، یہ کیفِ شوق / لو مین بھی توبہ توڑ کے مینوش ہوگیا

تمکو کچھ اپنی برقِ نظر کی خبر بھی ہے / دیکھو تو کون بزم مین بیہوش ہوگیا

چھیڑا کچھ ایسے سوز سے بلبل نے سازِ عشق / ہر غنچہ باغ مین ہمہ تن گوش ہوگیا

دل سوز ہو سکا نہ چراغِ شبِ فراق / مین نالہ کش ہون اور وہ خاموش ہوگیا

دیکھا گیا نہ مجھ سے تماشائے بیکسی / گھبرا کے مین اجل سے ہم آغوش ہوگیا

احسن نہ پوچھ قصّۂ شبہائے آرزو
اِک خواب تھا سو وہ بھی فراموش ہوگیا

رفتار زمانہ

گذشتہ کرسمس میں صوبہ بہار کا مشہور و معروف شہر گیا قومی جلسوں کا مرکز قرار پایا - اسی قدیم شہر میں جو ہندوؤں اور بودھوں کا ایک متبرک و مقدس تیرتھ ہے نیشنل کانگریس کا سینتیسواں اجلاس منعقد ہوا - اور گو امسال مسلم لیگ کا کوئی جلسہ نہیں ہوا لیکن مسلمانوں کی بڑی جماعتیں جمعیت العلما اور آل انڈیا خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی یہیں ہوئے - کانگریس میں بیس ہزار اہل ملک کا مجمع رہا - دو تین سال سے بالکل ہندوستانی طرز کے فرش پر نشست کا انتظام ہوتا ہے - پنڈال سرتاپا کھدر ہی سے سجا ہوا تھا - ڈیلی گیٹوں کی تعداد چار ہزار تھی اور اُنکے قیام کے لئے سوراج پوری کے نام سے عارضی طور پر ایک نئی بستی آباد کی گئی تھی - صدر کانگریس بنگال کے نامور محب وطن اور ایثار مجسم مسٹر سی - آر - داس تھے - جنکا صدارتی ایڈریس زیادہ تر تحریک نان کوآپریشن کی حمایت پر مبنی تھا - آپ نے وکالت کا پورا حق ادا کر دیا - اور اس تحریک کی ناکامیابی کے واقعہ کو اس خوبی سے نباہا کہ اب اسپر کوئی اضافہ ممکن نہیں ہے - آپ کا یہ فرمانا سچ ہو کہ کسی عظیم الشان تحریک کو نہ کبھی پوری کامیابی نصیب ہوتی ہے اور نہ قطعی ناکامیابی - مگر سوال یہ ہو کہ ملک کے لئے مزید حقوق حاصل کرنے یا گورنمنٹ کو بیکار کرنے میں تحریک عدم اشتراک عمل کامیاب ثابت ہوئی یا ناکامیاب - اسکا جواب صرف ایک ہے اور وہ مسٹر داس کے ایڈریس میں ہمکو نہیں ملتا ہے - انکے تقریر کا بڑا حصہ امن و امان کے معنوی پہلوؤں کے مفصل بیان اور ستم رسیدہ اقوام کے حق بغاوت کے طولانی مباحثہ میں صرف ہوا ہے - آپ نے انگلستان کی قدیم تاریخی نظیروں سے ثابت کیا ہے کہ مظلوم قوموں کو ظلم و تشدد سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جنگ کرنے کا بھی حق حاصل ہے - مسٹر داس نے اس بحث میں بڑی دقت نظری سے کام لیا ہے اور اس حصہ تقریر کو پڑھکر انکے علمی تحقیق و قابلیت کی داد دینا پڑتی ہے لیکن ہم اس طولانی مباحثے کو عملی حیثیت سے غیر ضروری سمجھتے ہیں - اسلئے کہ اب اس قسم کی باتیں انسانی حقوق میں داخل ہیں اور اُنکے متعلق کسی کو قائل کرنے کی حاجت نہیں رہی - اس بارے میں اصل سوال

صرف دو ہیں - اوّل یہ کہ کیا ملک کی حالت اسوقت واقعی ایسی خراب اور ابتر ہے کہ ہمکو آئینی طریق جدوجہد کو چھوڑ کر جان دینے اور جان لینے پر آمادہ ہو جانا چاہئے - کیا ہمارے ملکی نجات کے لئے کُشت وخون کے علاوہ اب اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا ہے - کیا ہم جدال وقتال کے بغیر اپنے ملکی مقاصد حاصل نہیں کرسکتے ہیں؟ دوسرے کیا ملک اسکے لئے پورے طور پر آمادہ وتیار ہے - کیا ہم ان نقصانات اور خدشوں کو انگیز کرنے میں جو غیر معمولی تدابیر اور تشددانہ طریق عمل اختیار کرنے سے ملک کو پہونچیں گے حق بجانب ہوں گے -

مسٹر داس نے ان عملی سوالات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے - وہ جابجا عدم تشدد کا راگ الاپتے رہے - مگر اسکی مشکلات پر جو فطرت انسانی کو دیکھتے ہوئے بہت اہم ہیں کوئی دھیان نہیں دیا حالانکہ سول نافرمانی کمیٹی نے تمام ملک کا دورہ کرکے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قوانین مروجہ کی خلاف ورزی کا ابھی وقت نہیں آیا ہے - مسٹر داس نے سوراج کا ایک دھندلا سا خاکہ بھی پیش کیا ہے مگر ہم اسکو اسلئے نظرانداز کرتے ہیں کہ یہ ایسا خاکہ ہے جسکی نظیر فی الحال ناپید ہے - ہاں جہاں صاحب موصوف نے مختلف اقوام ہند کے باہمی اتحاد واتفاق پر زور دیا ہے - وہاں اُنکا مشورہ نہایت صائب اور مناسب قابل عمل ہے - اور ہندو مسلمانوں کے درمیان اگر اس قسم کا کوئی سمجھوتہ ہو جائے جیسا کہ مسٹر داس نے فرمایا ہے تو ہم سمجھیں گے کہ سوراج کا راستہ صاف ہو گیا ہے - مسٹر داس نے ان انگریزوں کو بھی جنھوں نے ہندوستان اپنا وطن بنا لیا ہے - ہندوستانیوں میں داخل سمجھا ہے - اس سے انگلو انڈین اصحاب کا یہ شک دُور ہو جانا چاہئے کہ ہندوستان کی قومی تحریک نسلی اختلافات پر مبنی ہے -

گو کانگریس نے مسٹر داس کو اپنا صدر منتخب کیا - لیکن رزولیوشن جو امسال گیا میں منظور ہوئے وہ سب کے سب صاحب موصوف کے خلاف رائے پاس ہوئے ہیں - اگر یہ پریسیڈنٹ صاحب کو کانگریس کے بعد ہی صدارت سے مستعفی ہو جانا پڑا - اور اب اُنھوں نے برائے نام کانگریس کے اندر رہتے ہوئے بنجاب خلافت سوراج پارٹی کے نام سے ایک نئی ملکی جماعت قائم کرلی ہے جو اپنے ملکی مقاصد کے لئے موجودہ قانونی کونسلوں میں داخل ہونا ضروری سمجھتی ہے - کانگریس نے کونسلوں کے داخلے کو منظور نہیں کیا بلکہ سول نافرمانی جاری کرنیکا ارادہ ظاہر کیا اور اسکے لئے ملک سے پچیس لاکھ روپیہ اور پچاس ہزار والنٹران فراہم کرنے کی اپیل کی اور آئندہ سرکاری قرضوں کی ذمہ داری سے انکار کا بھی اعلان کیا گیا - ان تجاویز سے ملک کے بیشتر اہل الرائے اصحاب کو اختلاف ہے - اور کانگریس کے اکثر لیڈران

اور آزمودہ کار رہنمایان ملک انھیں زرد پوشتوں کی مخالفت کی وجہ سے مسٹر داس کی پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ جس سے کانگریس کی وقعت کو بہت بڑا صدمہ پہونچا ہے۔ یوں تو کانگریس میں کئی سال سے انتہا پسندی کا زور ہے۔ مگر امسال اس جوش کی حد ہو گئی اور بڑے بڑے قابل رہنماؤں کے رائے کی علانیہ بے وقعتی کی گئی۔ لوگوں نے حسب معمول بلا احساس ذمہ داری بلند ترین آواز کا ساتھ دیا۔ مسٹر راجہ گوپال آچاریہ نے مہاتما گاندھی کے نام پر اپیل کر کے جو چاہا پاس کرا لیا۔ اور کانگریس نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ملکی مسائل کا حل مذہبی پیشواؤں کی رائے پر چھوڑ دیا۔ ہم اِن کارروائیوں کو سراسر خلاف اصول سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ گیا میں سینتیس ۳۷ برس پرانی کانگریس کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

مسٹر داس کی پارٹی میں اسوقت بہترین حامیان کانگریس شامل ہو رہے ہیں مگر نہیں معلوم کہ یہ پارٹی اتفاق رائے سے کوئی عملی پروگرام مرتب بھی کر سکے گی یا نہیں۔ داخلہ کونسل ہی کے متعلق مختلف لیڈران کانگریس کی رائیں مختلف ہیں۔ پنڈت موتی لال صاحب نہرو انتخابات میں حصہ لینے کی طرف ہیں مگر کونسل میں شریک ہونے کے طرفدار نہیں۔ مسٹر داس کونسلوں میں شریک ہونے کے حامی ہیں مگر کونسلوں میں جا کر سرکاری عہدے قبول کرنے کے خلاف ہیں۔ مسٹر جے کار اصلاحات سے پورا فائدہ اٹھانے کے طرف ہیں۔ مسٹر کیلکار اور مہاراشٹر پارٹی گورنمنٹ سے جوابی تعاون کے حامی ہیں۔ اگر یہ سب لیڈران جو مسٹر داس کی پارٹی میں شامل ہوئے ہیں اتفاق رائے سے کوئی عملی دستور العمل بنا سکیں تو ہم اسکو ملک کی بہت بڑی خوش نصیبی سمجھیں گے۔

خلافت کانفرنس انتہا پسندی میں کانگریس سے بھی دو چار قدم آگے رہی۔ اسکی ایک خصوصیت امسال یہ تھی۔ کہ اسکے استقبالیہ کمیٹی کے صدر صوبہ بہار کے مشہور ہندو لیڈر مسٹر دیپ نراین تھے۔ خلافت کے متعلق آپ نے جو تقریر کی اور اسمیں جو مطالبات کئے ہیں وہ مسلمان ہم وطنوں کے دلی خیالات کا بالکل آئینہ ہیں۔ اِس واقعہ سے ہندو مسلم اتحاد میں اس طرف جو غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اسکا ایک اور ثبوت ملتا ہے جس پر ہم ملک کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

گیا میں اور بھی بہت سے جلسے ہوئے۔ آل انڈیا ہندو کانفرنس کے صدر مہاراج پنڈت مدن موہن مالویہ تھے اور آپ نے بجا طور پر ہندوؤں کے اندرونی اتفاق اور یکجہتی پر زور دیا۔ آپ نے

ہندو مسلم اتحاد کے استحکام کے لئے اِس بات کی بڑی ضرورت تبلائی کہ قومی حیثیت سے ہندو اپنے جسمانی اور اخلاقی کمزوریوں کو دور کریں۔ اور اپنے ننگ و ناموس اور جان و مال کی خود حفاظت کرسکنے کی قابلیت پیدا کریں۔

آل انڈیا اسٹوڈنٹ کانفرنس نے عملی طور پر سرکاری اسکولوں کے بائیکاٹ پر زور نہیں دیا۔ بلکہ اسکو ایسا معیار قرار دیا جسے طلبا کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے۔

برل اور ماڈریٹ اصحاب کی کانفرنس امسال ناگپور میں ہوئی اور اسکے صدر رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری تھے جو ابھی حال ہی میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے نوآبادیوں کی سیاحت کرکے واپس آئے ہیں۔ سر مانک جی دادا بھائی کمیٹی استقبالیہ کے صدر تھے۔ آپ نے نان کوآپریشن کو بُرا بھلا کہا۔ اور لبرل پارٹی سے گورنمنٹ کے امداد کی اپیل کی۔ مسٹر شاستری کی تقریر میں کئی ضروری ملکی مسائل پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ آپ نے موجودہ ریفارم کو ناکافی تبلایا ہے اور سکرٹریٹ اور دیگر اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کی حق تلفی کا طولانی ذکر کیا ہے۔ سرکاری اخراجات کم کرنے اور ہندوستانیوں کو فوجی عہدے دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ ملک میں مختلف پارٹیوں کی موجودگی کو آپ نے سیاسی خیالات کی توسیع و ترقی کا ایک لازمی نتیجہ قرار دیا اور فرمایا کہ جزئیات میں اتفاق رائے کی امید رکھنا سیاسی ناتجربکاری کی دلیل ہے۔ تمام ایڈریس میں ہم اس رائے کو سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اہل ملک اس قول کی صداقت کو پورے طور پر محسوس کریں اور محض اختلاف رائے کی بنا پر ایک دوسرے سے بدظن و بدگمان رہنے کی غلطی سے بچیں۔

جدید گورنر صوبہ جات متحدہ۔ اب ہمارے صوبہ کے گورنر سر ولیم میرس بالقابہ ہوئے ہیں۔ آپ کی اعلیٰ قابلیت کا بارہا اعتراف ہو چکا ہے چیمسفورڈ اور مانٹیگو رفارم کی رپورٹ آپ ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ آپ کے حسن تدبیر کی چار دانگ ہند میں شہرت ہے۔ ہمکو امید ہے اور ہماری دعا ہے کہ آپ کا عہد حکومت ہمارے صوبہ اور تمام ملک کے لئے ایک مبارک زمانہ ثابت ہو۔



علمی نوٹ اور خبریں

پچھلے سال اُردو کے کئی اچھے رسالے جاری ہوئے - ہمایوں جسٹس شاہدین صاحب مرحوم کے یادگار ہیں آپ کے صاحبزادے میاں بشیر احمد بی - اے بیرسٹرایٹ لا کے اڈیٹری میں شایع ہو رہا ہے - مولانا تاجور نجیب آبادی جوائنیٹ اڈیٹر ہیں - دونوں صاحبوں کی کوشش سے یہ رسالہ اچھے عنوان سے نکل رہا ہے - اور اب اپنی زندگی کا پہلا سال ختم کرچکا ہے - لکھائی چھپائی اور کاغذ کا انتظام اچھا ہے - مضامین بھی دلچسپ اور سبق آموز رہتے ہیں - اور رسالہ میں عموماً ایک تصویر بھی ہدیۂ ناظرین ہوتی ہے -

لاہور ہی سے جولائی گذشتہ سے ایک دوسرا رسالہ ہزار داستاں کے نام سے حکیم محمد شجاع اللہ بی - اے کے ادارت میں جاری ہوا ہے - ابتک یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ تھا مگر نئے سال سے یہ ماہوار کردیا گیا ہے - ابتک اسمیں زیادہ تر مختصر افسانے شایع ہوتے تھے - اب دیگر رسالوں کی تقابد میں اسمیں مختلف طور پر دلچسپ اور مفید مضامین درج ہوا کریں گے - پچھلے چھ ماہ کے اندر اس پرچے نے دو تین عمدہ تصویریں بھی ہدیۂ ناظرین کی ہیں - لکھائی چھپائی اچھی ہے - اُردو میں مختصر افسانوں کی کمی ہے - اسلئے اگر یہ رسالہ عمدہ افسانوں کے اشاعت ہی کے لئے موقف رہتا تو اسکے ذریعہ اُردو ادب کی ایک بڑی کمی پوری ہوسکتی تھی مگر مہتمان کو غالباً اپنے مقاصد میں دشواریاں نظر آئیں - اِس لئے اُنکو نئے سال سے اسمیں عام مضامین کی بھی گنجایش نکالنا پڑی -

فروری گذشتہ میں آگرہ سے نگار نامی ایک دلچسپ رسالہ حضرت نیاز کی اڈیٹری میں جاری ہوا - اسکے مختلف نمبروں میں بہت سے تاریخی مضامین اور قصے شایع ہوئے ہیں - مگر یہ سب کے سب انگریزی کتابوں سے ماخوذ ہیں - بعض مقامین تو جیسا کہ ہمارے ایک لایق نامہ نگار نے لکھا تھا - بعض نامور مورخین ہند کے مضامین سے نفظ بہ نفظ ترجمہ کرلئے گئے ہیں - مگر رسالہ میں یہ مضامین اس طرح لکھے گئے ہیں کہ گویا اڈیٹر صاحب نگار کے تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہیں "نگار" نے اس اعتراض کے بعد ان مضامین کا ماخوذ ہونا تسلیم کرلیا ہے - ہمکو امید ہے کہ آیندہ کسیکو نگار سے اِس شکایت کا موقع نہ ملیگا -

ایک "نگار" ہی پر کیا فرض ہے اُردو میں اس قسم کی خفیف حرکات ایک معمولی واقعہ ہوگئی ہیں اور عام طور پر اُن سے چشم پوشی کیجاتی ہے - پچھلے سال ہزار داستاں کے ایک پرچے میں عنوان ہی میں ایک ایسا قصہ شایع ہوا جو عرصہ ہوا رسالہ زمانہ میں شایع ہوچکا ہے - ہم نے دونوں رسالوں کا مقابلہ کیا تو ہزار داستاں کا قصہ زمانہ سے بجنسہ نقل کردیا گیا تھا - غالباً نامہ نگار صاحب نے اڈیٹر صاحب ہزار داستاں کی لاعلمی میں وہی مضمون اُنکے

پاس اشاعت کی غرض سے بھیجدیا ہوگا۔ مگر اس قسم کے مضمون نگاروں کا کچھ نہ کچھ تدارک ضروری ہے۔

بعض مضمون نگاروں کا ایک اور وطیرہ بھی بہت ہی قابلِ اعتراض ہے۔ یعنی بعض اصحاب ایک ہی نظم یا غزل کو ایک ساتھ کئی جگہ اشاعت کے لئے بھیجدیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز دو جگہ سے شایع ہوجاتی ہو۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض اصحاب دوسرے مضمون نگاروں کے مضامین کو مسخ یا مختصر کرکے اور عنوان وغیرہ تبدیل کرکے بے تکلف اپنے نام سے شایع کرادیتے ہیں۔ مخزن کے آخری دور میں ایک صاحب نے رسالۂ زمانہ کے ایک شایع شدہ قصہ کو جو حضرت نیاز فتحپوری کا تصنیف شدہ تھا مختصر کرکے اپنے نام سے شایع کرادیا۔ اسکا عنوان بھی بدل دیا گیا تھا۔ مگر ہمنے بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ مضمون نگار نے شروع اور درمیان کی چند سطریں حذف کرکے حضرت نیاز کے افسانے کو ہو بہو نقل کرکے مخزن میں اپنے نام سے چھپوادیا ہے!

اُردو میں بہت سے رسالے جاری ہوئے اور بند ہوگئے اور انمیں سے اکثر ایسے پرچے تھے جن میں زیادہ بڑے بڑے نامور مصنفین کے پرانے اور مطبوعہ مضامین ہی نکلا کرتے تھے۔ اب بھی پنجاب سے ایک ایسا رسالہ نکلا ہے جسمیں شروع سے آخر تک منقول مضامین درج ہیں اور سب بلا حوالہ شایع ہوئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ بعض مصنفین کی مستقل تصانیف دوبارہ شایع کردی گئی ہیں۔

ہمارے مخدوم محترم خواجہ حسن نظامی صاحب اُردو پر جو احسانات عظیم کررہے ہیں اُنکا حال ناظرین زمانہ سے پوشیدہ نہیں ہو۔ لیکن یہ صریح زیادتی ہے کہ آنکی سرپرستی میں دو رسالے خطیب اور نظام المشایخ ایسے شایع ہورہے ہیں جو بظاہر دو مگر بباطن ایک ہیں۔ مہینوں سے ایک ہی پرچہ دو مختلف ناموں سے علٰحدہ علٰحدہ شایع ہورہا ہے!

ہماری رائے میں پبلک کے ساتھ یہ ایک قسم کی بدمعاملگی ہو جسکے انسداد کی ضرورت ہے۔

کچھ عرصہ سے ہندی زبان میں معمولی ترقی ہورہی ہو۔ اُردو کے مقابلے میں اسکا رواج بھی بڑھ رہا ہے اور اسکا ادب بھی غیر معمولی ترقی کررہا ہے۔ ملک میں جابجا ایسے دارالاشاعت قائم ہوگئے ہیں جنکا منشا صرف یہی ہو کہ ہندی زبان کی توسیع اور ترقی ہو۔ ہر سال انکی بدولت صدہا قابل قدر کتابیں شایع ہوتی ہیں۔ سنسکرت۔ انگریزی۔ اردو۔ گجراتی اور بنگالی زبان کی بہترین کتابیں ترجمہ ہوکر ہندی ادب میں داخل ہورہی ہیں۔ شیخ سعدیؒ کی گلستاں۔ مولانا حالی کی نظمیں۔ ڈاکٹر ہوگیو کے بہترین ناول یہ سب ہندی میں موجود ہیں۔ ہمنے قصداً مختلف اصناف ادب کا ذکر کیا ہے تاکہ ناظرین کو ہندی کے ترقی کی وسعت کا اندازہ ہوسکے۔ اس ترقی کا اصلی سبب ہندی داں طبقہ کی عام قدر دانی ہو جو نئی کتابوں کی خریداری میں ہمیشہ اولوالعزمی سے کام لینے کے عادی ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ بہت سی کتابیں ایک ہی دو سال کے اندر کئی کئی بار چھپکر فروخت ہوجاتی ہیں۔ پبلشروں کو بھی اچھا خاصہ نفع ہوتا ہے اور مصنفین اور مترجمین کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہو اور انھیں اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کی پوری ترغیب ہوتی ہے۔ اردو میں ایک کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے میں آٹھ آٹھ دس دس سال لگ جاتے ہیں۔ کاروباری حیثیت سے روپیہ لگانے کا حوصلہ ہو تو کیونکر ہو

مولانا شوکت میرٹھی مرحوم۔ ۲ دسمبر ۱۹۲۲ء یوم جمعہ عصر کے وقت مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی نے انتقال فرمایا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ دنیائے علم وادب کے ایک ممتاز رکن تھے، شاعری کے علاوہ آپ فن تنقید کے بھی ماہر تھے، اور مشرقی علوم میں کافی دستگاہ رکھتے تھے، افسوس موت نے کیسی برگزیدہ ہستی کو ہم سے چھین لیا، خدا مرحوم کو جنت اور متعلقین کو صبر عطا فرمائے،

سر اقبال۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹرایٹ لا لاہور کو اس سال گورنمنٹ نے "سر" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ علامہ اقبال اپنی عالمگیر شہرت کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں، آپ کے علمی و ادبی کارنامے ہندوستان کے علاوہ یورپ و امریکہ میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ شکوہ، ترانہ، شمع و شاعر وغیرہ وغیرہ آپ کی بے مثل نظمیں ہیں مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا، یعنی اُسوقت آپ علامہ اقبال یا ترجمان حقیقت "اقبال" کے نام سے مشہور تھے، اب دیکھنا ہے کہ سر کے خطاب کے بعد آپ کی علمی و ادبی شغف کا کیا رنگ ہوتا ہے، بہرحال ہم علامہ اقبال کی خدمت میں مخلصانہ مبارکباد پیش کرتے ہیں، ہمارے ایک دوست نے خوشی میں ایک شعر کہا ہے

پہلے تھے علامۂ اقبال اب سر ہوگئے　　قومیت پر آگئی غالب حکومت کی ادا

الناظر کا اجرا۔ خوشی کی بات ہے کہ رسالہ الناظر جو حضرت ظفر الملک علوی کی اسیری کے باعث بند تھا، اب پھر خوبی سے اپنی سابقہ آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ گذشتہ بارہ سال میں الناظر نے جو کچھ زبان کی خدمت کی ہے اُس سے دنیائے ادب بخوبی واقف ہے۔

ادبی درسگاہ۔ ارکان انجمن حلقۂ ادبیہ کانپور نے ایک ادبی درسگاہ قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اسکے تین شعبے ہونگے نظم ونثر، تنقید، ہر شعبہ میں باقاعدہ اصلاح کا انتظام ہوگا۔ پہلے یہ ادبی انجمن مقامی حضرات کیلئے مخصوص تھی، اب یہ دعوت ادب عام ہے۔ ادب دوست حضرات بذریعہ خط وکتابت استفادہ کرسکتے ہیں۔ ممبری کے لیے دو روپیہ فیس داخلہ مقرر ہے۔
پتہ۔ احسن شمسی ناظم حلقۂ ادبیہ (دفتر زمانہ کانپور)

عرض حال

دسمبر کے پرچہ میں ہم نے معاونین زمانہ سے توسیع اشاعت میں امداد کی درخواست کی تھی۔ آج پھر ہم اسکی ضرورت پر ناظرین زمانہ کی توجہ مبذول کررہے ہیں۔ زمانہ کو ملک کی ادبی خدمت انجام دیتے ہوئے پورے بیس سال ہوگئے۔ اِس عرصۂ دراز میں اسنے سختیاں جھیلیں۔ کڑیاں اُٹھائیں۔ لیکن سررشتہ استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہم اپنے مشکلات کے مفصل بیان سے اپنے قدرشناسوں کو بے لطف نہیں کرنا چاہتے　تاہم یہ کہنا بے موقعہ نہوگا کہ بہت سے حوصلہ شکن حالات کے باوجود زمانہ ابتک اپنے ادائے فرایض میں برابر ثابت قدم رہا　اور اپنے مہربانوں کو تکلیف دینے میں اسے ہمیشہ بہت پس وپیش رہا مگر اسوقت ایک حالت مجبوری کی آگئی ہے۔ کیونکہ سرکاری اسکولوں کیلئے اسکی دوسو کاپیاں جو پچھلے چھ سات سال سے خریدی جارہی تھیں اس سال مالی مشکلات کی وجہ سے بند کردی گئیں ہیں۔ نتو پرچہ ریڈ کراس سوسایٹی کی طرف سے بھی خریدے جاتے تھے مگر وہ پیشتر ہی سے بند ہوگئے ہیں تین سو خریداروں کی کمی ایسی نہیں ہے کہ اسکا اثر کارکنوں کو محسوس نہو۔ گو اسوقت بھی دنیائے ادب کا یہ پرانا خادم اپنی طرف سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹانا نہیں چاہتا ہے بلکہ وہ اسکے آگے ہی بڑھنے کی کوشش میں ہے۔ مگر یہ اُسیوقت

ہو سکتا ہے کہ جب ہمارے احباب جنکی علمی دلچسپیاں زمانہ کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اپنے دیرینہ ہمنشین کی دستگیری فرمائیں موجودہ مشکلات کے علاوہ ابتدائی خسارہ کا بوجھ بھی ابھی تک کچھ نہ کچھ سر پر باقی ہی ہے۔ جس سے اسکے منظر ہستی پر ایک ہلکی سی تاریکی قبضہ کر لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن بیس سال کے تجربات نے کارکنان کو مشکلات کا مقابلہ کرنے کا عادی بنا دیا ہے۔ اور گو ایک طرف مالی کمزوری کی شکوہ سنجی ہے مگر دوسری طرف ناظرین کی دلچسپی کے لئے اخراجات بڑھا دیئے گئے ہیں جسکا اندازہ اسی نمبر کے ملاحظہ سے ہو جائیگا۔ اگر ہمارے علم دوست احباب نے ہماری حوصلہ افزائی میں دریغ نہ کیا تو ہم یقیناً سال حال میں متعدد رنگین اور سادہ تصاویر ہدیہ ناظرین کرینگے۔ اور بہت سی دیگر ادبی دلچسپیوں کا سامان بھی ہو سکے گا۔ ہمکو امید ہے کہ ہمارے ناظرین ہمکو مایوس نہ فرمائیں گے۔ بہت سے اصحاب کیلئے دو چار نئے خریدار دیدینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ ہاں توجہ شرط ہے۔ ہمکو اس توجہ کی اشد ضرورت ہے اور ہمکو امید ہے کہ ہماری اپیل بیکار نہ جائے گی۔

شکریہ۔ جن اصحاب نے گذشتہ نمبر میں ہماری عرض حال کو غور سے پڑھا انکا ہم تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

حیدرآباد سے ایک دوست جو اعلیحضرت نظام دکن کے متعلقہ دار و مہر ہیں دو خریدار عنایت فرماتے ہیں اور اسکے ساتھ ہی یہ حوصلہ افزا الفاظ تحریر فرماتے ہیں:

> دسمبر نمبر ملا، جسکا شکریہ ادا کرتا ہوں، عرض حال کو پڑھ کے مجھے خیال ہوا کہ اگر مجھ سے بھی کوئی مدد اس مشہور و معروف پرچے کی ہو سکے تو کروں، لہذا میں نے اپنے دو عزیز دوستوں سے خریداری کی تحریک کی اور دونوں نے قبول فرمائی۔ آپ ان دونوں صاحبوں کے نام بذریعہ وی۔ پی پرچہ روانہ فرما دیجئے۔ انشاء اللہ میں آئندہ دیگر احباب سے بھی خریداری کی تحریک کرونگا۔

ہمارے دوست کرم فرما منشی اسکندر لال صاحب۔ سول اینڈ ملٹری کنٹرولر گجرانوالہ سے تحریر فرماتے ہیں، عرض حال پڑھ کے دل پہ سخت چوٹ لگی، جنوری سے میرا نام بھی رجسٹر خریداران میں درج کریں۔

بابو راد ھا رمن صاحب نگم نے بھی ایک خریدار عنایت فرمایا ہے اور آئندہ بھی اپنی مخلصانہ عنایتوں کی امید دلائی ہے۔ بعض دیگر احباب نے بھی توجہ فرمائی ہے۔ مگر ہمکو کثیر التعداد اصحاب کے توجہ کی ضرورت ہے۔ خدا کرے قدر شناسان زمانہ جلد ہی اسکے ضروریات کو محسوس فرمائیں۔

اسی سلسلہ میں ہم زمانہ کے قلمی معاونین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں اور ان قلمی احباب سے "تجدید محبت" کی درخواست کرتے ہیں جو ایک مدت سے "خاموش ہیں" اور جو احباب کہ زمانہ کو سرفراز فرماتے رہتے ہیں وہ پھر اسکو ممنون کرم بنائیں گے۔

جس طرح ہمارے کرم نواب حیدر یار جنگ صاحب طباطبائی نے حال ہی میں ہماری ناچیز کوششوں کی حوصلہ افزائی میں ایک دلچسپ مضمون عنایت فرمایا ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی ایک خط بھیجا ہے جسکا لفظ لفظ محبت و قدردانی میں ڈوبا ہوا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

> "شفیق، شوق ملاقات و عرض نیاز قبول ہو، زمانہ کے دفتر سے ایک کارڈ طلب مضمون میں نیازمند کے نام آیا، مجھے اپنی کوتاہ دستی و کم فرصتی سے نہایت ندامت ہوئی، کچھ وقت نکالکر چند سطریں لکھی ہیں۔ اگر میرا کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے تو زمانہ ہی میں شایع کرنے کے لئے۔ اسکا ساوقار اردو کے کسی رسالہ کو حاصل نہیں، جن لوگوں کی نگاہیں اس رسالہ پر پڑتی ہیں وہ بہت نقاد نگاہیں رکھنے والے ہیں۔"

امید کہ ہمارے دیرینہ احباب جناب شوق۔ جناب چکبست۔ پنڈت زتشی۔ ڈاکٹر سر اقبال۔ شیخ عبدالقادر۔ حضرت محروم۔ حضرت برق۔ جناب محوی۔ منشی پریم چند وغیرہ بھی حسب سابق رسالہ کی امداد فرماتے رہیں گے۔

سب سے افضل اور پہلی چیز جو پہچانی جاتی ہے وہ ہماری ذات ہے۔ ہم اس دُبدھے میں ہیں کہ ہم ہستی ہیں۔ قائم ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری ہستیاں محدود ہیں ہم جیتے اور مرتے ہیں۔ ہمارا خطِ تحتانی چھوٹا ہے۔ ہم محدود ہیں۔ ہمارے چاروں طرف کائنات ہے۔ قدرت ہماری ہستی کو ایک لمحہ میں مٹا سکتی ہے۔ ہمارے حقیر اجسام ایک لمحہ کے اندر ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو تیار رہیں۔ ہم محدود ہیں۔ ہم اس دار الافعال (کرم بھومی) میں کس درجہ لاچار رہیں۔ ہر بار ہماری خواہشات کی پامالی کی جاتی ہے۔ ہم کتنی زیادہ چیزیں کرنی چاہتے ہیں اور کتنی تھوڑی کر سکتے ہیں۔ ہماری خواہشات کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ ہم ہر شئے کی خواہش کر سکتے ہیں۔ ہم ہر شئے چاہتے ہیں۔ لیکن ہماری خواہشات کتنی تھوڑی پوری ہوتی ہیں۔ جسم اسکی اجازت نہیں دیتا۔ قدرت ہماری خواہشات کی تکمیل کے خلاف ہے۔ ہم کمزور ہیں۔ پھول۔ خاک کا ذرہ۔ اور طبعی دُنیا کی حقیقت کیا ہے۔ ہماری ہر ایک خواہش۔ ہمارا ہر ایک خیال۔ ہم سے سَوگنا زیادہ سچّا ہے۔ ہماری ہستی بھی دُبدھے میں ہے۔ یعنی فنا پذیر بھی ہیں اور غیر فانی بھی۔ ہم سمندر کے موجوں کی مانند ہیں۔ جو سمندر ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔ موج کا کوئی جزو ایسا نہیں کہ جسکو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ سمندر ہے۔ سمندر کا اسم جس طرح ہر موج پر چسپاں ہوتا ہے۔ اُسی طرح دوسرے ہر ایک اجزا پر بھی۔ لیکن تو بھی وہ سمندر سے علٰحدہ ہے۔ اسی طرح اس لامحدود بحر ہستی میں ہم گو حباب کے مانند ہیں پھر بھی ہم جب اپنی ذات کو پکڑنا چاہتے ہیں تو نہیں پکڑ سکتے۔ اور لامحدود بنجاتے ہیں۔

ہم خواب میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ خواب۔ خواب میں تو صحیح معلوم ہوتے ہیں لیکن جب ہم اُنمیں سے کسی ایک کو پکڑنا چاہتے ہیں تو غائب ہوجاتا ہے۔ کیوں۔ اِسلئے نہیں کہ وہ جھوٹا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ فہم و ادراک کی طاقت گرفت سے علٰحدہ ہے۔ اِس کائنات میں ہر ایک شئے اس درجہ وسیع ہے کہ جسکے مقابلہ میں عقل کوئی چیز نہیں۔ وہ دائرۂ عقل میں نہیں سما سکتی۔ عقل اُسکو پکڑنے کے لئے جو دام بچھاتی ہے وہ اُسپر خندہ زنی کرتی ہو اس سے ہزار گنا زیادہ روح انسانی کا معاملہ ہے۔ یعنی ہماری ذات کا۔ کائنات کا سب سے بڑا راز یہ ہے۔

یہ جملہ موجودات کس درجہ عجیب ہیں۔ انسانی آنکھوں کی طرف ملاحظہ کیجئے۔ کس طرح آسانی سے وہ برباد کی جا سکتی ہیں۔ لیکن پھر بھی بڑے سے بڑے آفتاب کی ہستی کی تصدیق ہماری آنکھوں سے ہوتی ہے۔ دنیا قائم ہے۔ کیونکہ ہماری آنکھیں اُسکی ہستی کی تصدیق کرتی ہیں۔ اس راز پر ذرا غور کیجئے۔ ان چھوٹی۔ حقیر۔ آنکھوں کو ایک تیز روشنی اور آلپین۔ برباد کر سکتی ہے۔ لیکن تو بھی نہایت طاقتور برباد کُن آلہ (انجن) نہایت زوردار طوفان عجوبۂ روزگار ہستیاں۔ لاکھوں۔ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ زمین کے کرہ جات کا وجود اُنکی ہستی پر موقوف ہے۔ کیونکہ اُنکی تصدیق صرف انھیں دو چھوٹی چیزوں سے ممکن ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ قدرت کا وجود ہے۔ اور ہم قدرت کی ہستی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے دیگر حواسات کا بھی معاملہ ہے۔

ایک دوسرے پر مکمل کائنات کی عجائبات میں یہ کیا ہے۔ کون کمزور۔ کون شہ زور۔ چھوٹا کیا۔ بڑا کیا۔ اونچا کیا اور نیچا کیا۔ اس جمیع کائنات میں ایک چھوٹے ذرہ کی ضرورت کیا۔ کون چھوٹا ہے اور کون بڑا۔ یہ انکشاف کُنہہ ہے۔ کیوں۔ کیونکہ نہ تو کوئی بڑا ہے اور نہ چھوٹا۔ اس بحر ناپیدا کنار میں تمام چیزیں ایک دوسرے سے گُتھی ہوئی ہیں۔ اُنکی حقیقت وہی لامحدود ہے۔ اور اُسکی سطح پر جو کچھ بھی ہے سوائے لامحدود کے اور کچھ نہیں ہے۔ جس طرح درخت لامحدود ہے۔ اُسی طرح ہر ایک شئے جو نظر آتی ہے یا محسوس کی جاتی ہے۔ یعنی۔ خاک کا ہر ذرّہ۔ ہر ایک خیال۔ ہر ایک روح اور وہ ہر شئے جسکا وجود ہے لامحدود ہے۔ یا یوں کہئے کہ لامحدود محدود ہے اور محدود لامحدود ہے۔ اور ہماری یوں ہی ہستی ہے۔

فی الحال ممکن ہے کہ یہ سب درست ہو۔ لیکن لامحدود کی بابتہ یہ تمام معلوات ناواقفیت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم اپنی لامحدودیت کو بھولے ہوئے ہیں۔ جسکو کبھی کوئی بھول نہیں سکتا۔ کون شخص ایسا ہے جو کبھی خیال کر سکتا ہے کہ وہ نیست و نابود کیا جا سکتا ہے۔ کون خیال کر سکتا کہ وہ مر جائیگا۔ کوئی نہیں۔ لامحدودیت کے ساتھ ہمارے تمام و کمال تعلقات ہم میں انجان بنکر اس ڈھنگ سے کام کر رہے ہیں کہ جس سے ہم اپنی اصلی ہستی کو بھول جائیں۔ اور یہی جملہ خرابی کا باعث ہے۔

اس عملی زندگی میں روزمرّہ میں چھوٹی چھوٹی چیزیں تکلیف دہ ہوا کرتی ہیں۔ ہم چھوٹی چھوٹی

ہستیوں کے پابند ہیں۔ اور اس پریشانی کا یہی باعث ہے۔ کہ ہم اپنی ذات کو محدود اور حقیر ہستی سمجھتے ہیں۔ لیکن تو بھی یہ مان لینا کہ ہم محدود ہستیاں ہیں امر مشکل ہے۔ اِن تمام مصائب اور پریشانی کے درمیان ہیں مجھکو ایک چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی دائرہ اعتدال سے گرا سکتی ہے۔ پس میرا یہ فرض ہے کہ میں اپنی ذات کو لامحدود تسلیم کروں۔ سچ تو یوں ہے کہ ہم چاہے جان ہیں۔ چاہے انجان یا اُسی شئے کے متلاشی ہیں جو لامحدود ہے۔ ہم ہمیشہ اُسی چیز کے متلاشی ہیں جو مطلق العنان ہو۔

پردۂ دنیا پر کسی وقت بھی کوئی ایسی انسانی قوم نہیں رہی جسکا کوئی مذہب نہو۔ اور کسی نہ کسی شکل میں خدا یا دیوتاؤں کی پرستار نہ رہی ہو۔ کسی وقت کسی خدا یا دیوتا کا وجود تھا یا نہیں اس سے بحث نہیں۔ لیکن اِسْ اِنسانی روح کا مظہر کیا ہے۔ تمام خلق خدا کسلئے خدا کی متلاشی اور اُسے جاننے کے لئے کوشاں ہے۔ کیوں؟۔ اس لئے کہ برخلاف اِن تمام پابندیوں کے۔ برخلاف قدرت اور اس خوفناک قانون قدرت کے جو ہم کو پیس رہا ہے۔ اور ہمیں کسی جانب متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ جہاں ہم جانا چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں۔ اُس قانون قدرت کے ہاتھوں جو ہر جگہ موجود ہے۔ ہم متغیر کئے جاتے ہیں تو بھی برخلاف ان تمام مشکلات کے انسانی روح اپنی مطلق العنانی نہیں بھولتی اور ہمیشہ اُسکی متلاشی رہتی ہے۔ تمام مذاہب کی تلاش آزادی کی تلاش ہے۔ چاہے وہ اُسے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں چاہے اُسے بُرا بتاتے ہوں یا بھلا۔ لیکن خیال تو ہے۔ حقیر سے حقیر انسان جو جاہل مطلق ہے وہ بھی اُسی شئے کا متلاشی ہے جو قانون قدرت پر حاوی ہو۔ وہ کسی دیو۔ بھوت۔ دیوتا۔ یا کسی ایسے وجود کو دیکھنا چاہتا ہے جو قدرت کو زیر کر سکے۔ جسکے لئے قدرت قادر مطلق نہو۔ جسکے لئے کوئی قانون نہو۔ چاہی کوئی بھی ہو جو قانون شکنی کر سکے یہی وہ آواز ہے جو ہمیشہ قلبِ انسانی سے نکلتی رہتی ہے۔ ہم ہمیشہ کسی ایسے وجود کی تلاش کیا کرتے ہیں جو قانون شکنی کرتا ہے۔ ایک انجن ریل گاڑیوں میں جُتا ہوا تیزی سے دوڑتا ہوا چلا آتا ہے۔ ایک چھوٹا سا کیڑا رینگ کر اُسکی زد سے بچکر نکل آتا ہے۔ معاً ہم کہہ اُٹھتے ہیں کہ انجن بے جان ہے اور کیڑا جاندار۔ کیونکہ کیڑے نے قانون توڑنے کی کوشش کی۔ انجن باوجود اس طاقت و قوت کے قانون شکنی نہیں کر سکتا۔ وہ اسی سلئے بنایا گیا ہے کہ انسان جس طریقہ سے چاہے اُسے چلائے وہ اُسکی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ لیکن کیڑا باوجودیکہ ننھا سا اور چھوٹا سے

اُسنے قانون شکنی کی اور خطرہ سے محفوظ رہا۔ اُسنے قانون کی مخالفت کرنے کی کوشش کرنے کا ثبوت دیا اُسنے اپنی مطلق العنانی اور آزاد ہونے کا ثبوت دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُسمیں خدائی جلوہ موجود تھا۔

ہر جانب اُسی آزادی کا وجود نظر آرہا ہے جو روحانی ہے۔ ہر مذہب میں وہ خدایا دیو کی شکل میں عکس افگن ہے۔ مگر اُن لوگوں کے لئے بالائی ہے جو دیوتاؤں کو بالائی شئے سمجھتے ہیں۔ انسان اس خیال میں ہے کہ وہ ناچیز ہے اُسے خوف ہے کہ وہ کبھی آزاد نہو سکے گا۔ پس وہ قدرت کے علاوہ کسی ایسے وجود کا متلاشی ہوا جو مطلق العنان ہو اور ساتھ ہی اُسے یہ بھی خیال آیا کہ ایسی بہت سی ہستیاں ہیں اور بالآخر بتدریج اُسنے اُن سبھوں کو ایسے خدا میں مستغرق کر دیا جو خداوند خدا اور حاکم الحاکمین ہے۔ اس سے اُسے گو اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ مگر تاہم کسیقدر سچائی کے نزدیک آیا اور قریب آیا۔ اور رفتہ رفتہ اُسے معلوم ہوا کہ جو کچھ بھی تھا اور ہے کسی نہ کسی ذریعہ اُسے خدا سے تعلق رکھتا ہے جو خداوند خدا اور حاکم الحاکمین ہے۔ حالانکہ اُسنے اپنی ذات کو پابند۔ حقیر۔ اور کمزور تصور کیا تھا۔ تو بھی کسی نہ کسی طرح اپنی ذات کو اُسی خداوند خدا سے متعلق پایا۔ اُسکو کسیقدر بینائی حاصل ہوئی معلومات بڑھی۔ اور آخر کار اُس خدا کے قریب قریب پہونچا جسکا تعلق خدا۔ جملہ دیوتا۔ تمام تغیر پذیر کائنات اُراہی مطلق العنان روح کی تلاش سے ہے۔ جو خود اُسکی اپنی روح کا عکس ہے۔ اور آخر کار اُسے معلوم ہو گیا کہ یہ درست ہی نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ خدانے انسانی شکل کو اپنا ہم شکل بنایا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انسان نے خدا کو خود اپنی شکل کا بنایا ہے۔ اِس سے خدائی مطلق العنانی کا دھیان آیا اور یہ خیال پیدا ہوا کہ خدا کی ہستی ہمیشہ اُسکے اندر ہی نہیں بلکہ نزدیک سے بھی نزدیک ہے۔ جس شئے کو ہمیشہ ہم باہر تلاش کیا کرتے تھے وہ ہمارے دلوں کا بھی دل ہے۔ شاید آپ کو اُس شخص کا قصہ معلوم ہوگا جسنے اپنی قلبی حرکت کی آواز کو غلطی سے یہ تصور کیا کہ کوئی شخص باہر سے دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے اُسنے اُٹھ کر دروازہ کھولا لیکن باہر کوئی نہ تھا۔ مایوس واپس آیا اور پھر دوبارہ اُسے دروازہ کی کھٹ کھٹاہٹ معلوم ہوئی لیکن باہر کوئی بھی نہ تھا۔ اور آخر کار وہ سمجھ گیا کہ یہ میرے دل کی حرکت کی آواز ہے جسکو میں غلطی سے دروازہ کی کھٹ کھٹاہٹ سمجھ رہا تھا۔ اسی طرح بعد تلاش

بسیار انسان سمجھ جاتا ہے کہ وہ لامحدود مطلق العنان جسے وہ بالائی قدرت کا جامہ پہنا رہا تھا اندرونی معاملہ ہے۔غیر فانی روح الارواح اور اصلیت خود اُسکی ذات ہے۔

اسی طرح آخرکار وہ پہچاننے لگتا ہے کہ ہستی کی عجیب و غریب روانگی یعنی محدودیت و لا محدودیت کا مضمون ایک ہی ہے۔یعنی لامحدود ہستی اور محدود روح ایک ہی ہے۔اور لامحدودیت اس طرح دام ادراک میں اُلجھی ہوئی ہے کہ صریحاً دو ہستیوں کی صورت میں نظر آرہی ہے۔لیکن اصلیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اسلئے یہی معلومات بھی ہے کہ روح الارواح۔اصلیت۔ہمارے اندر ہی موجود ہے جو تغیر پذیر نہیں بلکہ مدام مطلق العنان اور مکمل شادمانی (ست۔چت۔آنند) ہے اور صرف یہی ٹھوس زمین یا سبب ہمارے کھڑے ہونے کے قابل ہے۔

پس یہی موت کا اختتام۔حیات ابدی کی آمد۔اور جملہ آلام کا خاتمہ ہے۔اور اُسی شخص کے لئے ہے جو کثرت میں وحدت۔تغیر پذیر عالم میں لاتغیر پذیری۔اُسی روح الارواح کو دیکھتا ہے۔اور دوسرے کسی کو حیات ابدی نہیں حاصل ہو سکتی۔

تمام مصائب اور بربادی کی تہ میں روح روشنی کی ایک ایسی رَو بہہ رہی ہے جس سے انسان جاگ اُٹھتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ وہ اُسکی ذاتی حقیقت سے کبھی محروم نہیں کیا جاسکتا نہیں کبھی نہیں۔ہم اُس شئے سے کبھی محروم نہیں رکھے جا سکتے جو واقعی ہماری ہے۔کون اپنی ہستی کو کھو سکتا ہے۔کون اپنے قیام وجود کو کھو سکتا ہے؟۔اگر میں نیک ہوں تو پہلے وجود زاں بعد نیکی کی رنگینی۔اگر میں بُرا ہوں تو وجود پہلے۔زاں بعد برائی کی رنگت۔اول۔آخر ہمیشہ۔وہی ہستی ہے جو کبھی کھو نہیں سکتی بلکہ ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

اسی وجہ سے سب کو امید رکھنی چاہئے کہ کوئی مر نہیں سکتا۔کسی کا زوال ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا۔یہ دنیا صرف ایک بازیگاہ ہے۔کھیل چاہے جتنا خطرناک ہو۔ہمکو چوٹیں لگیں گی۔ہم گرائے جائیں گے مگر ہماری روح کبھی زخمی نہیں ہوتی۔یعنی ہم لامحدود ہیں۔

ایک ویدانتی نے کیا خوب گایا ہے (یہ گیت انگریزی ترجمہ کا ترجمہ ہے ورنہ نظم کردیا جاسکتا تھا)۔نہ مجھکو خوف ہے نہ شک۔موت میرے پاس کبھی آ نہیں سکتی۔میرے ماں باپ کبھی نہ تھے۔

میں کبھی پیدا نہیں ہوا - میرا دشمن کوئی نہیں کیونکہ میں سب سے ملا ہوا ہوں - میں ہستی - معلومات اور مکمل شادمانی (ست - چت - آنند) ہوں - میں وہی ہوں - میں وہی ہوں -

ہمارے تمام امراض کا علاج یہی ہے - یہی وہ آب حیات ہے (امرت) ہے جو موت سے بچاتا ہے - ہم یہاں ایسی دنیا میں ہیں جہاں قدرت ہمیشہ ہماری مخالفت پر کمر بستہ ہے - لیکن مجھے اسکا ورد کرنے دو کہ میں وہی ہوں - میں وہی ہوں -

مجھے نہ خوف ہے - نہ شک - نہ موت - میں نہ مرد ہوں نہ عورت - میرے پاس نہ کوئی عقیدہ ہے نہ رنگت - مجھے کسی عقیدہ کی ضرورت نہیں - کون ایسا فرقہ ہے جسمیں میں شامل ہوں - کون فرقہ مجھے قبول کر سکتا ہے - میں ہر فرقہ میں ہوں -

جسم چاہے جتنی سرکشی کرے - خیال چاہے جسقدر سرکشی کرے - غایت درجہ کی تاریکی میں حد درجہ کی پریشانی میں - عذاب میں - حد درجہ کی مایوسی میں - ایک بار - دو بار - تین بار - یا زیادہ اسکا ورد کرو - روشنی چاہے آہستہ آہستہ آئے - دھیمی دھیمی آئے - لیکن آنی ضرور ہے -

بارہا میں موت کے منہ میں رہا - بھوکا رہا - پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے - تھکا ہوا - قدم نہیں اٹھ سکتے تھے - کسی درخت کے سایہ میں پڑ جاتا - جان نکلتی ہوئی معلوم ہوتی - طاقت گفتار ندارد - حواس باختہ - لیکن جوں ہی اُدھر خیال متوجہ ہوتا کہ نہ مجھکو خوف ہے نہ موت - نہ کبھی بھوکا تھا نہ پیاسا - میں وہی ہوں - میں وہی ہوں -

قدرت کی ساری طاقت مجھے پامال نہیں کر سکتی - وہ میری خادمہ ہے - اپنی طاقت کا خیال کر کہ تو خداوند خدا اور حاکم الحاکمین ہے - اپنی کھوئی ہوئی شان از سر نو حاصل کر - اٹھ - چل - نہ رک - میں اٹھتا - تازہ دم ہو جاتا - اور آج میں جیتا جاگتا آپ لوگوں کے روبرو ہوں - اسی طرح جب کبھی تاریکی کا سامنا ہو اپنی حقیقت کا خیال کر - وہ تمام اشیا جو مخالفت پر کمر بستہ ہیں زائل ہو جائینگی کیونکہ انکی وقعت خواب سے زیادہ نہیں - مشکلات کے پہاڑ چاہے جسقدر اونچے ہوں - تمام اشیا چاہے جسقدر بھیانک اور مایوس کن معلوم ہوں پھر بھی وہ صرف مایا (چھلاوہ) ہے - اس سے خوف نہ کرو - خود بخود غائب ہو جائیگا - اُسے پامال کرو - کافور ہو جائے گا - اُسپر قدم رکھو وہ مر جائیگا - خوف نہ کرو - اسکا خیال نہ کرو کہ تم کتنی بار ناکامیاب رہے - کوئی مضائقہ نہیں - وقت لامحدود ہے - آگے بڑھو -

بار بار اپنی ذات کا خیال کرو۔ تندرستی ضرور حاصل ہوگی۔ تم ہر ایک جاندار سے مدد کی استدعا کرو۔ مگر تمھاری امداد کون کریگا۔ کون کا سبب کیا جس سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ تو اپنی مدد آپ کر۔ اے دوست تیری امداد کوئی نہ کریگا۔ کیونکہ تو ہی اپنا بُرے سے بُرا دشمن اور بھلے سے بھلا دوست ہے۔ اپنی ذات کو سنبھال۔ اُٹھ۔ خوف نہ کر۔ اِن تمام تکالیف اور کمزوریوں کے درمیان سے خود کو نکال باہر کر۔ اولاً چاہے جسقدر کم۔ نامعلوم ہو مگر قوت مردانگی ضرور آئے گی۔ اور تو شیر کی طرح گرج اُٹھیگا کہ میں وہی ہوں۔ میں وہی ہوں۔

میں نہ مرد ہوں نہ عورت۔ نہ دیوتا ہوں نہ دیو۔ میں نہ کسی جانور۔ نہ پودھے۔ نہ درخت کی قسم سے ہوں۔ میں نہ غریب ہوں نہ امیر۔ نہ ہوشیار ہوں نہ جاہل۔ میں چاہے کچھ بھی ہوں۔ مگر ان جملہ اشیا کے مقابلہ میں ہیچ ہوں۔ کیونکہ میں وہی ہوں۔ میں وہی ہوں۔

سورج۔ چاند۔ ستارہ کی طرف نظر کر۔ میں وہی روشنی ہوں جو ان میں جھلک رہی ہے۔ میں آگ کی تمازت ہوں۔ اِس کائنات کا حکمراں میں ہی ہوں۔ کیونکہ میں وہی ہوں میں وہی ہوں۔

جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میں بہتر ہوں وہ غلطی پر ہے۔ کیونکہ وہ اُسی کی ذات ہے جسکا نام ہستی ہے۔ سورج متمکن ہے کیونکہ میں اُسکی ہستی کا اقرار کرتا ہوں۔ دنیا قائم ہے۔ کیونکہ میں اُسکی ہستی کو تسلیم کرتا ہوں۔ بغیر میرے اُسکا قیام دشوار ہے۔ کیونکہ۔ میں ہستی۔ معلومات۔ اور مکمل شادمانی (ست۔ چت۔ آنند) ہوں۔ سورج کی طرف غور کرو یہ ہماری نگاہ سے قائم ہے۔ اگر کسی شخص کی آنکھ میں کوئی نقص ہو تو اُسکا اثر سورج پر نہیں پڑتا۔ اُسی طرح میں بھی ہوں۔ میں تمام حواسات (اندریوں) اور ہر شئے کے ذریعہ کام کرتا ہوں مگر جو کام میرے متعلق ہے اُسکی بُرائی بھلائی سے مجھے غرض نہیں۔ کیونکہ میرے لئے کوئی قانون نہیں۔ کوئی فعل (کرم) نہیں قوانین افعال میرے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ میں ہمیشہ تھا۔ ہمیشہ موجود ہوں (اور ہمیشہ رہونگا)

"دنیاوی املاک۔ بیوی۔ شوہر۔ بچے۔ اور دیگر اشیا میں مجھے سچی خوشی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ میں اُس نیلے آسمان کے مانند ہوں جو لامحدود ہے۔ جس پر رنگ برنگے بادل آتے۔ چلتے پھرتے۔ اور چند منٹ جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اور نیلا آسمان اُسی طرح ہے جس میں تغیر ناممکن ہے۔ خوشی۔ رنج۔ بُرائی۔ بھلائی۔ چند منٹ کے لئے چاہے مجھ پر اپنا اثر

ڈالے - میری ہستی پر پردہ ڈالے - مگر میں پھر بھی وہی ہستی ہوں - وہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں - کیونکہ تغیر پذیر اور فانی ہیں - میں چمکتا رہتا ہوں کیونکہ میں نہ تو تغیر پذیر ہوں اور نہ فانی - اگر مصیبت آتی ہے تو میں جانتا ہوں کہ وہ فانی ہے اور ہٹ جائیگی - اگر برائی آتی ہے تو میں جانتا ہوں کہ وہ محدود ہے اور چلی جائے گی - میں ہی واحد لامحدود ہوں - مجھے کوئی شئے پہونچ نہیں سکتی کیونکہ میں لامحدود - ابدالآباد تک قیام پذیر - اور نا تغیر پذیر ہستی ہوں - ہمارے ایک شاعر نے کیا خوب لکھا ہے -

مجھے اس جام سے پینے دو - یہ جام مجھے اُس ذات تک پہونچائے گا جو فنا پذیر نہیں - اُس شئے تک پہونچائے گا جو تغیر پذیر نہیں - اس بات پر یقین نہ کرو کہ ہم ہیچ ہیں - ہم محدود ہیں - ہم فنا پذیر ہیں - کیونکہ اسمیں سچائی نہیں ہے -

پہلے اسے سُنو - سوچو - اور خیال کرو - ہاتھ کام میں مشغول رہے اور دل اس وظیفہ میں کہ میں وہی ہوں - میں وہی ہوں - اُسی کا خیال کرو - اُسی کا خواب دیکھو - جب تک وہ ہماری ہڈیوں کی ہڈی اور گوشت کا گوشت نہ بن جاوے - جب تک ہمارے پوشیدہ خواب - چھوٹا پن - کمزوری - افسردگی - اور برائی - بالکل معدوم ہو جاوے - اُسوقت بھرتے سچائی پوشیدہ نہ رہے گی - اور نہ پوشیدہ رہ سکے گی - او شانتی - شانتی - شانتی -

پربھودیال مصر - عاشق لکھنوی

کلام مہجور

تم نے منھ پھیر لیا اُسنے بھی منھ پھیر لیا
آئینہ میں کوئی مغرور تماشائی ہے

شرما کے تمنے حشر میں کیوں منھ چھپا لیا
کیا جانے کسکو مانگ رہے تھے خدا سے ہم

یہ کیسا تھا اثر یارب نگاہِ یاس بسمل میں
جو سر قدموں پہ تھا اب ہے وہی آغوشِ قاتل میں

تلوّن کا گلہ کیا ہی قصورِ خود فراموشی
جگہ میری مجھی سے کھو گئی ہے اُنکی محفل میں

مہجور دہلوی

ہندوستان میں روزنامچہ نویسی

ابھی خال ہین بمبئی کے مشہور اخبار ٹائمس آف انڈیا نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ آیا آجکل کے جو انگریز صاحبان ہندوستان مین مقیم ہین وہ روزنامچے لکھتے ہین یا نہین اسپر اسی اخبار مین سر نارائن چندر وارکر صاحب نے خود ہندوستانیون کے متعلق اسی قسم کا سوال اٹھایا ہے آپ نے لکھا ہے کہ بقول سر جان ملکم جو گذشتہ صدی کے آخری حصہ مین احاطہ بمبئی کے گورنر تھے اہل ہند اس باب مین بھی اور باتون کی طرح بالکل رسم و رواج کے غلام ہین۔ معمولی شخص جو کچھ اپنے خاندان یا اعزا یا وقتی تحریکات کے متعلق لکھتے ہین اسپر کوئی زیادہ توجہ نہین کرتا۔ اور جو لوگ علمی قابلیت رکھتے ہین انکا وقت زیادہ تر مقدس مذہبی کتابون کے پڑھنے مین صرف ہوتا ہے اور اگر کبھی کچھ لکھنے کی نوبت آئی تو وہ مذہبی کتابون کی نقل کرتے ہین یا کسی راجہ رئیس کی خوشامدانہ تعریفین لکھتے ہین۔ معلوم ہوتا ہے کہ انکو اپنے وقت کے واقعات اور کارنامون کو تاریخی حیثیت دینے کا خیال بھی نہین آتا۔

بعض روزنامچے پونا مین ضرور برآمد ہوے ہین لیکن انمین مالگذاری کے تحصیل وصول کی تفصیل کے سوا اور کوئی ذکر نہین ہے۔ جن مرہٹہ لکھارون کی مسٹر پراسس اور مسٹر کنکیڈ نے تفتیش کی ہے، اُنسے کچھ اہم حالات ضرور برآمد ہوئے ہین لیکن اصولاً سر جان ملکم کا خیال درست ہے۔ کیونکہ گذشتہ صدی کے نامورانِ ہند مثلاً دادا بھائی نوروجی جسٹس راناڈے سر فیروز شاہ مہتا مسٹر تلنگ، ودیا ساگر، راجندر لال متر، کرسٹو داس پال، سر ٹی مادھو راؤ۔ دیوان بہادر رگھوناتھ راؤ وغیرہ مین سے کسی نے اپنے وقت کا کوئی روزنامچہ اپنی یادگار نہین چھوڑا۔ ان بزرگان ملک کے کوئی روزنامچے نہین تھے اور انکے بعد بھی اس فن کی طرف کسی صاحب نے

توجہ نہین کی۔ سر نارائن چندر ورکر نے اکثر اصحاب کی توجہ اس طرف مبذول کی لیکن روزنامچون کی اہمیت کے اعتراف کے سوا کوئی عملی نتیجہ نہ نکلا۔

درحقیقت ہندوستانی اپنے اپنے گرد و پیش حالات کے روزنامچے نہ لکھکر ملکی مفاد کو اہم نقصان پہونچا رہے ہین چنانچہ ایک مرتبہ ہندو یونین کلب بمبئی مین مسٹر جسٹس تلنگ نے یہ تذکرہ کیا کہ اُن تمام ہندوستانی راجگان و رہنمایان ملک کو جو ۱۸۷۷ء کے دہلی دربار قیصر ہند مین شریک ہوئے تھے بہت سے دلکش اور نتیجہ خیز واقعات معلوم ہین جنکا کسی اخبار یا تاریخ مین کوئی تذکرہ موجود نہین ہے حالانکہ اُنمین سے اکثر سے جو گفتگو مین نے کی ہے اُس سے مین کہہ سکتا ہون کہ یہ حالات اور تذکرے آیندہ مورّخ کے لیے بہت ہی مفید اور دلچسپ ثابت ہونگے لیکن یہ سب مسالہ سینہ ہی مین بند رہکر بالکل ضایع ہو جائے گا کیونکہ روزنامچے لکھنے کی ہندوستانیون کی عادت نہین کہ یہ سب باتیں اور واقعات قلمبند ہو جائیں۔ سر نارائن چندر ورکر نے اس واقعہ کے چند سال بعد خود مسٹر تلنگ سے اس گفتگو کی یاد دلاکر دریافت کیا کہ کیا آپ اپنا روزنامچہ لکھتے ہین۔ مگر اُنھون نے نفی مین جواب دیا۔ مسٹر تلنگ کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد سر نارائن موصوف نے سر فیروزشاہ مہتا سے ذکر کیا کہ مین مسٹر تلنگ کی سوانحعمری لکھنا چاہتا ہون۔ اگر آپکے پاس انکے جو خطوط ہون اُنھین عنایت فرمائیے۔ اسی سلسلہ مین سر نارائن نے انسے یہ بھی پوچھا کہ کیا آپ کوئی روزنامچہ لکھتے ہین یا نہین۔ سر فیروزشاہ نے اسکا جواب عجیب و غریب دیا۔ آپنے فرمایا کہ کیا تمکو اس بارے مین یارک ٹون کا قول معلوم ہے اُسنے ایک سال تک اپنا روزنامچہ لکھا۔ لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہ لکھ سکا کہ مین صبح کو اُٹھا غسل کیا، کھانا کھایا اور سو رہا۔

سر نارائن لکھتے ہین کہ مئی ۱۸۹۷ء مین اسی قسم کی گفتگو مین نے جسٹس راناڈے سے کی۔ آنھون نے یہ جواب دیا کہ مین بھی روزنامچہ نہین لکھتا، مین نے پوچھا کیا آپنے کبھی اسکی کوشش کی ہے؟ اور کیا آپنے کبھی اس بات کا خیال کیا ہے کہ آپ جیسے بیدار مغز رہنما جو ملکی حالات کا مشاہدہ اور ملکی مسائل پر غور کرتے رہتے ہین روزانہ اپنے حالات لکھا کرین تو آیندہ مورخ کے لیے کیسا قیمتی مسالہ چھوڑ جائین۔ اسپر آنھون نے ارشاد فرمایا کہ جب مین

روزنامچہ لکھنے بیٹھتا ہون تو ایک مضمون تیار ہوجاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ مین روزنامچہ نویسی کی قابلیت ہی نہین ہے۔ اسپر مین نے عرض کیا کہ انھین معمولی چیزون سے انگریزون نے تاریخون کے انبار تیار کر لیے ہین۔ جسٹس رانا ڈے نے اس بات کو تسلیم کیا اور کہا کہ ابھی ہملوگون کو یہ بات انگریزون سے سیکھنا باقی ہے

ڈاکٹر راجندر لال متر اپنے وقت کے مشہور و معروف مصنف تھے، انکو قدیم تاریخی حالات کی تحقیق و تفتیش کا بہت شوق تھا اور اس بارے مین وہ ڈاکٹر کرسٹو داس پال کے دست راست تھے۔ یہ اُنھین کی ذات تھی جسکی بدولت "ہندو پیٹریٹ" نامی (اخبار) کو ہندوستانی اخبارون کی صف مین ایک ممتاز جگہ ملی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف انگریزی کے ایک ممتاز انشا پرداز تھے اور اپنے حسن بیان اور مذاق سلیم کے لیے مشہور تھے۔ انکی گفتگو ہمیشہ پُر از معلومات ہوا کرتی ہے۔ ایک موقع پر ہواخوری کے دوران مین اُنھون نے سرنارائن سے بہت سے دلچسپ علمی اور سیاسی واقعات بتائے۔ سلسلہ سخن سے کچھ ایسا مترشح ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنا روزنامچہ پڑھ رہے ہین۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ وہ بھی اپنا روزنامچہ نہین لکھتے۔ سرنارائن نے جب اسپر زور دیا اور انگریزون کی مثال پیش کی تو آپ نے کہا کہ "ہم مین اور انگریزون مین بڑا فرق ہے۔ ایک انگریز کی زندگی خانگی اور خارجی دونون حیثیتون سے ایک مستقل جد وجہد کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہمارے لیے ہماری زندگی ورڈس ورتھ کے قول کے بموجب ایک خواب بیخبری ہے انگریز روزنامچے لکھتے ہین اور ہم تن بہ تقدیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہین۔ بنگال کے نامور پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر سے بھی سرنارائن چندر ورکر نے ۱۸۶۶ء مین ملاقات کی تھی، اور اس ملاقات کا حال آپنے اخبارات مین بھی شایع کرا دیا تھا۔ پنڈت ودیا ساگر صاحب نے اپنے روزنامچہ نہ لکھنے کی ایک دوسری وجہ بتلائی، وہ ہندوستان کے آیندہ عظمت و عروج کی بابت بہت ہی مایوس تھے اور کہتے تھے کہ ایسے مورخین کے لیے جنکو تاریخ مین ایک بھی زرین ورق نہ مل سکے، کوئی روزنامچہ چھوڑنا فضول ہے۔

روزنامچون کی اہمیت کے متعلق سرنارائن چندر ورکر صاحب نے اپنے ذاتی تجربہ پر ایک سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے کہ "چند سال ہوئے آپ کو پونا کے ایک دیوانی مقدمہ کی اپیل

جسٹس مہتی کے ساتھ سننے کا اتفاق ہوا۔ جہاں آپ کو ایک مفصل روزنامچہ دیکھنے کو ملا جسکو ایک
چار دہ سالہ برہمن لڑکے نے لکھا تھا۔ مقدمہ کی بنیاد ایک خانگی نزاع سے شروع ہوئی تھی جو
ایک وصیت کی بابت تھا۔ زبانی گواہیاں ایک دوسرے کے خلاف تھیں اور جج صاحبان صاف طور
سے اسپر کوئی رائے قائم نہ کر سکتے تھے۔ اس اثنا میں ایک نوعمر لڑکا شہادت کے لیے پیش ہوا
یہ گواہی دیتے وقت بار بار اپنی جیب کی طرف دیکھتا تھا اسپر عدالت نے اُس سے دریافت
کیا کہ تم بات کا جواب دینے سے پہلے اپنی جیب کی طرف کیوں دیکھتے ہو، اسکا جواب ملا کہ میں
اپنے روزنامچہ کی طرف دیکھتا ہوں، اسپر عدالت نے اسکا روزنامچہ طلب کیا اور دیکھا تو اسمیں
تمام جھگڑے جو گھر میں ہوئے تھے نہایت ہی وضاحت و تفصیل کے ساتھ انگریزی اور مرہٹی زبان
میں لکھے ہوئے تھے۔ اس روزنامچہ کی بدولت مقدمہ کی اصلی کیفیت عدالت پر آئینہ ہوگئی
گو اس سے اس لڑکے کو نقصان پہونچا کیونکہ وہ خود وصیّت کی رو سے جائداد کا دعویدار تھا۔
سوال یہ تھا کہ لڑکے کے سوتیلے باپ پر لڑکے کے اصلی باپ کی طرف سے وصیت نامہ لکھتے وقت
کوئی ناجائز دباؤ تو نہیں ڈالا گیا تھا۔ لڑکا عدالت ابتدائی میں ہار گیا لیکن جج نے اس کے
روزنامچہ کی بڑی تعریف کی۔ جب ہائی کورٹ میں اپیل آئی تو سر نارائن کے سامنے پیش ہوئی
اور صاحب موصوف نے روزنامچہ کو خود بغور معائنہ فرمایا۔ انکا بیان ہے کہ یہ روزنامچہ بجائے
خود ایک دلچسپ افسانہ تھا جسمیں ایک ہندو گھر کی روزمرہ زندگی اور تمام خانگی حالات کا
مفصل ذکر تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑکے نے انگریزی کے نامور شاعر براوننگ سے یہ سبق
حاصل کیا تھا کہ ہمکو نہ صرف اپنی معمولی زندگی ہی سے سبق لینا چاہیے بلکہ ایک خاص گھر کے
روزانہ معاملات اور تجربات سے بھی سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اس بنا پر لڑکے کو کامیاب
ہونا چاہیے تھا لیکن اسکے روزنامچہ نے خود اسکے مقدمہ کا فیصلہ کر دیا تھا۔ سر نارائن چندرواکر
کا خیال ہے کہ اس لڑکے کو ہندوستان کا مشہور روزنامچہ نویس ہونا چاہیے۔ گو اس صفت
کی بدولت اسکو سخت مالی خسارہ ہوا۔

سر نارائن چندرواکر کے مضمون سے یہ تو بخوبی ثابت ہے کہ وہ روزنامچہ نویسی کی اہمیت
کے پورے طور پر قائل ہیں لیکن یہ سوال دریافت طلب رہجاتا ہے کہ وہ خود بھی اپنا

وزنامچہ لکھتے ہین یا نہین ۔ موصوف اسوقت ہندوستانی لیڈران کی صف اول مین شمار
تے ہین ۔ انکا روزنامچہ بہت ہی سبق آموز ہوگا ۔ لیکن روزنامچہ لکھنے کی عادت بشرطیکہ
سکو صحیح طریقہ پر ترقی دی جائے ۔ ملک کے تاریخ اور ادب دونون کے لیے ایک قابل قدر
رمایہ بہم پہونچا سکتی ہے ۔ جو بات آج بالکل غیر معمولی اور غیر دلچسپ ہے وہ سو یا دو سو
ں بعد غیر معمولی اہمیت اختیار کریگی ۔ کاش ہمارے ہموطن ادھر متوجہ ہوں ۔

عالی لکھنوی

مقالات حکمت

انسان دوسرونکی خدمت کے لئے ہے، نہ اس لئے کہ دوسرے اُسکی خدمت کریں ۔
اسوقت دنیا کو جس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے، یہ ہے کہ غیر محسوس طریقہ ترقی فنا ہوچکا، اب ایک محسوس طریقہ کی ضرورت ہے ۔
اکثر اوقات انسان خیال کرتا ہے کہ ابتدائی ایمان اب تک مجھ میں موجود ہے، حالانکہ اُسکا ایک ذرّہ بھی باقی نہیں ہوتا ۔
ایمان، زندگی کی طاقت ہے ۔
ایمان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ زندگی کی اُس حقیقت کو بتائے، جسکو موت کی حقیقت نہیں زائل کرسکتی ۔
اگر انسان کمال حاصل کرنے کی کوشش کرے، تو اُسے کبھی رکاوٹیں نہیں پیش آسکتیں ۔
میرا خیال ہے کہ حیات بعد الموت میں بھی انسان حصول کمال کی کوشش کرتا رہیگا ۔
شخصی، حصول کمال کی کوشش میں زندگی کی تمام حقیقت اور خوشی پنہاں ہے ۔
روحانی زندگی کے لوازم ہمکو عطا کئے گئے ہیں ۔ اُسکے بعد ہمکو اختیار دیا گیا ہے کہ اُنکو جیسے چاہیں، استعمال کریں ۔
اِس سے زیادہ مفرت رساں اور کوئی تعلیم نہیں ہوسکتی کہ "انسان اپنی کوشش سے درجۂ کمال تک نہیں پہونچ سکتا ۔
اگر کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ میں اپنے فرض کو انجام نہیں دے سکتا تو وہ فی الواقع اُس سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا ۔
حقیقت، کوشش کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے نہیں معلوم ہوسکتی ۔
سب سے ارفع، اعلیٰ، اور صحیح بات، جسکو انسان دیکھ سکتا ہے اور جسپر غور کرسکتا ہے، وہی اُسکے لئے حقیقت ہے ۔
حیات انسانی کی فطرت ایسی ہے کہ کوئی شخص، پوری حقیقت، پر یکبارگی نہیں، مطلع ہوسکتا، بلکہ رفتہ رفتہ اس حد تک پہونچ سکتا ہے ۔
ہم چاہیں یا نہ چاہیں، حقیقت، وجد اور ثبوت کی بندشوں سے آزاد رہکر ہمارے دل میں جگہ نہیں پا سکتی ۔
فلسفہ اور سائنس کے سمجھنے کے لئے پڑھنے اور تیاری کی ضرورت ہے ۔ لیکن مذہب کے سمجھنے کے لئے اِنہیں سے
کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔

عالی لکھنوی

ٹالسٹائی

ڈیانہ کا مندر

حضرت مسیح سے چھ سو برس قبل جبکہ خطۂ یونان بت پرستی کے عمیق ترین سمندروں میں غوطے کھا رہا تھا۔ انکی بارہ مشہور دیبیوں میں ایک ڈیانہ بھی تھی جسکی پرستش اہل روما کیا کرتے تھے۔

ڈیانہ کے معنی چاند کے ہیں جو یونانی لغت سے تعلق رکھتا ہے۔ اکثر مورخ نے اسے تین نام والی دیبی بھی کہا ہے۔

در اصل (یونانیوں کے مذہبی نقطۂ نظر سے) اسکے تین نام ہیں (ا) لونا جو آسمان پر مروج ہے۔ (ب) ڈیانہ جو روے زمین کے لئے مخصوص ہے (ج) ہکیٹ دوزخ (مراد زیر زمین) میں بولا جاتا ہے۔

رومیوں نے اسکا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ ایک حسینہ جوانی کی امنگوں میں مست ایک ہاتھ میں تیر دوسرے میں کمان لئے ہوئے مشغول شکار ہے۔ کاندھے پر ترکش ہے۔ اور مدد کی غرض سے چند شکاری کتے بھی ہمراہ ہیں۔ جبین ناز پر ہلال نما ستارہ روشن ہے جسکی روشنی اسکے دلفریب حسن میں چار چاند لگا رہی ہے۔ پنڈلیاں کسیقدر کھلی ہوئی ہیں اور پاؤں میں شکاری جوتہ ہے۔

اس نقشہ کی تصدیق اس بت سے ہوتی ہے جو روم الکبریٰ کے عجائب خانہ میں لایا گیا ہے جس پر بخط یونانی "مقدس ڈیانہ دیبی کا بت" کندہ ہے۔ یہ بت خالص سنگ مرمر کا ہے اور اسکی شکل و شمایل بھی اسی نقشہ سے ملتی جلتی ہے۔ کاندھے پر ترکش کا داغ بھی ہے۔ مگر دونوں ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں۔ یہ گمان غالب ہے کہ ایک ہاتھ میں تیر اور دوسرے میں کمان ضرور ہوگی۔

رومیوں نے ڈیانہ کی خیالی تصویر مختلف صورتوں میں کھینچی ہے۔ مثلاً

اکثر نے ڈیانہ کو ایک نوخیز حمیلہ سے مشابہت دی ہے جسکے سینہ پر بارہ برجوں کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ یعنی اسکو بارہ موسموں پر پورا قبضہ ہے۔

دیگر قدیم مصوروں نے اپنا زورِ قلم اس طرح دکھایا کہ ایک کمسن عورت کے بارہ پستان ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نوجوان دیبی (ڈیانہ) کو کرۂ ارض سے مادرانہ شفقت ہے۔ واللہ اعلم۔

شہر سمرنا سے ۸۰ میل جنوب (جو گردش فلک کے ہاتھوں ہزاروں بار بن بن کر بگڑا اور بگڑ بگڑ کر بنا ہے) شہر ایمفیس واقع تھا۔ جسے ایک زندہ دل شاعر کی زبان سے "چشم ایشیا" کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ وہی شہر تھا جسے کبھی ایشیا کوچک کے باشندے اپنا دل و جان سمجھتے تھے۔ جہاں بار برداری کے جہازات دنیا کے ہر حصوں سے آیا کرتے تھے۔ گویا یہ ایشیا کی تجارت کی منڈی تھی۔ مگر آج ویران و سنسان پڑا ہے۔ جہاں عالیشان عمارتیں تھیں وہاں مٹی کے ڈھیر ہیں۔ اور جہاں بنی آدم کی بستی تھی وہاں درندے اور خوفناک جانور رہا کرتے ہیں۔ سچ ہے۔

بیک حصہ بیک ساعت بیک دم　　دگرگوں میشود احوال عالم

مورخین اس نقطہ پر مختلف الرائے ہیں کہ اس ایشیا کی جان اور تہذیب کی کان کا بانی کون تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ایمفیس وہیں کا باشندہ اس شہر کا بانی تھا۔ مگر دوسری روایتوں سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ امیزن نے ہرقل کے خوف سے بھاگ کر ڈیانہ کو اپنا پشت پناہ بنایا اور اس شہر کی بنیاد رکھی۔ اِن دو روایتوں میں اوّل الذکر قرین قیاس ہے۔

ایک معتبر مورخ جو اسی زمانہ میں گذرا ہے رقم طراز ہے کہ پہلے بحر روم کے جزائر کے باشندے وہاں آکر آباد ہوئے اور ڈیانہ دیبی کا آبنوسی بت تیار کر کے پرستش کرنے لگے۔

شاہ ٹولیس نے جو عیسیٰ علیہ السّلام سے چار سو برس قبل گذرا ہے ایک عالیشان عمارت اس بت کے واسطے تعمیر کرائی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ یہ عمارت جلکر خاکستر ہو گئی۔

یونانیوں نے پھر کمرِ ہمت باندھکر ایک عمارت بنوائی جسکے سامنے پہلی عمارت ہیچ تھی اور اس طرح یونانیوں کی یاد کا زخم جو ناسور ہو چلا تھا بھر آیا۔ ۳۵۰ برس قبل (مسیح کے) اس عمارت میں آگ لگی۔ اور آگ اُسوقت تک نہ بجھی جب تک کہ ساری عمارت جلکر خاک کی ڈھیر نہ ہو گئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جبکہ دنیا کا بیمثل حکیم سقراط اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پی کر اس عالم فانی سے رخصت ہوا۔

تیسری بار پھر اُس شجر میں ثمر لگے جسمیں ثمر لگنا تو درکنار سرسبز ہونے کی بھی امید مٹ چکی تھی۔

یعنی یہ عمارت پھر بنی۔ خدا کی قدرت اس دفعہ بھی اس مقدس مندر کو آگ ہی کے ہاتھوں تخت و تاراج ہونا تھا۔ یہ واقعہ اُس شب کا ہے جس رات کو مقدونیہ میں سکندر کی پیدایش پر خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ اس بات پر ہر مورخ متفق الرائے ہے کہ اس دفعہ آگ حکیم طراطیس نے لگائی تھی جو عوام الناس میں "پاگل سقراط" کے نام سے مشہور تھا۔

حکیم طراطیس نے یہ منصوبہ گانٹھ کر مندر میں آگ لگائی تھی کہ گو لوگ مجھے اس جرم پر سخت سے سخت سزا کا مستحق سمجھیں گے اور میرا نام تواریخ عالم میں جلی قلم سے لکھا جائیگا اور ہوا بھی یہی۔ ورنہ آج طراطیس کو کون جانتا ہے ؎ بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا۔ ۳۵ برس تک مندر یونہی منہدم اور ویران پڑا رہا۔ اس دفعہ معتقدین کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ سکندر اعظم نے اس شرط پر مندر بنوانے کا وعدہ کیا کہ اُسکا نام دروازہ پر کندہ ہو۔ جو نامنظور ہوا اور مندر کا وہ حصہ جو آگ کے دست برد سے محفوظ رہ گیا تھا فروخت کر دیا گیا۔

اب یونانیوں نے اس حادثہ کی خبر تمام ایشیا میں مشتہر کر کے چندہ کی درخواست کی۔ کہتے ہیں کہ مرد تو مرد عورتوں نے اس امر سے اسقدر دلچسپی لی کہ اپنے اپنے زیورات اُتار کر حوالے کر دیئے۔ غرض پھر ایک کثیر رقم سے عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

یہ عمارت شہر اور بندرگاہ کے درمیان ایک پہاڑ کے دامن میں بنائی گئی تھی، پاس ہی ایک دلدل تھی جسکے نزدیک ایک عالیشان عمارت کا بنانا پُرخطر تھا۔ اسلئے اُس زمانہ کے مشہور صنّاع کرسی خورم کی رائے سے عمارت کی بنیاد اس طرح رکھی گئی جیسا کہ مورخ پلائینی لکھتا ہے۔

اسکی بنیاد میں اوّل ایک تہ کوئلوں کی جما کر کوٹ دی گئی اور اسپر اُون کی ایک تہ رکھ کر سنگہائے بنیاد رکھے گئے۔ پرکیسی ٹیلس نے قربان گاہ بنا کر اپنی سنگ تراشی کا اعلیٰ ثبوت پیش کیا۔ اسی طرح کوتپس نے ایک ستون پر پچیکاری کر کے خراج تحسین وصول کیا۔ مگر افسوس کہ عمارت کو پھر تباہ و برباد ہونا تھا۔ چنانچہ قوم گاتھ نے اسکے قیمتی اشیا لوٹ کر عمارت کو آگ کی بھٹی کا ایندھن بنا دیا۔

۱۷۶۳ء میں سیاح لارڈ پادری پوکوگ نامی ڈیانہ دیبی کا مندر دیکھنے کی غرض سے ایشیا کوچک آیا۔ وہ لکھتا ہے "ڈیانہ دیبی کا مندر جو دنیا میں شہرۂ آفاق ہے۔ پہاڑ اور جھیل کے درمیان

واقع تھا۔ نہایت غور کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مندر کے گرد وسیع احاطے چھوڑے گئے تھے جس میں غلام گردش بنائی گئی تھی۔ مندر کا دروازہ مشرق رویہ تھا۔ شرقی حصہ میں ۱۵ فیٹ لمبے ۱۴ ستون کے ٹکڑے ہیں جنمیں ایک خاکی سنگ مرمر کا ہے۔ جابجا سنگ مرمر کے ٹکڑے پائے جاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مندر خالص سنگ مرمر سے تعمیر کرایا گیا تھا۔

اِسی طرح انیسویں[19] صدی عیسوی کا انگریزی سیاح مسٹر آسٹیفن لکھتا ہے کہ وہ جگہ جہاں ڈبانہ دیبی کا مندر واقع تھا۔ وہاں اب خاک اُڑ رہی ہے۔ اُلو بول رہے ہیں۔ پھاڑ خونخوار درندوں کا آشیانہ بنا ہوا ہے (وغیرہ وغیرہ)۔ میں نے ہرچند تلاش کی کہ وہ جگہیں کہاں ہیں جہاں یونانیوں نے تھیٹر بنوائے تھے۔ دنگل گھر تعمیر ہوا تھا۔ حوض بنے تھے۔ مگر کسیکا کچھ نشان نہیں ملا۔

سے

تخت والوں کا پتہ دیتے ہیں تختے گور کے کھوج ملتا ہے یہیں تک بعد ازاں کچھ بھی نہیں

غرض دنیا کی وہ عالیشان عمارت جسکو "ہفت عجائبات" عالم میں جگہ دیتے ہیں۔ زمانہ کی گردش سے یوں ملیامیٹ ہو گئی کہ نشان تک باقی نہیں۔ آہ۔ اے چرخ کج رفتار کوئی تجھ سے بقا کی کیا امید کر سکتا ہے۔ جبکہ تو نے اُس مستحکم چیز کو جسکی استواری پر ایک عالم کو بھروسہ تھا یوں نیست و نابود کر دیا

نصیر بھاگلپوری

جذبات احسن

غنیمت تھا سرِ شوریدہ بھی وحشت کے ساماں میں
خیال آیا تو رخنے کر دیئے دیوارِ زنداں میں

عجب وحشت برستی ہے مرے پہلوئے ویراں میں
کبھی رہتا تھا شاید کوئی وحشی اِس بیاباں میں

قفس میں آکے ایسی خود فراموشی ہوئی طاری
بس اتنا یاد ہے اپنا نشیمن تھا گلستاں میں

دعائیں دیں اجل کو جاگنے والے شبِ غم کے
کہ اب سوئے ہیں کس آرام سے گورِ غریباں میں

نہ پوچھو مجھ سے رودادِ اسیری مختصر یہ ہے
اجل آئی تھی پیغامِ رہائی لے کے زنداں میں

کیا منھ بند اُسنے اس طرح فریادِ محشر کا
مری یاد اُنکو کیوں لے آئی تھی گورِ غریباں میں

کہیں اشکوں سے اے احسن نہ پردہ فاش کر دینا
چھپی بیٹھی ہے اک صورت حجابِ رازِ پنہاں میں

احسن سہمی

باغ جہان آرا

مین

پھولوں کی نمایش

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ۔۔۔ خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

حضرت اجمیر کے کئی عرس ناغہ ہوئے۔ مگر امسال خواجہ بزرگ کے جذب پاک نے فقیر کو کھینچا ۲۲ر فروری ۱۹۲۲ء کو دھلی سے ڈاک گاڑی میں سوار ہو کر ۲۳ر فروری کو ۹ بجے دن کے دارالخیر اجمیر میں پہونچ گیا اور حسب معمول متولی صاحب کی قدیم حویلی پر حاضر ہوا فقیر برسوں سے اسی حویلی میں فروکش ہوتا ہے۔ صاحب خانہ سید ظہور الحسن عرف عیدو میاں ہمہ تن اخلاق مجھ ناچیز کو اپنے خاص مسکن میں ٹھہراتے اور دن رات خاطر تواضع فرماتے ہیں۔ حویلی میں گھستے ہی دل نے وحشت کی لی میں نے کہا خدا خیر کرے۔ بالاخانہ پر پہونچکر اُنکے فرزند ارجمند سید نور الحسن صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ اُنکا چہرہ اُداس دیکھ کر دل بے تاب ہو گیا۔ میں نے گذارش کی حضرت کیا حال ہے فرمایا والد ماجد نے پرسوں دار فنا کو چھوڑ کر عالم بقا کی طرف رحلت کی۔ ؎

چہ می پرسی ز من حال دل غم دیدہ ام چوں شد ۔۔۔ دلم شد خون و خون شد آب و آب از دیدہ بیروں شد

اس بات کو سُنکر سخت رنج و ملال ہوا۔ کیونکہ اجمیر شریف میں میرا اُن سے زیادہ کوئی شفیق و قدردان نہ تھا۔ مین نے رخت سفر کھول ڈالا۔ نہا دھو کر خواجہ بزرگ کی خانقاہ میں حاضر ہوا فاتحہ پڑھی۔ اور دل میں جو کئی برس کی کدورتیں بھری ہوئی تھیں وہ آن کی آن میں رفع ہو گئیں۔ ایسے تو اجمیر میں سیکڑوں ہی ملنے والے ہیں مگر بابو عبدالکریم خاں صاحب اکبرآبادی میرے ایک مخلص دوست ہیں چونکہ فقیر برسوں اجمیر میں رہا ہے اسلئے علاج معالجہ کی ضرورت سے بابو جی لڑکپن سے میرے پاس آتے جاتے رہے ہیں۔ اُنکا بیاہ بھی میرے سامنے ہوا۔ اب خدا رکھے بچوں والے ہیں مگر میں اُنہیں اب بھی بچہ ہی سمجھتا ہوں۔ بڑے بردبار حلیم الطبع۔ مگر ان میں ہنسنے کی ایک خاص ادا ہے پہلے ہنسیں

پیچھے بات۔ اور پھر اس مزہ کی ہنسی کہ اپنے ساتھ مجھ پتھر کو بھی ہنسا دینا۔ مجھے انکا ہنسنا بہت پسند ہے۔ بابو صاحب کو جب ہنسی آجاتی ہے تو معاذ اللہ دریا چڑھکر اُتر جائے۔ ابر برس کر تھم جائے۔ مگر انکی ہنسی نہیں تھمتی اور کسی طرح نہیں تھمتی۔ میں مُردہ دل ہنسنا بھول گیا ہوں۔ مگر جب اجمیر آتا ہوں تو انکو ہنستا دیکھکر خیال کرتا ہوں کہ گویا میں ہنس رہا ہوں۔ اجمیر پہونچکر انکو اپنے آنے کی اطلاع کرنی ضرور تھی۔ بابوجی نے پہلا مکان چھوڑ دیا ہے اور دوسری جگہ اُٹھ گئے ہیں۔ اسلئے حضرت کا گھر مشکل سے ملا۔ خود بدولت کہیں گئے ہوئے تھے۔ مولوی عبدالعلیم صاحب انکے چھوٹے بھائی ملے وہ مجھے مکان میں لے گئے۔ جو بابو صاحب بھی تشریف لے آئے۔ گلے ملے اور ملاقات سے دل شاد ہو گئے۔ بابوجی ایک بزرگ کامل کے دیکھنے والے ہیں اسلئے انہیں جوہر عشق اثر کر گیا ہے۔ ایک نازنین کی خلخال اور گھنگرو کی آواز انکے لئے اَلستُ بربکم کی صدا ہے۔ اور ایک دلربا کا بھولا اور گورہ چہرہ انکی نظر میں قرآن ناطق ہے۔ دوسری بات جو اُنھوں نے مجھ سے کی وہ یہ تھی کہ پرسوں ۲۵ فروری شنبہ کے دن دولت باغ میں پھولوں کی نمائش ہے سر شام چلئے اور سیر کیجئے۔ اجمیر شریف کے دلی دروازہ سے باہر شمال کی طرف کوئی چار فرلانگ کے فاصلہ پر ایک باغ دلکشا شاہجہاں بادشاہ ہندوستان کی دختر فرخندہ اختر جہاں آرا بیگم صاحبہ نے ۱۰۴۳ھ مطابق ۱۶۳۳ عیسوی میں بنایا ہے۔ باغ کی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آنا ساگر کے کنارہ پر کئی ہزار فٹ لمبی ایک مستحکم فصیل بنا کر اُتنا ہی لمبا ایک چبوترہ تیار کیا ہے۔ اور اس چبوترہ کے اوپر موقع بموقع سنگ مرمر کی بارہ دریاں اور ایوان مرتب کئے ہیں جنکے دیکھنے سے آدمی کو جنت الفردوس کے قصر و ایوان یاد آجاتے ہیں۔ اِن طلسماتی مکانات کے نیچے آنا ساگر کا پانی موجیں مارتا ہے اور انکا سفید عکس جب پانی میں پڑتا ہے تو یہی گمان ہوتا ہے کہ حورانِ بہشتی حوضِ کوثر کے آئینہ میں اپنا جمال دیکھ رہی ہیں۔ اِن عمارتوں کے سامنے باغ ہے۔ خیاباں چمن کیاریاں روشیں پٹریاں حوض آبشار جلوہ دیتے ہیں کہیں مور ناچتے ہیں کسی تختہ میں سرو و شمشاد پر فاختہ او رقمریاں نعرۂ جاں سوز کھینچتی ہیں۔ کہیں پپیہا کہیں بی کوئل اپنے تانوں اور شیوں سے عاشقوں کے کلیجے گھلاتی ہیں۔ وجعلنا فیھا جنات من نخیل واعناب وفجرنا من العیون لیاکلوا من ثمرہ۔ میں نے کہا بابوجی باغ جہان آرا ہمارے آپ کے لئے کوئی نئی جگہ نہیں ہے اُسکی بارہا سیر کی ہے۔ نمائش نہ دیکھی نہ دیکھی۔ بابو صاحب نے فرمایا نہیں جناب یہ موقع قابلِ دید ہے آپکو چلنا پڑیگا اور ضرور چلنا پڑیگا۔ میں نے کہا خواجہ کا عُرس کیا پھولوں کی نمائش سے کم ہے تم تو آنکھیں

رکھتے ہو۔ خواجہ کی خانقاہ میں وہ وہ لالہ وگل دکھائی دیتے ہیں جنکے آگے باغ جہاں آرا کی بہار۔ خزاں سے بھی کمتر ہے۔ مگر بابو صاحب کا زور شباب مجھے کھینچکر باغِ جہان آرا میں لے گیا۔ بادشاہی زمانہ میں تو سبحان اللہ اس باغ کا کچھ اور ہی عالم ہو گا۔ مگر جب سے انگریزی سلیقہ نے اسے آراستہ و پیراستہ کیا ہے تو اسمیں کچھ اور ہی رونق پیدا ہو گئی ہے۔ اور خاصکر ۲۵ فروری کو اسکا نظارہ طرفہ تر تھا۔ جب ہم دونوں نمائش کے بہارستان میں پہونچے تو میں نے دیکھا مثلث مربع مثمن مدور مستطیل عریض مختلف شکلوں میں چمن بنائے ہیں۔ ایک چمن سے دوسرے چمن تک صاف روشیں ہیں۔ کیاریوں میں رنگا رنگ پھولوں کے درخت اُگ رہے ہیں اور ہر درخت پھولوں سے لد رہا ہے۔ روشوں کے حاشیہ پر زینہ بزینہ پایہ بپایہ گملے سجائے ہیں اور اُنھیں ایسا موزوں کرکے رکھا ہے کہ سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اِن گملوں سے پیچھے ایک خوش نما سائبان سفید کپڑے کا رنگین ایستادہ پر چھایا ہوا تھا۔ اور اس سائبان کے پیچھے اُن نازک تن نازنین بدن پھولوں کے درخت تھے جو فرطِ نزاکت سے دھوپ کی سہار نہیں رکھتے۔ دس دس بیس بیس گملوں کے پھول جو ملتے جلتے تھے اُنپر ایک ٹکٹ لگا ہوا تھا۔ اور ٹکٹ پر انگریزی زبان میں اُنکا نام اور جس سرزمین سے وہ لائے گئے تھے وہاں کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ مجھے تو ان مختلف رنگ کے پھولوں کا مجمع دیکھکر یہ گمان ہوا کہ باغ جہان آرا میں ہفت اقلیم کے محبوب اور معشوق سیر کو چلے آئے ہیں جسمیں سے کہیں بی لیلیٰ اپنے قبیلہ کی گلرو سنبل مو سہیلیوں کو ساتھ لئے کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ کہیں بی عذرا اپنی بستی کی رنگین ادا بہنوں کے جھلڑ میں اپنے جوبن کی بہار دکھا رہی ہیں۔ کہیں رادھکا جی اپنی ات سندر چیریوں کے جھومر میں براج رہی ہیں اور اپنے کرشن مُراری کے انتظار میں ناگ پہاڑ کی طرف بار بار دیکھتی ہیں کہ مہاراج اب پشکر جی سے اشنان کرکے یہاں تشریف لائینگے اور اپنی بنسی سُنا کر اس نمائش کی رونق کو دوبالا فرمائیں گے۔ پھولوں کے اس مرقع کو دیکھکر مجھ پر ایک حیرت طاری ہو گئی۔ میرے مجروح اور زخمی دل میں سوزش ہونے لگی۔ یہ اچھا تھا کہ بابو عبد الکریم خاں صاحب کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا ورنہ میرا کھڑا رہنا دشوار تھا۔ اس عالم نباتات میں بھی ناز و نیاز اپنے اپنے کام میں مشغول تھے ایک پھول کے کان سے ایک کلی اپنا ننھا سا مُنھ لگائے کچھ ہنسی کی بات کہہ رہی تھی۔ اور پھول سُنکر کھلکھلا رہا تھا۔ ایک کلی دوسری کلی کے مُنھ کو چوم رہی تھی۔ کسی ٹہنی پر کسی پھول نے اپنا سر رکھدیا تھا۔ بعض درختوں کی شاخیں اتنی نازک تھیں کہ وہ اپنے پھولوں کا بوجھ بھی نہیں سہار سکتی تھیں مارے نزاکت کے اُنکی کمر دوہری ہو رہی تھی

اِسلئے اداشناس باغبان نے ایک باریک کھپچی اُسکی مدد کے لئے کمان بناکر لگادی تھی اس معاملہ کو دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اور وہ رات کا سماں اور تنہائی کا موقع اور کسی کا کہنا یاد آگیا۔ اچھّے خدا کو مان کر مجھے سنبھالنا میرے ہاتھ پانوں قابو میں نہیں ہے۔ میرا دل دھڑکتا ہے میری کمر میں درد ہونے لگا۔ نوج ایسی بھی کیا بے پروائی سُنی ان سُنی کئے دیتے ہیں۔ خدا غارت کرے اس موئے سہاگ کے عطر کو۔ ناشدنی نے میرا دماغ اُڑا دیا۔ سَرا رے درد کے پھٹا جاتا ہے (یہ کہکر خاصدان کو جو ٹھوکر ماری تو گلوریاں چاندنی پر جاگریں اور اُنپر جو چاندی کے ورق لگے ہوئے تھے اُنکی چمک نے شمع کی روشنی میں کچھ اور ہی جلوہ دکھایا)۔ وَدَا گلشن ٹھہر جا صبح ہولے دیکھنا کیسی تیری بوٹیاں نوچتی ہوں جھتیسی رسّی جل گئی مگر رسّی کے بَل نہ جلے۔ میں اس شاخ گل کو غور سے دیکھ رہا تھا جو اُسکے تاجدار پھول نے کہا اے فراق دہلوی ذرا ہوش کی دوا کرو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔ کیسی نمایش اور کیسا باغ جہان آرا۔ اے نادان یہ سارے خواجہ کے رنگ ہیں۔ خواجہ پتی پتی میں سمایا ہے۔ خواجہ ٹہنی ٹہنی میں موجود ہے۔ خواجہ ہی غنچہ ہے۔ خواجہ ہی گل ہے۔ خواجہ ہی رنگ ہے۔ خواجہ ہی بُو ہے

یک ببین ویک بدان ویک بخواں — خواجہ را در خواجۂ خود محو داں
وہ جدا بینی زخواجہ خواجہ را — گم کنی ہم متن وہم دیباچہ را

کوچۂ چیلان - بارہ دری خواجہ میر درؔد

ناصر نذیر فراق دہلوی

مغربی جواہر ریزے

ہم سب کے لئے بڑی خوشی کی بات ہوتی۔ اگر ہم بہتری کی اتنی ہی زیادہ قدر کرتے جتنی بدتری کی مذمّت کرتے ہیں۔ "سوتھی"

نرمی بہترین طرزِ عمل ہے۔ دنیا میں عمدہ عادات سے بہتر کوئی چیز نام پیدا کرنے یا اُسکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نہیں ہے۔ "لارڈ ولٹن"

خاموش دوستیاں اکثر دفعہ سب سے زیادہ مفید ہوتی ہیں۔ اسلئے میں محتاط دوست کو جوشیلے دوست پر ترجیح دیتا ہوں۔ "ایڈیسن"

خوشی آنکھوں میں نور۔ چہرہ پر سرخی۔ رفتار میں تیزی اور تمام اندرونی اعضاء رئیسہ میں طاقت لاتی ہے۔ جن پر کہ زندگی کا دارومدار ہے۔ "ڈاکٹر سینڈرس"

دوست زر کی مانند کھرے اور کھوٹے ہوتے ہیں۔ ضرورت سے پیشتر اُن کی شناخت ضروری ہے۔ تاکہ ضرورت کے وقت ناقص ثابت نہوں۔ "پلوٹارک"

قربانی

(ایک انگریزی افسانہ کا ترجمہ)

نیلگوں آسمان پر بادل کے بکھرے ہوئے ٹکڑے اس طرح پھر رہے ہیں گویا چھوٹی چھوٹی کشتیاں بندرگاہ بہشت میں لنگرانداز ہیں۔ پہاڑی پر عجب سہانا سماں ہے۔ سپیدہ کے پیڑ تنے کھڑے ہیں۔ اُنکے بیچ بیچ بھینی بھینی خوشبو والے گل و بوٹے اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ رنگ برنگ کی تتلیاں اُنکے حسن و خوشبو کا لطف اُٹھا رہی ہیں۔ سبزے سے لدے ہوئے وادیوں میں مسکین بھیڑوں کا گلہ گھاس چر رہا ہے۔

اُسی پہاڑی کی چوٹی پر ایک بھُورے رنگ کا مکان عشق پیچاں سے گھرا ہوا کھڑا ہے۔ مکان سے ہوتی ہوئی ایک پگ ڈنڈی دور سیبوں کے ایک جھنڈ میں جاکر ختم ہو جاتی ہے۔ پگ ڈنڈی پر سیبوں کے قریب ایک مرد اور ایک لڑکی سیر میں مشغول ہیں۔

لڑکی خوبصورت ہے۔ اُسکے گالوں کی رنگت ہوا سے ہلتے ہوئے سیب کے پھولوں کے مانند سرخ و سپید ہے۔ عنفوانِ شباب کی بہار اُسکے سبز فراک میں سے جھلک رہی ہے۔ سر پر کوئی ٹوپی یا دوپٹہ وغیرہ نہیں ہے۔ بے چین ناگنوں کی طرح زلفیں ہوا کے تھپیڑے کھا کھا کر اِدھر اُدھر لہرا رہی ہیں۔

ایک مرد جوان رعنا ہے۔ جسم کا ہٹّا کٹّا صحت عمدہ۔ اچھا خاصہ پہلوان معلوم ہوتا ہے۔ پہاڑی پھولوں کی خوشبو چاروں طرف سے آ آکر دل کو شگفتہ کر رہی ہے۔ اور شہد کی مکھیوں کی سُریلی بھنبھناہٹ مسرت بخش رہی ہے۔

پہاڑی والے بھورے مکان کے اندر ایک پلنگ پر ایک کمزور و ناتوان مریض لیٹا ہوا ہے۔ جنگ یورپ نے اسے بُری طرح پامال کیا ہے۔ مشکل سے جان بچاکر اپنے گھر واپس آیا ہے۔ جب اُسکی شادی ہوئی تھی تو اسکا عالم شباب تھا اور وہ ایک سرخ و سپید نوجوان تھا۔ اسکے حسن مردانہ

کی دُور دُور شہرت تھی اور گرد و نواح کی لڑکیاں اسپر ہزار جان سے شیدا تھیں۔ بہرحال اسکی بیوی نے نہایت خوشی سے بیاہ کیا تھا لیکن اب اسکو حسن و عشق کے جذبات سے حظ اُٹھانے کے بجائے غریب زار و نحیف خاوند کی ہمیشہ کے لئے تیمارداری میں مشغول ہونا پڑا۔

لڑکی بار بار بھوُرے مکان کی طرف دیکھتی ہے۔ اُسکے ہونٹوں سے ترشروئی ٹپک رہی ہے۔ آنکھیں دلی بے چینی کا نقشہ کھینچ رہی ہیں۔ اسوقت جو آدمی اُسکے ساتھ ہے وہ محبت کا پتلا اور بہار رمی کا مجسمہ ہے۔ اور قدرتاً یہ اُسے اپنی طرف کھینچنے کی زبردست کوشش کر رہا ہے۔

"اصل میں تو اُسے تمہاری ضرورت ہی نہیں" مرد ذرا جوش میں کہتا ہے۔ "اُسے ایک تجربہ کار نرس (تیماردار) درکار ہے۔ نہ کہ بیوی۔"

اِس پر نوجوان حسینہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر کہتی ہے۔

"زندگی اچھی طرح کٹے یا بُری طرح۔ اس سے کیا۔ میں نے تو اُس سے ہمیشہ کے لئے شادی کی تھی۔ بیاہ کوئی ہنسی مذاق نہیں کہ جب چاہا ساتھ رہے اور پھر علٰحدہ ہو گئے۔"

نوجوان لڑکی نے آدمی کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ پہاڑ کی وادی پر قدرتی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں اُنپر نوجوان لڑکیاں اور عورتیں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چڑھ رہی ہیں۔ موسم بہار نے اُنکے دلوں کو اُمنگوں سے بھر دیا ہے اور سب نوشگفتہ غنچوں کی طرح کھلی جاتی ہیں۔ پھولوں سے لدے ہوئے پیڑوں پر چھوٹے چھوٹے پرندے سُریلے سُروں سے گا رہے ہیں۔ کبھی اِس پھول کو سونگھتے ہیں اور کبھی اُس پھول کو۔ کبھی ایک درخت سے اُڑکر دوسرے درخت پر جا بیٹھتے ہیں۔ کبھی آسماں میں اُڑتے اور کبھی زمیں پر چہل قدمی کرتے ہیں۔ گویا تمام زمین اور آسمان اِنھیں کی مِلک ہے۔ چاروں طرف خوشی اور زندہ دلی کی حکومت ہے۔

لڑکی کو سارا جہان خوشی سے معمور نظر آتا ہے لیکن آہ! خود اُسکے لئے کوئی مسرّت باقی نہیں ہے۔ آخر لڑکی کچھ سوچ کر بول اُٹھی کہ مشکل بہت مشکل۔ بلکہ درحقیقت دُکھ کی زندگی بسر کرنا محال ہے۔

آدمی جوش سے "ہاں۔ یہی تو میں بھی کہتا ہوں" "تم جیسی لڑکی کے لئے تمام عمر کے واسطے ایک دائم المریض شوہر کے ساتھ زندگی بسر کرنا عقل کے خلاف ہے۔ بیشک یہ ایک زیادتی ہے۔

اور اُسکو ہونا چاہیئے ۔ تم اسکے ساتھ نہیں رہ سکتیں ۔ تم کہتی ہو شادی ہنسی مذاق نہیں ہے، یہ ٹھیک ہے ۔ لیکن شادی حبس دوام بھی نہ ہونا چاہیئے ۔ آج کل کے زمانے میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے ۔ ہمیں ایک ہی مرتبہ زندگی ملی ہے کچھ بار بار اس دنیا میں آنا نصیب نہ ہوگا ۔ اتنا کہکر اُسنے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا "پیاری ۔ آؤ ۔ ایک جان دو قالب ہو جائیں"

مگر لڑکی نے یکایک اپنا ہاتھ چھڑا لیا ۔

"افسوس پیارے رابرٹ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے ۔ جب اُسنے شادی کی تھی اُسے کیا خبر تھی کہ ایسا ستم ٹوٹ پڑیگا اور زندگی جو اسوقت ایسی خوش آیند معلوم ہوتی تھی اُسکا ایسا اندوہناک انجام ہوگا ۔ آہ اسوقت ہم نے کیا کیا باتیں سوچیں تھیں ۔ کیسے کیسے منصوبے باندھے تھے مگر اب یہ سب ارمان خاک میں مل گئے ۔ سب اُمیدیں یوں ہی ختم ہو گئیں ۔ اے خدا کیا ..... لڑکی بولتی بولتی خاموش ہو گئی ۔

مرد یکایک آگے کی طرف جھک کر لڑکی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا اور پھر بولا کہ "وہ سب ارادے اب بھی پورے ہو سکتے ہیں" ۔ جو باتیں کہ تمنے رابرٹ کے ساتھ سوچی تھیں اُنھیں ہم پورا کریں ۔ بیچارہ رابرٹ ! اُسکے زندگی کے دن ختم ہو رہے ہیں ۔ اُسکو آج نہیں تو کل اس دارِ فانی سے کوچ کرنا پڑیگا ۔ لیکن تم نوجوان ہو ۔ تمھارا دل جذبات سے پُر ہے ۔ تم مایوسی کی زندگی بسر نہیں کرسکتیں ۔ تمھیں جیتی جاگتی محبت درکار ہے ۔ تمھیں ایک درخت میں لگا ہوا گلِ شگفتہ چاہیئے ۔ نہ کہ خاک میں پڑی ہوئی خشک پنکھڑی ۔ چلو اگلے ہفتہ میرے ساتھ مصر چلو ۔ مجھے اُسی پُرانے کھدائی کے کام پر جانا ہے ۔ جو چاند کہ کلیوپیٹرا اور اُسکے عاشق اینٹونی کے لئے زمانہ قدیم میں چمکتا تھا اب بھی وہاں موجود ہے ۔ اس موسم بہار کے صاف و شفاف آسمان میں چمکتے ہوئے چاند کی مسرت بخش روشنی میں تمھیں بتاؤنگا کہ محبت اور خوشدلی کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کیجاتی ہے

صاف و شفاف آسمان میں چمکتا ہوا چاند! آہ اسکا خیال آتے ہی لڑکی کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور اُسکا تخیل اُسکے روبرو نیلگوں آسمان اور آخری رات کا نظارہ پیش کرتا ہے ۔

خاموشی کا عالم۔ آسمان پر لاکھوں ستاروں کی چمک دمک طلسمات کا دھوکا دے رہی ہے۔ اسے معلوم ہو رہا ہے کہ اس دلفریب منظر میں وہ کھجور کے درختوں تلے اپنے عاشق زار کے پہلو میں کھڑی ہے!

دم بھر کے بعد جب پھر اسنے آنکھ کھولی تو اُسے بھورے مکان کے گرد کا عشق پیچاں سوکھا ہوا دکھائی دیا۔ مکان کے اندر پلنگ پر لیٹا بات بات پر چڑچڑانے والا مریض اُسے اپنے زندان ہستی کی ایک وزنی آہنی بیڑی کے مثل معلوم ہو رہا ہے۔

یکایک وہ اپنے عاشق سے لپٹ گئی۔ اور آہستگی سے بولی: "میں تمھارے ساتھ چلونگی" اتنا کہنا تھا کہ جوش مسرت سے اُسکے گال سُرخی سے چمک اُٹھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سامنے بھورے مکان میں وہی دائم المریض سپاہی پلنگ پر دھوپ سے منھ ہٹائے ہوئے لیٹا ہے۔ آہ! اس بیچارے کو شائد پھر یہ دھوپ دیکھنا نصیب نہ ہو۔ زندگی کے ابتدائی حالات باری باری سے اُسکے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے واقعات ایک ایک کر کے اسکے سامنے آرہے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکے کا کندھے پر بندوق رکھکر اکڑ کر چلنا۔ ہشاش بشاش نوشہ کی اپنے عروسِ نو سے ملاقات۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ کا میدان جنگ کو روانہ ہونا۔ وہاں ناگہاں ایک گولے کا پھٹ کر ارد گرد کی سب چیزوں اور جانداروں کو اسطرح خاک سیاہ کر دینا جیسے کوئی کمہار اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو غصہ میں آکر خاک میں ملا دے۔ اسکے نگاہ تصور میں پھر ایک عورت کی شکل دکھائی دی۔ جسنے ایک فرضی بچہ کو چھاتی سے لگا رکھا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس نمائشی محبت سے بچہ چپ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح بہت سے خواب پریشاں اُسکو دکھائی دے رہے ہیں۔ ایام گذشتہ کی یاد اُسے بہت ہی دلکش معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حالت موجودہ کا خیال آتے ہی اُسکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

لڑکی اپنے عاشق سے ملکر واپس آتی ہے۔ اور اپنے خاوند کے بگڑے ہوئے چہرہ پر آنسوؤں کے قطرے دیکھکر اُسکی آنکھیں بھی از خود ڈبڈبا آتی ہیں۔

یکایک اُسکے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ وہ پچھلے چند روز سے اپنی ہی حالت پر

آنسو بہاتی رہی ہے۔ اور خاوند کی بپتا کو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ اِس خیال کے آتے ہی اُسکا دل رحم و محبت اور اخلاص و ہمدردی سے بھر جاتا ہے وہ اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رومال سے اپنے بے بس و بیمار شوہر کے آنسوؤں کو پونچھنا چاہتی ہے کہ وہ جاگ اُٹھتا ہے اسکی آنکھیں کھلتے ہی بیوی آنکھوں کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگتی ہیں اور بچہ کی طرح اپنے ہاتھ سے اُسکے ہاتھ کو ٹٹولنے لگتا ہے۔

مین نے خواب دیکھا ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ اس خواب کو بیان کرتے ہوئے اُسکی آواز بھرا گئی اور وہ بولا معلوم نہیں میرے پانوں میں کہاں سے طاقت آگئی کہ میں اوپر تمھارے کمرہ مین پہونچ گیا اور وہاں تم مجھے نہیں ملیں۔ مگر گلاب کی ٹہنیاں تمھاری کھڑکی کے گرد پہلے ہی کے طرح اتر رہی تھیں۔ وہ زمانہ جبکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایام گذشتہ کی پُر مسرت یاد نے لڑکی کے دل میں بھی ایک ہیجان سا پیدا کر دیا اور بے چین ہو کر بول اُٹھی۔

لیکن میں تمھیں کیوں چھوڑنے لگی ؟ لڑکی نے ذرا تیزی سے پوچھا۔ مرد نے افسردگی سے کہا "آخر تم یہاں کیوں رہوگی" اور پھر ایک نفرت بھری نظر سے اُسنے تن زار و نزار کی طرف دیکھا۔

مگر یکایک ایک بے اختیاری کے عالم میں لڑکی کے مُنھ سے نکل گیا۔ کیونکہ یہ میرا حق ہے۔ کیونکہ تم میرے اور میں تمھاری ہو چکی ہوں۔ جب تک موت جُدا نہ کرے ہم اکٹھے رہیں گے۔ اور اکٹھے ہی تمام مصیبتیں جھیلیں گے۔ "ہم اکٹھے رہیں گے اور اکٹھے مصیبتیں جھیلیں گے" مرد رُکتا رُکتا لڑکی کے سامنے دوھراتا ہے "میں تمھارے کس کام کا" وہ حسرت سے کہتا ہے اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر لڑکی کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیتا ہے۔

مرد کے آنسوؤں نے لڑکی کے دل میں گھسکر پہاڑی وادی کے ملاقات کی یاد کو حرف غلط کیطرح ہمیشہ کیلئے مٹا دیا۔

تم سے بڑھکر میرا کوئی نہیں ہے ؟ "وہ آہستہ سے کہتی ہے" اور اس طرح پر اُسنے اپنے تمام ارمانوں کی اپنے ہی دل میں قبر بنا دی۔

گوپال کرشن یاس

ترجمہ
(از مِس لوئیس ہلجرس)

تنقید کتب

انتخاب زرّیں

یہ شعراء اردو کا ایک مختصر تذکرہ ہے، مسٹر سید راس مسعود (آکسن) ناظم تعلیمات حیدرآباد اسکے مؤلف ہیں، آپ کی یہ تالیف اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ اور آپ کے ذوق ادب کا بیّن ثبوت ہے۔

ابتک اردو شعراء کے بہت سے تذکرے شایع ہو چکے ہیں، تذکرۂ آب حیات بہ لحاظ تفصیل و تنقید سب میں ممتاز ہے، لیکن مولانا آزاد مرحوم نے دور حاضرہ کے صرف چند خاص شعراء کا ذکر کیا ہے، حالانکہ مرحوم کے وقت میں بھی دہلی لکھنؤ میں اکثر ممتاز شاعر موجود تھے، جیسے حکیم مومن خاں دہلوی کو بھی آپ نے تذکرۂ آب حیات سے الگ رکھا تھا۔ لیکن بعد کو مولانا حالی وغیرہ اور محترم ارباب قلم کے اصرار سے انکا ذکر دوسرے اڈیشن میں کر دیا گیا۔ بہرحال آب حیات میں یہ کمی رہ گئی، ممکن تھا کہ مولانا آزاد آب حیات کا کوئی دوسرا حصہ بھی تالیف فرماتے اور اسمیں یہ کمی پوری ہو جاتی۔ لیکن عمر نے اجازت نہ دی۔

تذکرۂ خمخانہ جاوید بھی ایک جامع اور مہتم بالشان تذکرہ ہے۔ مگر طریقۂ انتخاب میں کوئی امتیازی خصوصیت نہیں بلکہ عمومیت غالب ہے۔ اکثر غیر معروف اور مبتدی شعراء کا کلام بھی گلدستوں سے انتخاب کر لیا گیا ہے اور مزید حالات کی زیادہ تفتیش نہیں کی گئی۔ بہرحال خمخانۂ جاوید ایک جامع تذکرہ ہے۔ مگر افسوس کہ ابتک اسکی صرف چند جلدیں شایع ہو سکی ہیں۔

انتخاب زریں میں منتخب اور مشہور شعراء کے مختصر حالات کے ساتھ مختصر کلام کا انتخاب شایع کیا گیا ہے۔ مؤلف کی نظر شروع ہی سے اختصار پر تھی۔ اختصار بیشک بہترین طریقہ کا ہے لیکن اس قسم کے اختصار میں تشنگی باقی رہتی ہے اور سیری نہیں ہوتی۔

مثلاً بیان یزدانی مرحوم کے مختصر حالات کے بعد جو نمونہ کلام پیش کیا گیا ہے اُس سے بیان مرحوم کے تمام اصناف کلام پر کافی روشنی نہیں پڑتی، امید، اور رخصت عروس دراصل اُنکی دو نظمیں ہیں۔ اگرچہ ان نظموں سے بھی اُنکی قادر الکلامی ثابت ہوتی ہے لیکن ایک ایسا شخص جو اُنکی غزل گوئی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہو۔ بالکل فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

سب سے زیادہ قابل تعریف بات جو اس مختصر تذکرے میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ نمونۂ کلام کے لئے پوری نظمیں یا غزلیں دی گئی ہیں، سید راس مسعود کی یہ سعی عمل دنیائے ادب میں ضرور مشکور ہوگی۔ خدا کرے کہ آپ آیندہ بھی اُردو زبان کے خزانے میں اس قسم کے بیش بہا جواہرات کا اضافہ کرتے رہیں، کاغذ کتابت وطباعت کے لحاظ سے بھی انتخاب زریں کا درجہ ممتاز ہے، جلد خوشنما، ٹائیٹل نظر فریب، قیمت عہ، شائقین ادب حضرات مولف سے طلب فرمائیں۔

شاعری کی تیسری کتاب

یہ کتاب قافیہ کے عیب و صواب کے متعلق جناب خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت نے تصنیف فرمائی ہے، ہم اس مفید سلسلہ کی تالیف پر جناب عشرت کو مبارکباد دیتے ہیں، اور شائقین شاعری کو مشورہ دیتے ہیں کہ ضرور اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ کاغذ کتابت وطباعت عمدہ مگر ضخامت کے لحاظ سے قیمت کچھ زیادہ ہے۔

ملنے کا پتہ۔ خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت احاطہ خانساماں لکھنؤ۔

آزادی

یہ مختصر رسالہ حضرت مولانا آزاد سبحانی کی فلسفیانہ افکار طبع کا نتیجہ ہے، آزادی کی تعلیمات عائمہ میں آزادی ناقص کی جگہ آزادی کامل کا اُصول پیش کیا گیا ہے، اور سوراج کے ساتھ ساتھ آزادی کو ملکی نصب العین بنانے کی تلقین کی گئی ہے، قومی آزادی اور نوعی آزادی پر علمی بحث کی گئی ہے اور قومی آزادی کو قومی ترقی کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے، آزادی کا تعلق روحانیت سے بتایا گیا ہے اور مادی آزادی پر روحانی آزادی کو ترجیح دی گئی ہے۔ ارتقا و انقلاب میں انقلاب کو ترجیح دی گئی ہے اور انقلاب کو دو قسموں میں تقسیم کرکے پُرامن طریقۂ انقلاب کو

پر حرب طریقہٴ انقلاب سے بہتر بتایا گیا ہے - آزادی کامل اور اسکی ہر نوع پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملک کے لئے کس آزادی اور کون سے طریقہٴ کار کی ضرورت ہے، اور آزادی کا انجام کیا ہے، غرض رسالہٴ آزادی، سیاسی مسائل کی شرح ہے، عبارت سادہ مختصر اور آسان، طرز بیان فلسفیانہ اور معلمانہ اختصار کے ساتھ تفصیل کا نادر الوجود اتصال قابل دید ہے کتابت طباعت عمدہ - قیمت ۵ حجم چھوٹی تقطیع کے ۴۴ صفحات - ملنے کا پتہ - دفتر دار علمیہ کانپور -

تجارت کی پہلی کتاب

اِس سلسلہ کی چار کتابیں ہمارے پاس بغرض ریویو موصول ہوئی ہیں جن میں فن تجارت کے متعلق ضروری باتوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور تجارت کے ہر مفید پہلو پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے - پہلی کتاب مبادیات تجارت سے متعلق ہے - دوسری کتاب میں فن اشتہار سے بحث کی گئی ہے - تیسری کتاب میں معاملات تجارت اور دوکانداری کی تعلیم دی گئی، چوتھی کتاب میں تجارت کے متعلق مراسلات کے طریقے بتائے گئے ہیں - بلاشبہ یہ سلسلہ تصنیفات نہایت مفید اور کامیاب سلسلہ ہے، اردو میں اس قسم کی کتابوں کی بہت ضرورت تھی، تجارت پیشہ احباب اِن کتابوں کا ضرور مطالعہ فرمائیں، پہلی دوسری تیسری کتاب کے مؤلف مولوی سید ظہور احمد صاحب وحشی اور چوتھی کتاب کے مؤلف سید صغیر علی صاحب قادری ہیں، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت دیدہ زیب - پہلی کتاب کی قیمت غیر مجلد ۱۲ مجلد عہ، دوسری کتاب کی قیمت غیر مجلد عہ مجلد عہ، تیسری کتاب کی قیمت غیر مجلد ۱۲ - مجلد عہ، مقرر ہے - چوتھی کتاب کی قیمت کتاب پر تحریر نہیں - یہ کتابیں نظامیہ دار الاشاعت دھلی سے ملسکتی ہیں -

حیاتِ خسرو

یہ حضرت امیر خسرو کی سوانح عمری ہے جو چھوٹی تقطیع کے ۱۰۶ صفحوں پر دائرہ ادبیہ لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے، اسکے مصنف مولانا شبلی نعمانی مرحوم ہیں - مرحوم کا حقیقت نگار قلم اس مختصر سی سوانح عمری کی تاریخی و ادبی دلچسپیوں کا ضامن ہے، کاغذ معمولی کتابت وطباعت دیدہ زیب - قیمت مجلد عہ، غیر مجلد ۸ - ملنے کا پتہ - دائرہ ادبیہ لکھنؤ -

اسلامی جنتری

اس دلچسپ اور کارآمد جنتری میں متعدد نتیجہ خیز اور مفید مضامین شائع ہوئے ہیں، حجم سو صفحہ سے زائد ہے، آخر کے چند صفحات کے علاوہ باقی صفحے مذہبی، تاریخی، علمی، معلومات سے پُر ہیں، ادبی دلچسپیوں کا بھی کافی ذخیرہ ہے، شروع میں ایک صفحہ پر مشاہیر اسلام کی تصویریں دی گئی ہیں، اسی کے ساتھ ایک محمدی کیلنڈر ابھی شایع ہوا ہے، اُسمیں بھی یہی تصویریں ہیں جو اسلامی جنتری میں ہیں، غرض یہ جنتری مسلمانوں کے لئے ایک خاص چیز ہے،

قیمت غیر مجلد مجلد ۱۲ ار ملنے کا پتہ - دفتر اسلامی خلافت جنتری موچی دروازہ کوچہ آہنگران، لاہور

تحفۂ خوشتر

یہ شعر و سخن کا ایک ماہوار گلدستہ ہے جو ۲۴ صفحہ پر جناب وسیم کی ادارت میں بالالتزام گورکھپور سے شائع ہوتا ہے، ترتیب اور انتخاب قابل تعریف ہے، سالانہ قیمت عہ/،

شائقین شعر و سخن، سید محمد عسکری صاحب وسیم، محلہ مفتی پور شہر گورکھپور سے طلب فرمائیں۔

شگوفہ

اس نام کا ایک ادبی و تعلیمی رسالہ کانپور سے بڑی تقطیع کے ایک جزو پر ماہوار شائع ہوتا ہے جناب صلیح ملہوری اسکے اڈیٹر ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اسکا مقصد خاص ہے، عام شائقین ادب کی تفریح طبع کے لئے بھی مفید اور دلکش ادبی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ گُشتۂ کیمیا کے عنوان سے ایک دلچسپ ناول کا کچھ حصہ بھی ہر مہینہ ناظرین شگوفہ کی تفریح طبع کے لئے شائع کیا جاتا ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت دیدہ زیب، قیمت سالانہ عہ/ ملنے کا پتہ۔ منیجر شگوفہ، پیچ باغ کانپور۔

اعظمی

تصحیح - ہمیں افسوس ہے کہ جنوری نمبر میں کتابت و طباعت کی بعض بعض قابل افسوس غلطیاں رہگئی ہیں۔ بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جنسے نفس مضمون پر کوئی حرف نہیں آتا۔ لیکن بعض غلطیوں کا مفہوم پر خاص اثر ہوتا ہے۔ اسلئے اُنکی تصحیح ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۵۲ پر بسلسلۂ تنقید معارف ملّت وغیرہ تمہید مؤلف کا پہلا فقرہ غلط درج ہوگیا ہے، اصل فقرہ یوں ہے "اردو شاعری کی عجب کیفیت ادب پری"۔ ناظرین درست فرمالیں

پیام دمن

دیکھتی ہون اپنی ان آنکھون سے کیا پروردگار
خواب ہے یہ یا طلسم وحشت کوئی آشکار

تھا ابھی زانو پہ سر کیا کوئی پتھر ہو گیا
خیر یارب خیر اہے میرا کہان شیرین نگار

باعث وحشت ہین مجھکو اونچے اونچے یہ درخت
وجہ بیم و یاس ہین یارب صدائین بے شمار

سہم جاتی ہون مین سُنکر کانپنے لگتا ہے دل
شام تنہائی مین کرے کون مجھکو ہمکنار

میرے پاؤن مین کہان طاقت جو طے کرتی سفر
جا رہی تھی جذب الفت سے کھنچی بیگانہ وار

اک قدم کے بھی اُٹھانے کی نہین طاقت مجھے
چلتے چلتے خار صحرا سے ہوئے تلوے فگار

مجھپہ کس کس کی نظر ہے اژدر و صیاد و شیر
آہ کس کس کا ہے جولانگاہ اک جسم نزار

کیا نہ ٹوٹے گا کبھی یہ کیا نہ دے گا تو جواب
تیری ضد بھی ہو گئی ظالم مرے اشکون کا تار

بول بھی اُٹھ ہان کہین بنکر صدائے بازگشت
ڈھونڈھتے پھرتے ہین تجھکو نالہائے بیقرار

چھپنے والے حد بھی ہے یہ دل لگی اچھی نہین
وہ ہنسی بھی کیا، کوئی خندان ہو- کوئی اشکبار

آزمائش ہو چکی ہان آزمائش ہو چکی
رحم کے قابل ہے اب بیمار غم کا حال زار

نقش پا کا بھی کہین ڈھونڈھے نہین ملتا پتہ
ہائے مین صحرا مین ڈھونڈون کسطرف دیوانہ وار

اے محبت کے فرشتے پیکر صدق و وفا
چھوڑ جاتے ہین کسی بیکس کو یونہی دوستدار

تو وہی ہے ہنس کو قاصد بنایا تھا کبھی
یا دمن کا دیکھنا بھی ہے تجھے اب ناگوار

رہنے دے اے حافظے تو بس بھی کر رعنائیان
یاد ایام تعیش مت دلا اب بار بار

ہائے یہ صحرا نوردی اور کہان وہ تخت و تاج
ہائے وہ پھولون کا بستر اور یہ تکلیف خار

اب غرور حسن باقی ہے نہ وہ آرائشین
اب نہ وہ جوش جوانی ہے نہ وہ میرا سنگار

کسکو بھاتی ہین تری اٹھکھیلیان باد صبا
یاد آیا میکہ تیری چُہلیان تھین خوشگوار

ہوک سی اُٹھتی ہی دل مین انکو صورت دیکھکر
پیک راحت تھا کبھی ہمکو تو اے ابرِ بہار

ظلمتِ طولِ شبِ ہجران ہے تو زلف سیاہ
دور ہو شانون سے ہٹ کیون چھیڑتی ہی بار بار

رحم یارب ٹکڑے ٹکڑے ہے کلیجہ دیکھکر
وہ ہجومِ آرزو اور یہ تمنا کا فشار

آرزو اب حسن کی ہے اور نہ خواہش وصل کی
بھر گیا جی سب سے اپنا آہ دورِ روزگار

چار دن قسمت مین تھا کاشانۂ راحت فزا
دو گھڑی تقدیر مین لکھا تھا اپنی وصلِ یار

انکو کانٹون کی خلش ہے اور ایذا ہجر کی
یاد ایامِ گزشتہ ہے کسی کی سوگوار

وہ عروج اوجِ ہستی یہ زوالِ لازوال
اور کیا کیا دیکھنا ہے دیدۂ عبرت شعار

اور بھی ارمان ہے باقی کوئی تیرا اے فلک
اور بھی حسرت ہے کوئی گردشِ لیل و نہار

منتظر ہے اور کسکی آہ اے برقِ اجل
اور کچھ قسمت مین لکھا ہے ابھی پروردگار

دل مین ہو دردِ محبت سر مین سودائے وفا
لب پہ ہو ذکرِ صنم آنکھون مین ہو تصویرِ یار

ذرہ ذرہ مین نظر آنے لگے تِل کی شبیہہ
اس طرح صحرا مین دم توڑے پریشان روزگار

کھکے گر جاتا تو کیا دامن پکڑ لیتی ترا
جانیوالے تجھکو تھا جانے پہ اپنے اختیار

او تلون کیش او بیدرد آ کر دیکھ جا
پانؤن کے چھالون سے کیسے خون کی بہتی ہی دھار

روٹھنے والے منالون جانیوالے لوٹ آ
در گذر میری خطاؤن سے کہ مین ہون بیقرار

تو مرا منھ دیکھے میرا جو بڑھائے اب قدم
خون پیے میرا جو رکھے پانؤن آگے ایک بار

آرزو ہے منھ چھپا کر روؤن تیری گود مین
آگے جانیوالے پیچھے لوٹ آ تیرے نثار

بے مروت دل ترا نازک ہے اتنا یاد رکھ
صدمۂ فرقت کا تجھ سے بھی نہین اُٹھنے کا بار

اپنے زانو پر سُلاؤن آشنا کر مین تجھے
شامِ غم مین قصۂ دردِ دلِ امیدوار

نوکِ مژگان سے نکالون آنسوؤن سے دھوؤن زخم
چُبھ گیا ہو پائے نازک مین نہ تیرے کوئی خار

ایک چھوٹا سا چمن ہے سیر کر لے رشکِ گل
آ دکھاؤن تجھکو اپنے دل کے داغون کی بہار

اے پپیہا کس طرح شیون مین آتا ہے اثر
کسطرح ہو جاتی ہین غم کی صدائین دل کے پار

کسطرح سے اپنا دامن گل کیا کرتے ہین چاک
کس طرح نالہ کشی کرتے ہین اے بانگِ ہزار

ٹوٹ بھی پڑ بیکسون پر رحم کر ہان ٹوٹ پڑ
ہے کھڑا اسکے سہارے آہ چرخِ دون شعار

تھام لے درد محبت تو ہی اُٹھ کے تھام لے
اپنی نظروں سے گری جاتی ہوں میں بے اختیار

اے زمین شق ہو ہی جا میرے کلیجے کی طرح
میں سما کر ختم کر دوں یہ حیاتِ مستعار

پھوڑ دونگی اے سرِ شوریدہ تجھکو آج میں
باعثِ تکلیف زانو تھا کسی کو تیرا بار

آہ اے دستِ جنون کر اب گریبان چاک چاک
تیری قسمت میں تو لکھا ہی نہیں دامانِ یار

کاش بھرتا پیس کر تو دل کے زخموں میں نمک
یوں نہ پہلو سے کھسک جاتا مگر بیگانہ وار

رو رہی ہوں دیر سے میں لذتِ تعزیر کو
جرم الفت کریں اب اور کبتک انتظار

چھوڑ کر جاتا ہے تنہا جا چلا جا بیوفا
ہے قسم بس یاد مت کرنا دمن کو زینہار

بیوفائی راستہ تیرا تھا اے ظالم تو پھر
ڈھونڈھ لونگی میں بھی اپنے واسطے اک رہگزار

تجھ پہ قابو گر نہیں ہے تو سمجھ رکھا ہے کیا
اپنے مرنے پر بھی کیا مجھکو نہیں ہے اختیار

رنج سے چھٹنے کو چھٹ جائیں یہیں دم توڑ کر
کون لے گا پھر خبر تیری مگر اے یادِ یار

چین مر کر بھی نہیں ہے کشتگانِ عشق کو
انکی قسمت میں نہیں راحت لکھی زیرِ مزار

بعد مردن جستجو میں تیری اے بیداد گر
ہو پریشان دیکھئے کس کس جگہ مشتِ غبار

ایک دل ہے تجھکو چاہا کیسے چاہوں موت کو
مر مٹوں گی پر اجل کی میں نہ ہونگی خواستگار

نذر دی تھی جان تجکو اب یہ تیری چیز ہے
مجھکو مرنے اور جینے پر کہاں ہے اختیار

دم نکل جائے اگر صحرا میں مجہ رنجور کا
ق اور مٹ کر خاک صحرا ہو مرا مشتِ غبار

ہون پریشان خاک ہو کر پارہ ہائے سوزِ دل
اور آ نکلے ادھر سے وہ مرا شیرین نگار

اے زمین اے آسمان اے آب و آتش خاک و باد
اے درختانِ بیابان اے نسیم کوہسار

التجا ہے تمسے اتنی میرا کہہ دینا پیام
چار حرفوں کا نہ کہنا ہو اگر کچھ ناگوار

تھی دمن تیری کوئی،، یہ کہہ کے چپ ہو جائیو
نام سنکر میرا گر ہونے لگے وہ اشکبار

میرا آنچل بنکے آنسو پونچھ دینا اے صبا
اور کہنا بیوفائی پر ہو اب کیوں شرمسار

بر تر تو رونے لگیو حال اک آڑا نا بیکسی
پوچھے گر انجام میرا کیا ہوا پایانِ کار

پھر یہ کہنا کیا کرے گا اے مسافر پوچھکر
اُٹھتے ہی جاتے ہیں دنیا سے نحیف و خستہ زار

سکو سُنکر اُسکے آنسو پھر اگر گرنے لگیں
تیرے صدقے پھر یہ کہنا اے نسیم غمگسار

تیرے اشکوں سے دمن کی روح کو کیا فائدہ
تیری آہوں کی اُسے پروا نہیں اے بیقرار
ہاں اگر فرصت ہو تجھکو اے بتِ وعدہ شکن
سُن لے رودادِ جفا یا عشق کا انجام کار
کیا دمن پر منحصر ہے موت ہے سب کے لیے
ہستیِ دورِ جہان کا ہے اسی پر انحصار
روح نے فرقت میں چھوڑا جسم کیونکر اب یہ سُن
ہاتھ رکھ سینے پہ دل کو تھام رہنا ہوشیار

مرتے مرتے نام تیرا تھا لبِ بیتاب پر
ہر اُکھڑتی سانس میں تھا اے نلِ الفت شعار"

رگھونندن پرشاد آنند

پھر بسنت آیا

صبا نے مژدہ سُنایا کہ پھر بسنت آیا
گلوں نے جلوہ دکھایا کہ پھر بسنت آیا
کلی کلی نے چٹک کر خوش آمدید کہا
یہ کس نے ان کو بتایا کہ پھر بسنت آیا
طیورِ زمزمہ پرداز نے برنگِ دگر
چمن میں جشن منایا کہ پھر بسنت آیا
نکھرتا جاتا ہے کیا حسنِ شاہدِ فطرت
پلٹتی جاتی ہے کایا کہ پھر بسنت آیا
چمن کو وادی و صحرا کو دستِ قدرت نے
یہ ذوق و شوق سجایا کہ پھر بسنت آیا
سحابِ فیض نے سبزے کی نرم اطلس کا
زمیں پہ فرش بچھایا کہ پھر بسنت آیا
پلٹ کے نیرِ اعظم سوئے شمال آیا
سمٹ کے رہگیا سایا کہ پھر بسنت آیا
زمیں نے سرسوں جمائی ہے کیا ہتھیلی پر
کرشمہ خوب دکھایا کہ پھر بسنت آیا

رہا فسردہ و پژمردہ کیوں دلِ محروم
اسے یقین نہ آیا؟ کہ پھر بسنت آیا

محروم

دُنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

از جناب صدرالدین صاحب سرشار کسمنڈوی

حیران ہو کیوں دُنیا کے لئے　　دنیا کی دولت کچھ بھی نہیں　　دنیا کی طلب کرتے ہو مگر　　دنیا کی فراغت کچھ بھی نہیں
دنیا سے محبّت کرتے ہو　　دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

کیوں آئے تھے تم اِس دُنیا میں　　کچھ اسکی خبر بھی ہے تم کو　　دیکھو تو سہی دنیا کیا ہے　　کچھ ذوق نظر بھی ہے تم کو
دنیا سے محبّت کرتے ہو　　دنیا کی محبت کچھ بھی نہیں

کیوں بھول گئے اپنا وعدہ　　جو روزِ ازل کر آئے تھے　　اب تمکو یہ بھی یاد نہیں　　کیا ساتھ وہاں سے لائے تھے
دنیا سے محبّت کرتے ہو　　دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

بے درد بہت ہے یہ دُنیا　　بالکل نہیں اِس میں خوئے وفا　　برباد ہو کیوں تم اسکے لئے　　کیوں ڈھونڈھ رہے ہو بوئے وفا
دنیا سے محبّت کرتے ہو　　دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

دنیا ہی آفت لاتی ہے　　دنیا ہی مصیبت ڈھاتی ہے　　سو رنج تمھیں پہونچاتی ہے　　پھر بھی یہ تم کو بھاتی ہے
دنیا سے محبّت کرتے ہو　　دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

نادان ہو تم دنیا سے تمھیں　　اک روز ضرور ہی جانا ہے　　برحق ہے قیامت کا آنا　　اللہ کو مُنھ دکھلانا ہے
دنیا سے محبّت کرتے ہو　　دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

تم جاؤ نہ باتوں پر اِسکی　　مکّار ہے یہ پھسلاتی ہے　　تعبیر جہنم ہے جس کی　　وہ خواب تمھیں دکھلاتی ہے
دنیا سے محبّت کرتے ہو　　دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

قسمت کو بُرا کیوں کہتے ہو پھر　　کیوں تمکو فلک سے ہے شکوہ　　مذہب کو تمنے چھوڑ دیا　　ملّت سے ہوئے تم برگشتہ

دنیا سے محبت کرتے ہو دنیا کی محبت کچھ بھی نہیں

مذہب پر صدقے ہونے کو ہر حال میں تم تیار رہو آغاز ہو گو امید فزا انجام سے بھی ہشیار رہو

دنیا سے محبت کرتے ہو دنیا کی محبت کچھ بھی نہیں

تم کیوں ہو مسرت کے جویاں دنیا کی مسرت کچھ بھی نہیں ہے مثل حباب اسکی ہستی دنیا کی حقیقت کچھ بھی نہیں

دنیا سے محبت کرتے ہو دنیا کی محبت کچھ بھی نہیں

[illegible]

اپنے وطن پہ صدقے

بہ تتبع جناب اقبال

پرتھی نے جاں گنوائی پیارا رتن سمجھ کر — رانا نے خوں سے سینچا اپنا چمن سمجھ کر
نل ہو گئے ہزاروں اسکو دمن سمجھ کر — ہم ہو گئے تصدق اپنا وطن سمجھ کر

اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

یونانیوں کو کس نے علم و ہنر سکھایا — تاتاریوں کو کس نے یوں آدمی بنایا
ایرانیوں کا کس نے آتشکدہ بجھایا — دنیا کو سر حق کا کس نے سبق پڑھایا

اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

وئے کرشن نے بجائی جس راز کی یہاں پہ — گوتم کے وعظ میں تھا نانک کی تھا زباں پر
چشتی نے جس زمیں کو پہونچایا آسماں پر — کیونکر نہ سر جھکائیں ہم ایسے آستاں پر

اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

ہر گل میں ہے ابھی وہ خوشبوئے روح پرور — کرتی ہے اُن پہ شبنم اب تک نثار گوہر
کانٹوں پہ لوٹتے ہیں اب تک سنان و خنجر — موسم بتا رہے ہیں اب تک یہی گزر کر

اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

قدرت کی دلفریبی احسان کر رہی ہے — آئینہ بن کے کیا کیا حیران کر رہی ہے
ہمت ہماری ہمکو بے جان کر رہی ہے — غیرت یہی اشارہ ہر آن کر رہی ہے

اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

کلیم اعظم گڈھی

جذباتِ حسن

اِک برقِ حسن شب کو تجلی فروش تھی
جذباتِ مضطرب کی مرے پردہ پوش تھی

تھا اقتضائے دل لبِ اظہار وا کروں
تاثیرِ رعبِ حسن کو لیکن میں کیا کروں

وہ گردشِ نگاہ عجب کام کر گئی
سو بار آکے ہونٹھ پہ آواز مر گئی

جب مسکرا کے اُس نے کیا مجھ سے یہ سوال
کس نے کیا ہے تیری تمنا کو پائمال

کس کشمکش میں جان ہے کیا اضطراب ہے
کس آرزو کے کھیل میں ناداں خراب ہے

میں کر سکا نہ ضبط تو آنسو ٹپک پڑے
پیمانہ ہائے بادۂ اُلفت چھلک پڑے

بس ترجمانِ رازِ نہاں ایک آہ تھی
بیتابیوں کی شرح مری اِک نگاہ تھی

اُس پیکرِ جمال نے پھر یوں کیا خطاب
اے محوِ شوق میرے سوالوں کا دے جواب

کیا حسنِ ظاہری کا پجاری ہے؟ سچ بتا
کیا میری شکل ہی تجھے پیاری ہے؟ سچ بتا

کیا میرے وصل ہی کے لئے ناشکیب ہے
ایسا ہی ہے اگر تو ہلاکِ فریب ہے

حسن نظر فریبِ شباب ہے
یہ میری آب و تاب تو موجِ سراب ہے

نفسانیت کا تیری یہ سب مکر و کید ہے
ہاں دامگاہ حرص و ہوا کا تو صید ہے

مجھ سے تو بڑھ کے فصلِ بہاری ہے دلربا
وہ کوئلوں کی کوک وہ جھونکا نسیم کا

مجھ سے زیادہ حسن تو ہے آفتاب میں
تنویر یہ کہاں مرے رنگِ شباب میں

بہتر ہے جی لگائے جو فصلِ بہار سے
ہر سال یہ دکھائیگی منظر نئے نئے

حقدار تیرے دل کی ہے خورشید کی چمک
ممکن نہیں کہ اسمیں تغیر ہو حشر تک

سودا اگر مرا ہے تو سُن گوشِ ہوش سے
اب سے خیالِ گیسو و کاکل کو چھوڑ دے

اسواسطے کہ جذبۂ اُلفت نہ ہو فنا
اور میرے حسن کو بھی ملے دائمی بقا

نا فہمِ خدّ و خال پہ مائل کبھی نہ ہو
ایسے اثر کو ڈھونڈھ جو زائل کبھی نہ ہو

مجنوں - گورکھپوری

لطفِ سخن

جناب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی

کیا ہی جذب دل نے اسقدر کثرت کو وحدت میں — کہ قطرہ اور دریا ایک ہے چشمِ حقیقت میں
غنیمت ہے وطن کی یاد بھی اندوہِ غربت میں — وگرنہ کون کسکا ساتھ دیتا ہے مصیبت میں
بتاؤ وُن گنہگارانِ الفت کی سزا کیا ہے — قیامت کہکے تمکو جو پکارینگے قیامت میں
ہر اک نقشِ قدم پر اپنے سو سو سجدے کر غافل — عبودیت اسی کا نام ہے سودائے الفت میں
نہیں ذوقِ گنہ، لطفِ ندامت، حاجتِ رگریہ — الٰہی دل نہیں لگتا ہمارا ایسی جنت میں
تعجب کیا سیہ بختی ہمارے کام آجائے — سُنا ہے ایک راحت کا بھی پہلو ہے مصیبت میں
دبے پاؤں قیامت فاتحہ خوانی کو آتی ہے — شبِ فرقت کا اک جاگا ہوا سوتا ہے تربت میں
ازل کی بزم افروزی فسانہ ہوتی جاتی ہے — ذرا پھر جلوہ آرا ہو شبستانِ محبت میں
ہر اک خارِ الم نشتر سے بڑھکر دل میں کھٹکے گا — قدم رکھنا سنبھل کر اے اثر دشتِ محبت میں

جناب مولوی حافظ محمد اشرف علی صاحب حافظ کانپوری

حکم سجدہ پئے اظہارِ وفا دیتا ہے — کبھی توفیق جو اُس بت کو خدا دیتا ہے
تو اگر آئینہ کو شکل دکھا دیتا ہے — عکس تیرا اُسے تصویر بنا دیتا ہے
کیوں نہ خاموش رہیں مستِ شرابِ فنا — جام جو ہوتا ہے وہ خالی صدا دیتا ہے
اے مرے نالۂ دل تو ہی یہ کہدے جاکر — دیکھ تو کون ترے در پہ صدا دیتا ہے
قتل گہ میں نہ مجھے خوف نہ جلاد کا رعب — خود بخود کون مرے سر کو جھکا دیتا ہے
دردِ دل کو ہوئی تسکیں جو گئی جانِ حزیں — زہر دیتا ہے مسیحا کہ دوا دیتا ہے
میرے مٹنے کا سبب ہوگئی خود میری حیات — زیست کا راز ہی تعلیمِ فنا دیتا ہے
حسن اور عشق کا ہے وصل بھی ہنگامۂ راز — کوستا ہے کوئی اور کوئی دعا دیتا ہے

عرصۂ قتل میں کیوں نیند نہ آئے حافظ
وہ مجھے دامنِ خنجر کی ہوا دیتا ہے

جناب جوش ملیح آبادی

جواں ہوں ہر چند، پھر بھی چہرہ ہے جوش سے آب و تاب میرا
مری عروسِ سخن کے رُخ پر جھلک رہا ہے شباب میرا

جہاں تھا داؤد سا مغنّی، جہاں تھا یوسف سا حسن مطرب
اُسی گلستاں میں ہر نغمہ ہوا ہے اب انتخاب میرا

اُدھر مری نغمہ سنجیوں سے تری جبیں پر ہے اک تڑپ سی
اِدھر ترے رُخ کی روشنی میں چمک رہا ہے رباب میرا

تری تجلی کہاں نہیں ہے، تری کچھ اسمیں خطا نہیں ہے
مخل ہے میرا غبارِ ہستی، مری نظر ہے حجاب میرا

جو اشکِ دل میں چمک رہا تھا، ٹپک پڑا صبح چشم تر سے
سحر کی تنویر پھیلتے ہی ہوا غروب آفتاب میرا

مری فراست میں شیب آکر اضافہ کچھ بھی نہ کر سکیگا
کچھ ایسے پیچیدہ راستوں سے گذر رہا ہے شباب میرا

تلاش میں جوش میں نے اپنی، ہزاروں دروازوں پہ صدا دی
یہ کاش پہلے ہی مجھ پہ کھلتا کہ دل ہی میرا ہے "باب" میرا

جناب نظر لکھنوی

ہو لاکھ چارہ سازی، لیکن اثر نہیں ہے
ہاں درخورِ مداوا زخمِ جگر نہیں ہے

مدّت سے ڈھونڈتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے
وہ اک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے

سن لو کہ رنگِ محفل کچھ معتبر نہیں ہے
ہے اک زبان گویا شمعِ سحر نہیں ہے

دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی
زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھکو خبر نہیں ہے

آہیں بھریں بہت کچھ، دم توڑنا ہے باقی
اس آہ میں بھی دیکھوں، ہے یا اثر نہیں ہے

تاریک ہو گئی ہو دنیا ہی جب نظر میں
پھر کوئی امتیازِ شام و سحر نہیں ہے

پردہ اُٹھا دے اِکدن تو اے حجابِ ہستی
پاتا ہوں اُسکو دل میں دیکھا مگر نہیں ہے

مرنے پہ جسم خاکی، کیا ساتھ روح کا دے
راہِ عدم میں غافل گردِ سفر نہیں ہے

پھر بھی غمِ جدائی، دوری و نارسائی
ہر چند کوئی مجھ سے نزدیک تر نہیں ہے

ہر چیز کو جہاں میں ہر وقت ہے تغیّر
لیکن شبِ جدائی تیری سحر نہیں ہے

کیا گو مگو ہیں اے دل اسرارِ بیخودی بھی
سب کی خبر ہے مجھکو، اپنی خبر نہیں ہے

شرطِ وفا انہیں سے ہوتی نہیں ہے پوری
تو داد گر ہے ورنہ، بیداد گر نہیں ہے

دنیا سے جا رہے ہو کیا لیکے اے نظر تم
زادِ سفر نہیں ہے، رختِ سفر نہیں ہے

جناب احسن شمسی ناظم حلقۂ ادبیہ کانپور

میں کب کہتا ہوں مجھ سے لطف کر بیداد رہنے دے
مجھے ناکام رہنے دے، مجھے ناشاد رہنے دے

دلِ غم دوست کو لذّت کشِ بیداد رہنے دے
وفا کی قدر کر اہلِ وفا کو شاد رہنے دے

نہ کر پابند اے ذوقِ طرب آزاد رہنے دے
کہ میں مانوسِ حرماں ہوں مجھے ناشاد رہنے دے

میں اس دنیا کو دنیا زندگی کو زندگی سمجھوں
مگر جب چین سے مجھکو دلِ ناشاد رہنے دے

تو مشقِ جور کر مشقِ تغافل کر تجھے کیا ہے
جسے ناشاد رہنا ہو اُسے ناشاد رہنے دے

امیدِ کامیابی کیوں ستاتی ہے مرے دل کو
بس اب ذکرِ مآلِ کوششِ برباد رہنے دے

ابھی ٹوٹی ہوئی امید میں کچھ جان باقی ہے
ابھی سامانِ ماتم اے دلِ ناشاد رہنے دے

مرا کاشانۂ دل ایک دنیائے تمنّا ہے
مگر جب خانہ ویرانی اسے آباد رہنے دے

تری شانِ تغافل پر مری بربادیاں صدقے
جو بربادِ تمنّا ہو اُسے برباد رہنے دے

وہی افسانۂ غم تو نے احسن آج بھی چھیڑا
ارے خاموش، یہ حسرت بھری روداد رہنے دے

جناب زکی اشرفی کچھوچھوی

کہاں ہے آج مرا دلستاں نہیں ملتا
کوئی بتا دے کچھ اُسکا نشاں نہیں ملتا

میں اپنے دل کی کہانی کہوں تو کس سے کہوں
جہاں میں مجھکو کوئی رازداں نہیں ملتا

نگاہِ شوق نے ہر رنگ میں اُسے دیکھا
جگہ وہ کونسی ہے وہ جہاں نہیں ملتا

ٹھہر ٹھہر کے میں بیتاب جس سے ہوتا تھا
یہ کیا ہوا کہ وہ دردِ نہاں نہیں ملتا

حرم میں دیر میں کعبے میں ہر جگہ ڈھونڈھا
مگر کہیں وہ مرا جانِ جاں نہیں ملتا

ہزار درد سہی نالہ ہائے بلبل میں
خموش پھولوں کا رنگِ بیاں نہیں ملتا

ہزاروں سجدے ہیں بیتاب سنگِ در کیلئے
مری جبیں کو ترا آستاں نہیں ملتا

زکی کے منھ سے نہ مے چھوٹتی مگر افسوس
اودھ[1] کی جیل میں پیرِ مغاں نہیں ملتا

---

[1] یہ غزل آپ نے لکھنؤ سنٹرل جیل میں فرمائی تھی۔

جلوہ گاہ اثر

۲ جنوری ۱۹۲۳ء کو حافظ محمد صدیق صاحب صدیقؔ میونسپل کمشنر کے دولتکدہ پر ابہ تقریب تبادلہ مرزا جعفر علیخاں صاحب اثرؔ (ڈپٹی کلکٹر) ایک مختصر سا الوداعی مشاعرہ منعقد ہوا تھا جسمیں طرح کی قید نہ تھی، غیر طرح کی غزلیں پڑھی گئیں، حضرت احسنؔ شمسی نے اظہار خلوص اور جوشِ عقیدت کی بنا پر ایک دلچسپ غزل پڑھی جسکی ردیف جناب آثرؔ کے تخلص کی ممنون تھی، شروع کے چند اشعار میں اثر سے جناب آثر مراد ہیں اور باقی شعروں میں اثر کے عام معنی لئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ نظم فوری جوشِ فکر کا نتیجہ تھی تاہم ادب نواز حضرات کو بہت پسند آئی، ذیل میں ناظرینِ زمانہ کی دلچسپی کے لئے شائع کی جاتی ہے۔

میری ہر سانس ہے اک جلوہ گہ عام آثر — واہ رے شانِ آثر یادِ آثر نامِ آثر
مست ہے بزمِ ادب، دور میں ہے جامِ اثر — دیکھیے فیضِ آثر، دیکھیے انعامِ آثر
عام ہے ملکِ سخن میں، کرمِ عامِ آثر — نثر ہے فیضِ آثر نظم ہے انعامِ آثر
پھول بھر دے مرے مینائے سخن میں ساقی — آج مجھ کو بھی پلا دے مئے گلفامِ اثر
ہیں محمورِ سخن جعفر علیخاں یارب — بزمِ معنی میں چھلکتا ہی رہے جامِ اثر
گو فلک ان سے چھڑاتا ہے جدا ہوتے ہیں — ہم نہ بھولیں گے مگر یادِ آثر نامِ آثر

طائرِ آہ کو ہے شوقِ عروجِ پرواز — عرش پر آج بچھا آئے کوئی دامِ اثر
تم وہ قاتل، کہ تمھاری نگہِ ناز میں سحر — میں وہ بسمل، کہ مری آہ ہے ناکامِ اثر
آہ وہ آہ، کہ منت کشِ تاثیر نہ ہو — نالہ وہ نالہ، کہ لے سر پہ نہ الزامِ اثر
شوقِ مجبور کو مصروفِ فغاں رہنے دے — یاس کیوں یاد دلا دیتی ہے انجامِ اثر
عرش تک جا کے پلٹ آئی دعائے مایوس — شاید اس سے بھی بلند ہی پہ ہے کچھ بامِ اثر
طپشِ دل کہیں محفل میں تماشا نہ بنے — آنہ جائے نگہِ یاس پر الزامِ اثر

شوق ہرچند ہے آغازِ فغاں کی تمہید
مگر احسنؔ مجھے معلوم ہے انجامِ اثر

علمی نوٹ اور خبریں

نواب وقار الملک مرحوم کی ذات ایک ایسی جامع الصفات ذات تھی جسپر حقیقتہً نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام ہندوستانیوں کو ناز ہوسکتا ہے۔ ہمکو یہ معلوم کرکے نہایت خوشی ہوئی کہ منشی محمد امین صاحب زبیری مہتمم صیغہ تصنیف و تالیف بھوپال نے مرحوم کی ایک مفصل سوانح عمری لکھی ہے۔ اور اب یہ سوانح عمری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جانب سے جلد شائع ہونے والی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اب منشی محمد امین صاحب موصوف نواب محسن الملک مرحوم کی سوانح عمری کے ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔

اسی کے ساتھ علمی حلقوں میں یہ خبر بھی دلچسپی کے ساتھ سُنی جائے گی کہ نواب صاحب مرحوم و مغفور کے خطوط کو بھی منشی محمد امین صاحب موصوف ترتیب دیکر شائع کرنا چاہتے ہیں اور اُنھوں نے ایک معقول ذخیرہ خطوط کا فراہم کر لیا ہے اور مزید فراہمی کی سعی کر رہے ہیں۔

نظام المشائخ اور خطیب کے بابتہ گزشتہ نمبر میں جو نوٹ شائع ہوا تھا اُسکے متعلق اسکے ایڈیٹر اور ہمارے مکرم جناب واحدی صاحب نے ایک شکایتی خط لکھا ہے جسمیں آپ نے ہمارے عائد کردہ الزام کو نہ صرف قبول فرمایا ہے بلکہ لکھا ہے کہ نظام المشائخ اور خطیب ہی نہیں بلکہ ایک تیسرا رسالہ "گلچیں" نامی بھی اسی طرز سے آپ کے اہتمام میں شائع ہوتا ہے۔ آپ اسمیں کوئی ہرج نہیں سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان تینوں رسالوں کے خریدار مشترک نہیں ہیں۔ اور بڑے بڑے اخبارات دوسرے پرچوں کو مول لیکر اعلان کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ فلاں فلاں پرچہ شامل ہے۔ آپ نے نظام المشائخ کی طرح خطیب و گلچیں کو بھی باقی رکھا ہے۔ اور اسکے پڑھنے والے اسے خوب جانتے ہیں۔

جناب واحدی صاحب کی یہ ہمّتِ مردانہ قابل ستائش ہے کہ ایک ہی مضامین کے علیحدہ علیحدہ ناموں سے آپ تین مختلف رسالے شائع کر رہے ہیں۔ اور گو انکے خریدار مختلف ہوں اور قریب قریب اسکی اصلیت سے واقف بھی ہوں تاہم یہ صورت کسی طرح پسندیدہ نہیں کہی جا سکتی ہے۔ ہمکو افسوس ہے کہ ہم اب بھی اسکو ادبی خوش معاملگی کے خلاف سمجھتے ہیں کہ ایک ہی چیز تین مختلف ناموں سے فروخت کی جائے۔ ہماری رائے میں یہ ایسی دوکانداری ہے جسکی ہرگز حوصلہ افزائی نہ ہونا چاہیئے۔

ایک کرم فرما، ہمیں مسلم یونیورسٹی کے اُردو نصاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ "قومی یونیورسٹی میں اُردو کا خیال تو ہو رہا ہے مگر کامیابی ایک خواب ہے، جسکا اصل سبب ممتحنین اور ارباب حل و عقد کی کم نظری اور مغرب پرستی ہے، انٹرمیڈیٹ کا طالب علم دیکھیئے اور شکوہ و جواب شکوہ اسکا نصاب ملاحظہ کیجیئے، بی۔ اے کا متعلم اشعار غالب پڑھ رہا ہے، کیا حقیقت میں اب شاعری اُردو سکھا سکتی ہے"

ہم اپنے محترم دوست کی رائے سے ایک حد تک متفق ہیں، ہماری رائے میں اُردو زبان حاصل کرنے کے لئے نظم و نثر دونوں کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ حصہ نظم میں شکوہ اور جواب شکوہ اور اشعار غالب کا انتخاب اچھا ہے۔ مگر نثر کی مستند کتابیں بھی اسکے ساتھ نصاب میں داخل ہونا چاہئے۔ یہ صورت مفید نہیں کہ نصاب تعلیم میں صرف نظمیں ہوں اور نثر نہ ہو۔

ہمارے ایک دوست ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ ہندوستان کے رسالوں کو بھی افسانہ نگاری کی وہ روش اختیار کرنا چاہیے جو یورپ کے ایک مشہور رسالہ اسٹرانڈ نے اختیار کی ہے، اُسکے اڈیٹر نے پہلے ایک مشہور افسانہ نگار ای فلپس اوپن ہینٹ سے ایک افسانہ کا پہلا باب لکھوایا، پھر ایک دوسرے افسانہ نگار سے دوسرا باب لکھنے کی درخواست کی، اسی طرح مسلسل یکے بعد دیگرے تمام مشاہیر اہل قلم کو اس ادبی دعوت میں شریک کر لیا۔ حتیٰ کہ کہانی پوری ہو گئی۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ ایک طریقۂ امتحان ہے، لیکن خیالات کا تصادم اور امتزاج قابل قدر ہو گا۔ ایک کے خیالات کی دوسرے کو خبر نہ ہو گی اور اس طرح ہر شخص گزشتہ ابواب کے رہنمائی کی مدد سے اپنے خیالات کیلئے میدان

تلاش کریگا، یہ طریقہ کار سخت تو ضرور ہے مگر اس سے افسانہ نگاری میں یقینی ترقی ہوگی، ہمارا ارادہ ہے کہ ہم آیندہ کسی افسانے کا ایک باب پیش کرکے خاص خاص افسانہ نگاروں کو اس دعوت ادب میں شریک کریں، گو ہم ابھی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوگی کیونکہ ہندوستان میں ابھی اہل قلم کے لئے وہ ترغیبات مفید نہیں ہیں جو انگلستان میں موجود ہیں اور جنکی وجہ سے بڑے بڑے نامور اہل قلم شکل سے مشکل تجویز پر عمل کرنے کے لئے مستعد ہو جاتے ہیں۔

ہم ایک مدت سے اودھ پنچ کا بالاستعاب مطالعہ کر رہے ہیں، منشی سجاد حسین صاحب مرحوم بانی اودھ پنچ کی وفات کے بعد موجودہ اڈیٹر صاحب نے جس خوبی سے اسکی گزشتہ آن بان قائم رکھی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ بلاشبہہ منشی سجاد حسین مرحوم جیسے اُردو کے سرمایۂ ناز ادیب کی یادگار اس سے بہتر قائم نہیں ہو سکتی، کہ اُنکے لگائے پودے کو پروان چڑھانے کی کوشش کیجائے۔

ہندوستان کی آب و ہوا پنچ اخباروں کے لئے زیادہ مفید نہیں، اکثر ظریفانہ اخبار نکلے اور چار دن اپنی بہار دکھا کے رخصت ہو گئے۔ لیکن اودھ پنچ آج تک اپنی سابقہ روش پر قائم ہے۔ پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اور ہر اشاعت میں معاملات حاضرہ پر ظریفانہ رائے زنی کے علاوہ، ایک دلکش کارٹون بھی پیش کرتا رہتا ہے، ہم شائقین ادب کو اودھ پنچ کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں۔

حال میں حق تصنیف کے متعلق ایک دلچسپ مقدمہ عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ میں دائر تھا۔ مولانا شرر نے لکھنؤ کے ایک تاجر کتب اور دو مالکان مطابع پر اپنے مصنفہ ناول فلورا فلورنڈا کو بلا اجازت چھاپنے اور فروخت کرنے پر ڈیڑھ ہزار روپیہ کا دعویٰ کر دیا تھا۔ ڈسٹرکٹ جج نے مولانا کے خلاف فیصلہ صادر کیا تھا اور مدعا علیہم کو خرچہ مقدمہ بھی دلایا تھا۔ اسپر مولانا ممدوح نے عدالت جوڈیشلی میں اپیل کی لیکن فیصلہ اپیل سے پہلے فریقین میں باہمی راضی نامہ ہو گیا جسکی رو سے نہ مولانا کو خرچہ ادا کرنا پڑا۔ اور نہ مدعا علیہم کو کتاب متنازعہ کے چھاپنے اور فروخت کرنے کا اختیار باقی رہا۔ اِسی سمجھوتہ کے مطابق عدالت عالیہ نے بھی اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

کئی اُردو رسالوں کا مختصر ذکر ہم پچھلے نمبر میں کر چکے ہیں - اس طرف ہندی کے بھی کئی قابل قدر پرچے جاری ہوئے ہیں - پُرانے پرچوں میں بھی غیر معمولی ترقی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں - نولکشور پریس لکھنؤ سے جولائی گزشتہ میں مادھری نامی ایک اعلیٰ درجہ کا ضخیم باتصویر رسالہ جاری ہوا ہے - اس پرچے کی ترتیب مضامین، نفیس چھپائی اور دلکش تصویریں دیکھکر طبیعت خوش ہوتی ہے - ہر پرچہ میں دو تین رنگین اور بہت سی سادہ تصویریں ہوتی ہیں اور ہندی کے بہترین اہل قلم کے مضامین اسمیں شائع ہوتے ہیں - قیمت ساڑھے چھ روپیہ سالانہ ہے -

---

اس سال کے شروع سے ہندی کے پُرانے رسالہ سرسوتی الہ آباد نے بھی غیر معمولی ترقی کی ہے - کارکنان سرسوتی نے صفحات اور تصاویر دونوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے - جس سے اس پرچہ کی دلچسپی پیشتر کے بہ نسبت اب بہت بڑھ گئی ہے - اسمیں بھی دو تین رنگین اور متعدد سادہ تصاویر ہوتی ہیں -

---

رسالہ پربھا بھی ہندی کا ایک نہایت قابل قدر پرچہ ہے جو ہر ماہ کے شروع میں پرتاپ پریس کانپور سے شائع ہوتا ہے - اسمیں بھی ایک رنگین اور کئی سادہ تصاویر اور بہت سے مفید اور دلچسپ مضامین ہر ماہ شائع ہوتے ہیں - آج کل اس رسالہ میں رباعیات عمر خیام کے متعلق تصاویر کا ایک نہایت دلکش سلسلہ شائع ہو رہا ہے - ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اسکی بعض تصویریں ہدیۂ ناظرین زمانہ کر سکیں -

---

شکر ہے کہ اس صوبہ میں اب اُردو کی ترقی اور توسیع کا خیال پیدا ہو رہا ہے، الہ آباد یونیورسٹی نے ایک اُردو ایسوسی ایشن، قائم کی ہے، جسکا ذکر ہم نے بزم احباب کے سلسلہ میں خاص طور پر کیا ہے - لکھنؤ یونیورسٹی نے بھی ترقی اردو کے لئے ایک انجمن قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے، خدا ان اسکیموں کو بار آور کرے اور نتیجہ مفید ثابت ہو،

بزم احباب

احباب کی عنائتیں عموماً مسرت آفریں ہوتی ہیں لیکن بقول غالب مرحوم ؎

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے		یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

جب ایک مخلص کی آواز پر احباب کی ملطف آمیز نگاہیں اٹھتی ہیں تو پھر اسکی خوشی کی کوئی حد نہیں رہتی، چنانچہ ہمارے وہ احباب جو ہماری عرض حال کو تقاضائے توجہ سمجھ کر ملتفت ہوئے ہیں، خاص شکریہ کے مستحق ہیں، اسلئے شکریہ اظہار مسرت کا ایک لطیف پیرایہ ہے، ناسپاسی ہوگی اگر ہم ان احباب کے التفات خاص کا تفصیلی ذکر نہ کریں،

الٰہ آباد یونیورسٹی کے اردو ایسوسی ایشن کے افتتاحیہ جلسہ میں (جو بصدارت جسٹس محمد رفیق صاحب جج ہائیکورٹ الٰہ آباد منعقد ہوا تھا) مسٹر عبداللہ یوسف علی۔ آئی، سی، ایس، سابق معین المہام مال سلطنت حیدرآباد دکن نے اپنی تقریر میں زمانہ کی ادبی خدمات کا مخلصانہ اعتراف کیا اور ہماری ناچیز کوششوں کی داد دی، ہم اس حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں، خدا کرے ان بزرگوں کا ارشاد پُر اثر ثابت ہو اور زمانہ کی مشکلات آسان ہو جائیں،

کمشنر صاحب قسمت الٰہ آباد کا شکریہ ادا کرنا بھی ہمارا فرض ہے، کیونکہ آپ نے ڈسٹرکٹ بورڈ کو (ڈسٹرکٹ بورڈ سکولوں کے لئے) زمانہ کی خریداری پر توجہ دلائی ہے۔

بعض احباب نے زمانہ کی توسیع اشاعت میں خاص حصہ لیا ہے۔ ہم اظہار مسرت کے ساتھ ساتھ، انکی خدمت میں بھی مخلصانہ شکریہ پیش کرنے پر مجبور ہیں۔

بابو جگدیش پرشاد صاحب۔ ایم۔ اے ڈپٹی کلکٹر نے دو خریدار عنایت فرمائے ہیں۔

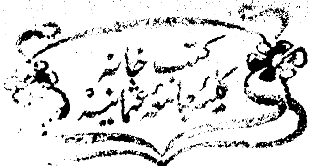
بابو رادھکا کمار صاحب نگم نے ایک خریدار عنایت فرمایا ہے۔

بابو بنسی لال صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جنوری کا پرچہ وی پی وصول ہوا شکریہ ادا کرتا ہوں، آپ نے خریداران قدیم کو متوجہ فرمایا ہے کہ دو دو نئے خریدار عنایت کریں۔ میں بالفعل ایک خریدار پیش کرتا ہوں سو آپ بذریعہ وی پی رسالہ روانہ فرمائیں۔

اس سلسلہ میں مولوی محمد ذکی صاحب اشرفی (کچھوچھوی) اور مولوی محمد لطیف صاحب (بحری آبادی) بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔ آپ حضرات زمانہ کی توسیع اشاعت میں سرگرم ہیں۔

ملا واحدی صاحب اڈیٹر خطیب و نظام المشائخ، کی خدمت میں ہم مخلصانہ شکریہ پیش کرتے ہیں۔ آپ زمانہ پر خاص توجہ فرماتے رہتے ہیں۔

آخر میں ہم اپنے ان احباب کو پھر توجہ دلاتے ہیں جو کسی وجہ سے ابتک خاموش ہیں۔ خدا کرے مزاج بخیر ہو۔ اور جلد سے جلد زمانہ کی طرف متوجہ ہوں۔



زمانہ

جلد ۴۰ مارچ و اپریل ۱۹۲۳ء نمبر ۳ و ۴

اکبر مرحوم کے خطوط

حضرت اکبر الہ آبادی کی ذات اُردو شاعری اور ہندوستانی سوسائٹی کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی - انکی مرگ مفاجات سے اُردو شاعری کو بالخصوص ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے - امید نہیں کہ یہ کمی عرصہ دراز تک پوری ہو سکے - ایک شاعر - ایک فلاسفر - ایک پالیٹیشن - ایک روشن ضمیر اور ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے مرحوم کا پایہ بہت بلند تھا - اوصاف اضافی کے لحاظ سے وہ زمانۂ حال کی تہذیب و شائستگی کا ایک مکمل نمونہ تھے علوم مشرقی و مغربی میں اُنکی نظر یکساں وسیع تھی - عربی - فارسی - اُردو اور انگریزی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے - اعلی سرکاری عہدوں پر فائز اور اعلی سوسائٹی میں شامل رہنے سے اُن کا معیار تہذیب بہت اونچا ہو گیا تھا - علم مجلس کے بادشاہ تھے - ظرافت اُنکی فطرت میں داخل تھی - سنجیدگی اُنکی طبیعت کا جزو اعظم تھی - اور یہ دونوں متضاد رنگ اُنکی طبیعت کے سانچے میں اس طرح ڈھل گئے تھے کہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں معلوم ہوتے تھے - کیا شاعری میں - کیا روزمرہ کی گفتگو میں - کیا احباب کی صحبت میں - کیا اغیار کی مجالست میں، ہر جگہ اُنکی طبعی ظرافت و سنجیدگی اُنکے طرز بیان میں اسقدر شوخی و دلکشی پیدا کر دیتی تھی جسکی تصریح الفاظ سے ناممکن ہے - مرحوم کے پرائیویٹ خطوط میں بھی اسکی جھلک نظر آتی ہے جنکے دو مجموعے حال ہی میں شائع ہوئے ہیں -

اس سے پہلے بلکہ سب سے پہلے قابل ایڈیٹر صاحب "زمانہ" نے "حضرت اکبر کے چند خطوط" کے عنوان سے لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کے خطوط اپنے نامور رسالہ میں شائع کر کے سبقت حاصل کی تھی جو غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ دیکھے گئے تھے۔ حال میں جناب احسن مارہروی نے بھی رسالہ "زمانہ" کے صفحات پر اکبر مرحوم کے چند خط شائع کرائے تھے جنکی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ لیکن خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے "خطوط اکبر" کی ایک پوری جلد شائع کی ہے جو کتابی حیثیت میں ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہوئی ہے اور جسمیں خطوط اکبر کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ علیٰ ہذا دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے بھی "مکاتیب اکبر" کے نام سے اکبر مرحوم کے اُن خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے جو مرزا محمد ہادی صاحب عزیز کے نام موسوم ہوئے تھے۔ ان دونوں مجموعوں کیساتھ اکبر مرحوم کے آخری زمانے کے فوٹو بھی شائع ہوئے ہیں جو غیر معمولی دلکشی رکھتے ہیں۔ دونوں کے ساتھ دیباچے بھی ہیں جنمیں ان خطوط کی نسبت رائے زنی کی گئی ہے اور انکے خصوصیات بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت اکبر کے ایک حقیر نیازمند کے طور پر میں نے ان تمام خطوط کو نہایت ذوق شوق کے ساتھ اول سے آخر تک پڑھا ہے اور "المکتوب نصف الملاقات" کا لطف اٹھایا ہے۔ ان میں اکبر مرحوم بولتے نظر آتے ہیں اور انکی خاموش آواز سنائی دیتی ہے۔ اُن میں مرحوم کے فلسفیانہ نکتے، ظریفانہ چٹکلے، سنجیدہ خیالات اور عالمانہ مباحثات موجود ہیں مگر خال خال۔ زیادہ تر خطوط پرائیویٹ ہیں اور پرائیویٹ باتوں ہی کا زیادہ غلبہ ہے۔ اختصار بھی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اور ایسے اشارات کی خاص کثرت ہے جنھیں مکتوب الیہ کے سوا دوسرے لوگ مشکل سمجھ سکتے ہیں غالباً یہی وجہ تھی کہ مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنے خطوط کی اشاعت پسند نہیں کی حالانکہ بعض اصحاب کا سخت تقاضا تھا کہ وہ اسکی اجازت دیں۔ اور خطوط اکبر کا کوئی مجموعہ انکی حیات میں شائع ہو جائے مولانا حسن نظامی صاحب کے دیباچے سے واضح ہے کہ حضرت اکبر کے خطوط کی اشاعت کا سامان انکی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ اور ایک خاص حصہ مکتوبات کی اُنھوں نے اپنے قلم سے اصلاح و نظر ثانی بھی کر دی تھی۔ مگر اسباب ایسے پیش آتے رہے کہ سالہا سال تک ان کا چھپنا ممکن نہ ہو سکا۔ خیر یہ تو خدا کی مرضی اور وقت پر منحصر تھا۔ کوئی کام اپنے وقت سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرحوم کی وفات کے بعد ہی اُنکے خطوط کی اشاعت کا ایک عام خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اور کئی اصحاب نے مجھ سے

بھی مرحوم کے خطوط طلب کئے گئے تھے۔ میرے خیال میں اکبر مرحوم کے خطوط کا کوئی ایسا مجموعہ زیادہ دلچسپ اور مفید عام ہوتا جس میں انکے مختلف اور عام دلچسپی کے خطوط شائع کئے جاتے جو مختلف لوگوں کے نام ہوتے جس طرح مرزا غالب کے خطوط "اردوے معلی" اور "عود ہندی" میں جمع کئے گئے ہیں۔ بعض علم دوست اصحاب نے یہی کوشش کی تھی مگر غالباً انکو کامیابی نہیں ہوئی۔ اب بھی بعض اصحاب اکبر مرحوم کے سوانحی حالات وغیرہ جمع کرنے کی فکر میں ہیں اور اکثر اخبارات میں اسکے متعلق اشتہار بھی دیئے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ "یادگار غالب" کی طرح لسان العصر حضرت اکبر کے متعلق بھی کوئی قابل قدر کتاب شائع ہو سکے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ خطوط اکبر کا دوسرا حصہ شائع کرینگے جسمیں دیگر حضرات کے نام کے خطوط ہونگے۔ اور وہ "نہایت دلچسپ اور قابل دید ہیں"۔

بہرنوع خواجہ حسن نظامی صاحب نے خطوط اکبر کی ترتیب میں غیر معمولی احتیاط اور محنت سے کام لیا ہے اور حتی الامکان ایسے خطوط شائع کئے ہیں جنمیں ایک حد تک ادبی شان موجود ہے۔ نیز جا بجا حواشی کے اضافہ سے مطالب کو بھی واضح کردیا ہے۔ دراصل خواجہ صاحب کو خطوط کی اشاعت کا خاص ملکہ ہے۔ "آتالیق خطوط نویسی" کے کئی حصے انکے قلم سے نکلے ہیں۔ بہادر شاہ اور ۱۸۵۷ء کے باغیوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی اسکو انھوں نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ علی ہذا محاصرۂ دہلی کے متعلق انگریزی افسروں کے مابین جو خط و کتابت ہوئی تھی اُسکا ترجمہ بھی آپ نے شائع کیا۔ تاہم "خطوط اکبر" کی ترتیب میں جو نقص بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے وہ خطوط کا غیر مسلسل ہونا ہے۔ یعنی تمام خطوط سلسلہ وار نہیں ہیں بلکہ بیشتر خطوط جو بعد کو درج ہونا چاہئے تھے پہلے اور جو پہلے درج ہونا چاہئے تھے بعد کو درج ہوئے ہیں جس سے مطالب کا سلسلہ غیر مربوط ہو گیا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس بے ترتیبی کے متعلق کتاب کے آخری صفحہ پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ لیکن اگر وہ کاپیوں کی تحریر پر کافی نگرانی رکھتے تو یہ صریحی نقص پیدا نہ ہوسکتا۔ کاپیوں کے لکھ جانے پر بھی یہ نقص تھوڑی سی قطع برید میں رفع ہوسکتا تھا لہذا محض کاتب کو مورد الزام بنانا قرین انصاف نہیں ہے۔

ان خطوط کے خصوصیات بجائے خود ایک معرکہ آرا بحث کی محتاج ہیں۔ سب سے پہلے انشاپردازی کا مسئلہ ہے۔ اگلے زمانے میں تعلیم خطوط نویسی کی غرض سے فن انشا کی بعض کتابیں درسیات میں

داخل تھیں۔ دستور الصبیان۔ انشائے مادھورام۔ رقعات بھیم نراین۔ انشائے ابوالفضل وغیرہ فارسی تعلیم میں اسی غرض سے شامل تھیں کہ طلبا کو خطوط لکھنے میں مہارت حاصل ہو جائے۔ اور وہ فارسی انشا پردازی سے واقف ہوں۔ اس لحاظ سے "خطوط اکبر" مبتدیان اُردو کے لئے زیادہ مفید نہیں ہیں۔ حضرت اکبر کے خطوط کی جس خصوصیت پر بالعموم زور دیا گیا ہے وہ "اختصار" ہے۔ یعنی مرحوم بہت بڑے مطلب کو چند الفاظ میں ادا کر دیتے تھے۔ یہ ایک مابہ الامتیاز ادبی خصوصیت ہے۔ اگر کاتب کا مفہوم ہر شخص اُسی طرح سمجھ سکے جس طرح مکتوب الیہ سمجھ سکتا ہو۔ لیکن حضرت اکبر کے خطوط میں جہاں اختصار ہے وہاں زیادہ تر صرف اشارات ہیں جنھیں مکتوب الیہ کے سوا دوسرا شخص باوجود کوشش بھی نہیں سمجھ سکتا۔ دراصل آج کل کی خطوط نویسی کی یہ عام خصوصیت ہے۔ کہ وہ زوائد سے پاک ہوتی ہے اور یہ محض مغربی تعلیم کا اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال کی خطوط نویسی محض کاتب و مکتوب الیہ تک محدود ہوتی ہے جس میں پرائیویٹ باتوں کا ذکر اشارات میں کیا جاتا ہے۔ حضرت اکبر کے خطوط میں اختصار کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ آخری عمر میں (جس زمانے کی خط و کتابت شائع ہوئی ہے) مرحوم کا دل و دماغ بہت کمزور ہو گیا تھا اور طبیعت پر بھی انتہائی حد تک کمزوری غالب آگئی تھی۔ اسلئے وہ زیادہ دیر تک دل و دماغ کو کسی طرف متوجہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ اُنکی شاعری میں بھی یہی بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ جو خیال ذہن میں آیا فوراً نظم کر لیا۔ ضرورت ہوئی تو سلسلے کے دو چار شعر اور کہہ دئے ورنہ ایک ہی دو شعر میں مطلب ادا کر دیا۔ مسلسل اور طولانی نظمیں کلام اکبر میں خال خال ملیں گی اور وہ بھی اُس زمانے کی جب اُنکا دل و دماغ قوی تھا اور طبیعت طولانی فکر سخن کی متحمل ہو سکتی تھی۔ اسی طرح خطوط میں بھی حضرت اکبر اختصار ہی سے کام لیتے تھے اور اکثر اگر ایک خط میں پورا مطلب ادا نہیں ہوتا تھا تو اُس سلسلے میں دو دو تین تین خط لکھتے تھے۔ خواجہ صاحب کے اسی خطوط سے اسکا کافی ثبوت ملتا ہے۔ اور آپ نے اپنے دیباچہ میں بھی اسکا اعتراف کیا ہے۔

البتہ ان خطوط میں کہیں کہیں انشا پردازی کا خاص لطف ہے اور وہ ظریفانہ لطیفوں کی صورت میں یا بعض الفاظ و تراکیب کی جدت میں۔ سب سے زیادہ یہ کہ وہ اپنی شاعری کی طرح نجی کی خط و کتابت میں بھی انگریزی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگرچہ ایک خط میں خواجہ سید حسن نظامی صاحب کو لکھتے ہیں کہ "الحمد للہ کہ آپ انگریزی داں نہیں ہیں" تاہم اُن خطوط میں انگریزی الفاظ عموماً

مستقل ہوئے ہیں جو خواجہ صاحب کے نام لکھے گئے ہیں۔

"خطوط اکبر" کی عام خصوصیات سے قطع نظر کرکے انکے خاص مطالب پر نظر کی جائے تو کاتب و مکتوب الیہ کے ذاتی تعلقات کا مسئلہ سب سے پہلے پیش نظر ہوتا ہے۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ جناب خواجہ صاحب اور حضرت اکبر کے تعلقات تصوف اور روحانیت پر مبنی تھے۔ لیکن ان خطوط سے اسکا پتہ لگانا دشوار ہے کہ کون کسکا روحانی معلم یا پیشوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا پیر طریقت سمجھتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنے دیباچے میں اس معاملہ پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

"گو وہ (حضرت اکبر) بعض اوقات عام مجمع میں میرے مریدوں سے کہدیا کرتے تھے کہ میں بھی تمھارا پیر بھائی ہوں اور حسن نظامی میرے بھی پیر ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے مجھکو خاص مریدوں کی طرح سلوک تصوف کی تعلیم دی ہے اور میں نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ وہ میرے مرشد معنوی ہیں"

مولانا حسن نظامی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "سنہ ۱۹۰۱ء سے میری نیازمندی کا عہد شروع ہوتا ہے" لیکن خطوط زیر نظر میں سنہ ۱۹۰۱ء کا کوئی خط نہیں ہے۔ بلکہ انکا سلسلہ ۱۰ر جنوری سنہ ۱۹۱۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس تمام سال کے متعلق صرف دو خط ہیں۔ ایک ۱۰ر جنوری کا اور دوسرا ۱۶ر دسمبر کا۔ اول الذکر خط جس سے کتاب شروع ہوتی ہے حسب ذیل ہے:۔

مرید پرور سلامت۔ ارادت دلی۔ کوئی عنایت نامہ آپ کا نہیں پہونچا۔ خوشی ہوئی کہ آپ اچھے ہیں۔ خدا اچھا رکھے۔ "اب کوئی صورت آنے کی نظر نہیں آتی" اس سے بہت مایوسی ہوئی۔ [illegible] کے سبب سے مقید ہوں کسی تعطیل میں ان کو ساتھ لیکر آسکتا ہوں۔ بہت گھبراتا ہوں کہ کیا کروں

حور بانو کو دعا۔　　خاکسار اکبر۔ ۱۰ر جنوری سنہ ۱۹۱۱ء

دوسرے خط میں صرف ایک شعر درج ہے اور کچھ نہیں۔ وہو ہذا۔

قدم انگریز کلکتے سے دھلی میں جو دھرتے ہیں　　تجارت خوب کی اب دیکھیں شاہی کیسے کرتے ہیں

اکبر ۱۶ر دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء

اس طرح خواجہ صاحب کی "نیازمندی" کے آغاز سے دو سال کے اندر ہمکو صرف دو خط ملتے ہیں

اور خطوط کا اصلی سلسلہ ۲۹ فروری سنہ ۱۹۱۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ حالانکہ اس سلسلے میں بھی ۱۳ اگست سنہ ۱۹۱۴ء تک صرف دس خط درج ہیں جو اڑھائی سال کے زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ یعنی پورے ساڑھے چار برس کے اندر کل ۱۲ خط۔ اسپر زیادہ تعجب کا مقام نہ تھا اگر خواجہ صاحب اپنے دیباچہ میں یہ نہ لکھتے کہ:۔

"سنہ ۱۹۱۱ء سے میری نیازمندی کا عہد شروع ہوتا ہے اور حساب کیا جائے تو سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۲۲ء تک گیارہ برس کا زمانہ کچھ بڑی مدت نہیں ہے۔ حضرت اکبر کی بعض لوگوں سے خط و کتابت پچاس برس رہی مگر میری خوش نصیبی اور اللہ کا فضل ہے کہ مجھ سے زیادہ حضرت کے خطوط اور کسی کے پاس نہیں ہیں"

خواجہ صاحب نے حساب کیا تو دوسروں کو حساب جانچنے کا موقع ملا۔ یعنی ابتدائی ساڑھے چار سال کی کائنات تو صفر کے برابر ہے باقی ساڑھے چھ سال البتہ شمار میں آسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اتنا طویل زمانہ محترم مکتوب الیہ کی "تلقین باطنی" میں گذر گیا ہو۔ خواجہ صاحب نے جیسا کہ اُنکے دیباچہ سے ظاہر ہے "اصول مشائخ کے بموجب صرف اپنا ذاتی حق خیال" کرکے اس طولانی مدت کی خط و کتابت کو ناقابل اشاعت سمجھا ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھکو شکایت ہے کہ ممدوح نے ان قیمتی تلقینات سے دوسروں کو بہرہ ور ہونے کا موقع نہیں دیا۔ مولانا حسن نظامی ایسے روشن ضمیر بزرگ سے ایسی امید نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً جبکہ آپ کا مشن خلق اللہ کو روحانی فیض پہونچانا ہے۔

یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ خواجہ صاحب نے حضرت اکبر کے خطوط کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اُسمیں مکاتیب کی تعداد کم ہے یا ان خطوط میں عام دلچسپی کی باتیں نہیں ہیں۔ لیکن یہ باطمینان تمام کہا جا سکتا ہے کہ ان میں عام دلچسپی سے زیادہ پرائیویٹ باتیں ہیں جو محض کاتب و مکتوب الیہ کے ذاتی تعلقات اور ذاتی دلچسپی تک محدود ہیں۔ کوئی ایسا خط بمشکل مل سکتا ہے جس میں حضرت اکبر نے ناسازی مزاج کی شکایت نہ کی ہو۔ یا خواجہ صاحب کے ذاتی معاملات اور خانگی حالات کا ذکر نہ ہو۔ پھر ان خطوط کا بہت بڑا حصہ ایک خاص معاملے سے تعلق رکھتا ہے۔

اگست سنہ ۱۹۱۳ء میں مسجد مچھلی بازار کانپور کا ہولناک واقعہ ظہور پذیر ہوا جسنے مسلمانان ہند میں ایک

سخت ہل چل پیدا کردی تھی۔ خواجہ صاحب اس واقعہ کے روز الہ آباد سے چلکر میرٹھ جاتے ہوئے کانپور میں ٹھہرے تھے۔ اسپر بقول ممدوح حکام کو شبہہ ہوا کہ حضرت اکبر بھی واقعات فساد میں در پردہ شریک تھے" بہر نوع خواجہ صاحب حکام کے مورد عتاب ہوئے اور اُنکو ان صوبجات میں آنے کی ممانعت کردی گئی جسکا سلسلہ پانچ سال تک قائم رہا۔ حضرت اکبر بھی غلط یا صحیح طور پر اندیشہ تھا کہ حکام ان سے بدظن ہیں اور انھوں نے حکام سے صفائی کے لئے بہت کوشش کی اور کوئی ذریعہ باقی نہ چھوڑا۔ اگرچہ اس مجموعہ میں اس سلسلے کے تمام خط و کتابت نہیں شائع کی گئی ہے تاہم خطوط کا ایک بڑا حصہ اس پرائیویٹ معاملے سے تعلق رکھتا ہے جو عام دلچسپی سے دور ہے۔ اس سلسلے کا ایک خط حسب ذیل ہے۔

"مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ - ہرگاہ یوپی آپ کے لئے مخدوش قرار پائی تو آپ مجھ سے کیوں اجازت طلب کرتے ہیں۔ میں حکومت کے خلاف کیوں ہونے لگا۔ مگر اُسکا معتمد نہیں ہوں۔ کوئی خدمت نہیں کر سکتا بیٹا ہوں۔ خانہ نشیں ہوں۔ ایک خیال آیا کہ کلکٹر سے پوچھوں۔ لیکن پھر ذہن میں آیا کہ اچھے ہو جاؤ تو کیوں نہ حاذق الملک سے استعلاج کے لئے دہلی کا سفر کرو۔ وہ ہیں چار دن ہیں اُسی ضمن میں آپ سے ملاقات ہو جائیگی۔ کچھ تو بار دل اُتر جائیگا۔ بہت سی ضروری باتیں تصوف کے متعلق ہونگی۔ ایک یوروپین عالم نے انکیلا جواب کتاب اسکے متعلق حال میں تصنیف کی ہے وہ میرے ہاتھ میں ہے۔ عشرت سے ملی ہے۔ واحدی صاحب۔ نیاز صاحب۔ عارف صاحب سے بھی ملنے اور باتیں کرنے کا نہایت مشتاق ہوں۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق کیا دعا کرتا ہوں کہ بالکل آپکے چارج میں ہو جاؤں۔ لیکن ارادۃ اللہ غالب علیٰ ارادۃ الناس۔ چھوٹا پاندان کشاؤ کے کام کا بنارسی تحفہ ہے حوریا نو نے پسند کیا ہوگا۔ سب کو دعا سلام۔

دست موقوف ہوگئے مگر نزلے کا اثر ہنوز زبان پر ہے معمولی غذا شروع نہیں ہوئی۔ لیکن روز بروز افاقہ محسوس ہے۔ اپنے زمانہ پڑھنے کے طریق سے ایک شعر کہا تھا کہ ؎

بقیہ بیشیں تو چوں شیخ کی بس یہ ارادہ ہے — سبب یہ ہے کہ طاقت کم ہے اور فرصت زیادہ ہے

اکبر۔ الہ آباد۔ ۲۱ مارچ ۱۹۱۶ء

اصل یہ ہے کہ حکام کی بدگمانی کی حالت میں حضرت اکبر مولانا حسن نظامی صاحب سے ملاقات

ملنے سے گریز کرتے تھے اور شاید جبتک اس معاملے کی صفائی نہیں ہوئی علانیہ طور پر نہیں ملے۔ اسکا ثبوت مرحوم کی متعدد تحریروں سے ملتا ہے۔ ذیل کی سطور قابلِ غور ہیں:۔

"ایک دفعہ خیال آیا کہ میں الہ آباد میں نہ ہوں اور آپ تشریف لائیں اور اسی وجہ سے کہ میں موجود نہیں ہوں۔ آپ کیلنگنج میں تشریف فرما ہوں اور اخبار میں کہ آپ کی تشریف آوری کا اعلان ہوجائے۔ پھر آپ چلے جائیں جس سے ظاہر ہو کہ آپ کی تشریف آوری خاص مجھ سے مکالمت و مجالست کے لیے نہیں ہے بلکہ عام شغل ہدایت و ارشاد کے لیے آپ کے سفر ہوا کرتے ہیں۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "بے اختیار دل چاہتا ہے کہ یارانِ طریقت کو دیکھوں۔ دیکھئے اللہ کیا کرتا ہے۔ بعید نہیں کہ کسی دن بلا اطلاع السلام علیکم کی ٹھہرے۔" دہلی جا کر خواجہ صاحب سے ملنے کی خواہش کے متعلق متعدد خطوط ہیں۔ بہت سے خطوط میں دنیا سے ترک تعلق کر کے خواجہ صاحب کی خانقاہ میں معتکف ہو جانے کی آرزو ظاہر کی گئی ہے۔ ایک آدھ مرتبہ اس غرض سے دہلی تشریف بھی لے گئے مگر مزاج کی حالت اسقدر غیر مستقل تھی کہ یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ اصل یہ ہے کہ مرحوم کو اپنی طبیعت پر قابو نہ تھا اور تصوف و عرفان کی اُس منزل تک نہیں پہونچ سکے تھے جہاں بیخودی کا احساس زائل ہو جاتا ہے اور ایسی خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے کہ تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ مزاج کی معمولی ناسازی اور ذرا سی شکایت کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ موسم کے تغیرات کا اثر ہمیشہ محسوس کرتے رہتے تھے۔ قریب قریب ہر خط میں موسم کی شکایت موجود ہے۔ جاڑا ناموافق۔ گرمی ناموافق۔ برسات ناموافق۔ اعتدالی موسم کی کوئی صورت نہیں۔ اسکی بڑی وجہ تو ضعف و ناتوانی اور عمر کا تقاضا تھا۔ لیکن اسکے ساتھ مرحوم کو توہمات نے بھی بے انتہا گھیر لیا تھا جسکا انکو خود اعتراف تھا۔ کسی ارادہ پر قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ دہلی جانے کا قصد کیا۔ ریل پر سوار ہوئے اور راستے سے واپس چلے آئے بار بار دہلی جانیکا وعدہ کرتے تھے اور پورا نہ ہوتا تھا۔ اگر با دلِ ناخواستہ گئے تو چند ہی روز بعد واپس آئے۔ طبیعت میں یکسوئی اور ایسی طمانیت خاطر جو اہلِ عرفان و تصوف کا خاصہ ہے حضرت اکبر میں بالکل نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ انکو اسکا علم تھا کہ خدا سے لو لگانے میں انتشارِ طبیعت اور دلی

بیچینی باقی نہیں رہتی - مرحوم کی حسب ذیل تحریر سے ان سب باتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"خدا کا خیال سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ تیری ہستی کیا اور کب تک اور اُنکی ہستی کیا اور کب تک۔ آخر میرے ہی پرتو کی مناسبت سے تو آنکے لئے بے چین ہے۔ بیچینی کم کر اور مجھ سے دل بہلا۔ میرے فضل کا منتظر رہ۔ بیگناہ اور پاک طبیعتوں کا آخر بھلا ہی بھلا ہے۔ بس اسی سے ذرا تسکین ہوتی ہے۔ طبیعت نادرست۔ سردی کا موسم۔ دل افسردہ۔ پرائیویٹ بے تکلیفاں سر پر۔ دنیا کی بدلی ہوئی آنکھ پیش نظر۔ محبوبات رحلت کی تصویریں آنکھوں میں پھرتی ہوئی مُردہ امیدوں کی زندگی کا زمانہ یاد۔ بس یہی باتیں ہیں کہ خط لکھنے سے روکتی ہیں۔ ایک کلیات کا مرتب کر لینا سہل ہے لیکن آپ کو خط لکھنا مشکل ہے۔ آپ نے اپنی حالت لکھی۔ الحمد للہ۔ لیکن میں خود بہتر حالت میں نہیں ہوں۔ اوہام کا جوش میرے لئے ایک امر طبعی ہے۔ کوئی دل بڑھانے والا نہیں۔ بہرحال نیاز نامے لکھتا رہوں گا۔"

بارصعت اُن عارفانہ خیالات کے جنکا اظہار ان سطور کے شروع میں ہوا ہے حضرت اکبر نے حکام سے اپنی اور خواجہ صاحب کی صفائی کے لئے کوئی امکانی کوشش اُٹھا نہیں رکھی اور توکلت علی اللہ پر عمل نہیں کیا۔ طبیعت کی نادرستی، موسم کی شکایت اور اوہام کے جوش سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کے اثرات اُنکی طبیعت پر کسقدر غالب تھے۔ بہر نوع اسمیں شک نہیں کہ حضرت اکبر علم تصوف کے عالم تھے لیکن عامل نہ تھے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جو اُنکو کوئی بڑا صوفی یا عارف کامل نہیں ثابت کرتی۔ بلکہ اس سے اُنکے کیریکٹر کی کمزوریاں روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہیں۔ بہتر ہوتا کہ اس قسم کے خط کثرت سے نہ شائع کئے جاتے

خواجہ صاحب کی صفائی کے لئے حضرت مرحوم نے کون کون سی کوششیں اور تدبیریں کیں اور کن کن لوگوں کو واسطہ بنایا یہ ان خطوط سے واضح ہے۔ خود خواجہ صاحب کو متعدد خطوط میں حکام کی خوشامد کرنے کی تحریک کی گئی ہے۔ اور بعض خطوط میں خواجہ صاحب کی نقل و حرکت پر قیود و نگرانی سے انکے مالی نقصان کا بھی ذکر ہے۔ ذیل کا خط ملاحظہ ہو:-

"پیارے خواجہ صاحب - اللہ کے حفظ و امان میں رہئے۔ ماجد میاں لکھتے ہیں کہ ارادہ ہے کہ برن صاحب سے ملکر آپ کے باب میں تحریک کریں۔ میں مدت سے یہ خیال کرتا تھا اور آپ کو لکھتا

بھول جاتا تھا کہ ممکن ہے کہ برن صاحب کی شخصیت اس باب میں سدراہ ہو۔ ہز آنر سے کام
نہ چلیگا۔ برن کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے۔ وہ منائے جائیں۔ اُنکی حاکمی مانی جائے۔ کہا جائے
کہ آپ لٹریری آدمیوں کے مربی ہیں۔ ہمت افزا ہیں۔ فارسی اُردو کو آپ پر فخر ہے۔ جو غرض
طوفان غلط فہمی میں مجھ سے ہوگئی اُس سے قطع نظر فرمائیے۔ میرا بھی بہت نقصان ہو رہا ہے
اور میرے وابستگان دامن کا بھی۔

میں خود سب کچھ کرتا لیکن خود آلودگی سے پاک نہیں ہوں۔ غلط قیاس کر دیا گیا کہ معاملہ
مسجد میں آپ کا مشیر تھا۔ مجھکو اندیشہ رہا کہ مبادا میری تحریک سے کہیں اُنکے کان اور نہ کھڑے
ہوں۔ ؎ چو رستم پدر باشد و من پسر بگیتی نماند دگر نامور
اچھا ہوا کہ ماجد میاں نے یہ خیال پیدا کیا۔ میں نہیں جانتا کیا اثر ہوگا۔ خدا اثر دے۔
بات تو کچھ نہیں۔ آپ بھی ایک عرضی برن کو بھیجدیں تو کیا ہرج ہے " آنریبل آر برن
(چیف سکریٹری گورنمنٹ یوپی لکھنؤ۔ اُردو ہی میں ہو۔
صاف ہو۔ . . . .

اس قسم کی ہدایات دوسرے خطوط میں بھی موجود ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضرت اکبر "عذر
گناہ کو بدتر از گناہ" نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح حکیم برہم صاحب ایڈیٹر "مشرق" کو بھی واسطہ ٹھہرایا
گیا اور اُنکو نینی تال جانے کے لئے سفر خرچ کی تحریک بھی کی گئی۔ لیکن ان کوششوں سے کوئی
نتیجہ نہیں نکلا۔ خود حضرت اکبر نے بھی حکام سے ملنے کی کوشش کی مگر ناکام۔ بہرصورت یہ سب
پرائیویٹ باتیں ہیں جو عام دلچسپی نہیں رکھتیں۔ حالانکہ "خطوط اکبر" کا بڑا حصہ انھیں باتوں سے
تعلق رکھتا ہے۔ گو ضمناً بعض لٹریری اور پولیٹکل مسائل بھی ہیں جن پر اظہار خیال کیا گیا ہے
اور اسمیں شک نہیں کہ خطوط کا یہ حصہ بہت دلچسپ اور ایک حد تک سبق آموز بھی ہے۔ ان
تحریرات میں ادبی شان بھی زیادہ ہے اور زور قلم بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ خصوصاً مولانا حسن نظامی
صاحب کی اکثر تصانیف اور مضامین کی عموماً داد دی گئی ہے اور آپ کے زور قلم کے حضرت اکبر
بھی اُسی طرح مداح ہیں جس طرح دوسرے لوگ۔ اس سلسلے میں حضرت اقبال کی مثنوی " اسرار
خودی و رموز بیخودی" پر کئی خطوط میں اظہار رائے کیا گیا ہے اور آپ کی آزاد خیالی کو ناپسند کیا گیا ہے

مگر لطیف پیرایہ میں - ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"اقبال صاحب نے البتہ بہت بڑی ترقی کی ہے - اُنکو ضرورت ہو - میں یہ مخمس دوں گا۔ ~~

آپ کے ہاتھ میں میں ہاتھ نہیں دے سکتا   داد دیتا ہوں مگر ساتھ نہیں دے سکتا

خدا کے ساتھ رہنا چاہئے - پھر جو رنگ چاہو اختیار کرو - لیکن حالت یہ ہے ~~

مسلماں تو وہ ہو جو ہے مسلماں علم باری میں   کروروں یوں تو ہیں لکھے ہوئے مردم شماری میں

اسکے متعلق حضرت اقبال اور خواجہ صاحب کے درمیان بھی معرکہ آرائی رہی - لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو حضرت اقبال حضرت اکبر کے ہم خیال ہوگئے اور یہ معرکہ بخیر و خوبی ختم ہوگیا - ایک اور تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں :-

"بھاگوت گیتا کے اٹھارہ ادھیاؤں کا اُردو ترجمہ نظم میں ہوا ہے - پنڈت دینا ناتھ صاحب مدن مجوز دھلوی - بی - اے - اکونٹنٹ محکمہ تعمیرات پنجاب مصنف ہیں - رسالہ کا نام مخزن اسرار ہے -

ڈاکٹر اقبال صاحب نے اسرار خودی میں سری کرشن جی مہاراج کو قابل تعریف ادب کے ساتھ یاد کیا ہے اور اُنکی تعلیم کو برقرار رکھا ہے -

مخزن اسرار کے مصنف نے بندگان خدا پر احسان کیا ہے کہ چند اہم مضامین گیتا کا ترجمہ کر دیا ؟

مگر ترجمہ نظم میں ہے - معانی کا انکشاف اچھی طرح نہیں ہوتا - یعنی عوام کے لئے - کیا آپ یا آپ کے دوستوں میں کوئی صاحب اُسکی تشریح صاف اُردو نثر میں کرینگے ....

میں نے اہم مضامین اسلئے کہا کہ ایک پہلو اہمیت کا یہی ہے کہ بنی آدم کا ایک بڑا اور با اثر گروہ اُسکو صحیح سمجھتا ہے اُسکو مستند قرار دیتا ہے - مذہب کی اہمیت "شاید" زیادہ تر اسی بنا پر ہے "

اسمیں "شاید" کا لفظ شاہد ہے کہ مرحوم بات بات میں کسقدر احتیاط برتنا ضروری سمجھتے تھے لیکن جب خود مولانا حسن نظامی صاحب نے "کرشن بیتی" کے عنوان سے سری کرشن جی کی لائف لکھی تو حضرت اکبر نے اسپر حسب ذیل اظہار رائے فرمایا :-

"آج میں نے کرشن بیتی ختم کر دی - آپ کی تمہید و توجیہ بہت معقول اور پولیٹکل ہے - ہندو ظاہرا اُبھرتے جاتے ہیں - ہمکو یہاں رہنا ہے - اُنکے دیوتاؤں سے واقف ہو کر کیوں نہ اُن سے بیگانگی کم کریں - یہ پالیسی انگلوں کی بھی رہی ہے - ہم لوگوں میں یہ وقت افتراق کا ہے - اتحاد کا نہیں ہے -

ہو کیونکہ مرکز ہی قائم ہونے نہیں پاتا - طاقت ہی نہیں - ہر صاحب دماغ و قلم مضمون آفرینی کر رہا ہے -
خدا جانے کیا ہونا ہے . . . .

کرشن جی کے زمانے میں اخلاقی خوبیوں کا جو معیار تھا اگر وہ اسمیں کھرے نہ اُترتے تو کیوں
مُلک اُن کو دیوتا بنا لیتا - معلوم نہیں کُل ہندو اُنکو دیوتا مانتے ہیں یا کوئی گروہ خارج بھی ہے (آریوں
کے سوا) گیتا ہمارے خود دلیل روشن ہے - کتاب بہت آب و تاب سے نکلی ہے - مولوی صاحب تو
اگر خاموش رہیں یہی بہت ہے - ڈاکٹر اقبال نے بھی سری کرشن مہاراج کا ذکر خیر اسرار خودی میں
کیا ہے - جناب امیر کی بہت مدح کی ہے - سر علی امام صاحب کے نام معنون فرمایا ہے - وہ زیادہ پولیٹیکل
ہے - آپ کے رنگ میں سادگی ہے - آورد ہے - . . . . "

غالباً اسی کتاب کے متعلق ایک دوسرے خط میں تحریر ہے : -

" آپ نے ہندوؤں کے حق میں انصاف کرنے کی کوشش کی - ہندو لٹریچر مجبور ہوگا کہ اپنی لٹریری
ہسٹری میں اسکا نوٹس لے لیکن اصلی بات یہ ہے کہ آپ نے تصوف کی دل آویز وسعت کا ثبوت دیا -
جسکا حق آپ پر بہت کچھ ہے - حوصلہ بڑھنے کے تو مجھے بھی آثار نہیں دکھائی دیتے لیکن وقت کی حاجت بڑی
ضرور ہے - مجھکو تو اسی شاعرانہ خیال میں مزا آتا ہے ؎

ہوں عرب میں تو اک یزن بھی سہی ہند میں ہوں تو اک بھجن بھی سہی

یعنی جیسا دیس ویسا بھیس - اس سے زیادہ اِن خیالات کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کیجاسکتی
اسی خط میں ہوم رول کی نسبت لکھتے ہیں : -

"ہوم رول کی نسبت میں نے مبالغتہً بہت اشعار کہے ہیں - اکثر بہت دلچسپ ہیں - آپ نے خوب
لکھا " قلم اُٹھاؤں تو گرگس برستے پڑیں " دوسرا جملہ نہایت بلیغ اور بامعنی ہے - آپ قلم کیوں اُٹھائیں -
ہسٹری اُٹھیگا - اگر نہ اُٹھا تو خدا جانے کیا کچھ اُٹھیگا - تاہم لکھنا چاہیئے کہ اپنی باہمی اصلاح مقدم ہے ؎

جو گایوں کے سینگوں میں ہو زور کچھ تو شیروں کو روکیں بہت نیک دوست
مگر اونٹ کا قول تو ہے یہی تواضع ز گردن فرازاں نکوست

ان اشعار میں گائے اور اونٹ کی تلمیح سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نسبت صاف صاف
اظہار خیال کیا گیا ہے - یعنی ہندو مسلمانوں میں اتفاق نہیں ہے اور مسلمانوں کو ہوم رول کی

تحریک میں شریک ہونا مضرت رساں ہے - اس سلسلے میں ایک اور نظم کے چند اشعار درج ہیں اور انکا ماحصل بھی یہی ہے کہ ہم میں ہوم رول حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے -

"خطوط اکبر" میں پردہ کے متعلق بھی ایک بڑی بحث ہے - مرحوم نے رسم پردہ کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف اشعار کہے ہیں جو غیر معمولی طور پر مشہور ہیں - ان میں کہیں پردہ کی تائید ہے کہیں تردید جسپر اعتراضات ہوئے - اسکے متعلق اس مجموعہ میں کئی طولانی خط درج ہیں - مقصد یہ کہ ان اعتراضات کا جواب دیا جائے - اور جواب کے متعلق مرحوم نے اپنے خطوط میں ضروری میٹر جمع کر دیا ہے - چونکہ یہ ایک خالص مذہبی بحث ہے جس سے کم از کم مجھے زیادہ دلچسپی نہیں ہے - لہذا میں اسکے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہوں - صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اعتراضات سے مرحوم کو بہت پریشانی ہوتی تھی اور چاہتے تھے کہ انکے احباب انکی تردید کریں - بعض خطوط سے یہاں تک واضح ہے کہ اعتراضات کا جواب دیا جائے لیکن انکا نام نہو - ان خطوط سے ظاہر ہے کہ مرحوم اپنی رائے پر مستقل ہیں اور اُسے بدلنا نہیں چاہتے - لیکن اعتراضات کا تحمل بھی نہیں کر سکتے - یہ طبعی کمزوری کی ایک بین دلیل ہے - ایک خط میں ریفارم کے متعلق حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی ہے :-

"میں ڈرتا ہوں کہ اگر شور غل ریفارم میں بے اعتدالی ہوئی اور چند نوخیزوں نے پبلک میں صلح کل اور سوشیل آمیزش کا کھو کھلا اور ناپائدار رنگ دکھایا تو دوسری طرف مذہبی تعصب جو زبردست اور مقدس بڑے میاں کے لقب کا مستحق ہے مذموم کیا جائیگا اور فرق مختلفہ میں شدید جنگ شروع ہوگی جس سے روشنضمیر نوجوان بھی بالآخر نہ بچ سکیں گے - الا ماشاءاللہ - خیر یہ تو ایک عام بات ہے میں خود عجب وقت میں ہوں - پبلک نے فرض کر لیا ہے کہ میں بڑا محب قوم اور اول درجہ کا ریفارمر خواہ ہوں - حالانکہ میں قوم ہی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا - نہ ریفارم کی طاقت ہے - میں نے لامذہبی اور تبدیل وضع کے خلاف قلم اُٹھایا تھا - نہ کہ گورنمنٹ کے خلاف -

اسوقت آنریبل پنڈت موتی لال کا خط آیا ہے کہ قومی اخبار انڈیپنڈنٹ (آزاد) انگریزی روزانہ پرچہ ۵ رفروری سے نکلے گا - اپنا فوٹو فوراً بھیج دیجئے اور اشعار جنکا ترجمہ چھاپوں گا (انشاء اللہ بھیجتا ہوں) ادھر یہ حالت کہ حکام اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے کہ میں اخبارات سے تعلق رکھوں اور نظمیں

بھیجا کروں ۔ معذرتیں کیا کرتا ہوں ۔ ایڈیٹروں کے تقاضے چلے آتے ہیں ۔ عشرت کا تعلق ظاہر اور
اور میرا تعلق بھی ۔ پھر میری رائے بھی موافق نہیں ہے ۔ میرا وعظ قناعت ۔ محنت ۔ توکل ۔ سکوت ۔
عبادت ہے ۔ لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ رفتار فطرت کس جانب ہے ۔ ہر شخص کو اپنی حد جاننا چاہیئے ۔
میں نہ معین نہ مزاحم "۔

اِس تحریر سے مرحوم کے سیاسی خیالات پر صاف روشنی پڑتی ہے ۔ حالانکہ سرکاری ملازمت سے کنارہ کشی کے بعد حکام کو اُنکے دل و دماغ پر کوئی حق نہ تھا ۔ لیکن آپ کے بڑے صاحبزادے سیّد عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے اور خود سید اکبر حسین صاحب خان بہادر اور پنشن خوار ۔ خواہ اِن سب کا لحاظ ہو خواہ کوئی اور سبب ۔ لیکن یہ امر واقعی ہے کہ مرحوم حکام کی ناراضی سے بے انتہا خائف رہتے تھے اور اپنے امکان بھر اسکا موقع نہیں دینا چاہتے تھے " انڈیپنڈنٹ " ایسے اکسٹریمسٹ اخبار میں اپنے اشعار چھپوانا یا اُس سے اپنے تعلق کا اظہار کرنا تو امر آخر تھا وہ معمولی مذاقیہ اشعار میں بھی بہت بڑی احتیاط رکھتے تھے ۔ جب میں الہ آباد میں " ادیب " کو ایڈیٹ کرتا تھا تو مشکل سے کوئی اتوار ناغہ ہوتا تھا کہ میں سید صاحب سے نیاز نہ حاصل کرتا ہوں اور وہ میرے منتظر نہ رہتے ہوں ۔ لیکن یہاں مجھے اپنے اور مرحوم کے تعلقات کا اظہار منظور نہیں ہے بلکہ انکے احتیاط کی ایک مثال پیش کرنا ہے ۔ نمائش گاہ الہ آباد میں جب نمائش کمیٹی نے دیگر مشاغل تفریح کے ساتھ مس گوہر جان (کلکتہ) کا ناچ کرایا تو حضرت اکبر نے اپنے خاص رنگ کا ایک شعر کہا اور اُس روکھی ہنسی کے ساتھ مجھکو سُنایا جو مرحوم کو اپنے ظریفانہ اشعار پر اکثر آیا کرتی تھی ۔ میں نے اس شعر کو حسب عادت لکھ لیا ۔ اسکے بعد " ادیب " کے لئے دوسرے نو تصنیف اشعار لکھوائے ۔ لیکن جب میں رخصت ہوا تو مجھے دروازے سے واپس بُلا کر فرمایا کہ نمائش والا شعر درج نہ کیجئے گا ۔ ممکن ہے کہ حکام کے خلاف ہو ۔ اُسوقت تعمیل ارشاد کی گئی ۔ لیکن وہ شعر ابتک میرے حافظے کی امانت موجود ہے اور میں نہ اُسوقت اسکی اشاعت میں کوئی مضائقہ سمجھتا تھا نہ اب سمجھتا ہوں ۔ سُنئے :۔

چھٹ گئی ہاتھ سے تہذیب کی جھنڈی افسوس
انگریز بیشن بھی نچانے لگے رنڈی افسوس

پالیٹکس کے متعلق سید صاحب کے ذاتی خیالات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں مگر وہ انکا اظہار علانیہ طور پر کبھی نہیں کرتے تھے ۔ سچ کے طور پر مجھے معلوم ہے کہ مرحوم کے اصلی خیالات کو انکی تحریریں

سے بہت ہی کم مناسبت ہے - اسلئے میں اُنکی تحریروں کو مرحوم کی اصلی رائے کا آئینہ نہیں کہہ سکتا پرائیویٹ ملاقاتوں میں وہ سیاسی معاملات کے متعلق کچھ اور ہی اظہار رائے کیا کرتے تھے جسکا تجربہ میری طرح اُنکے بعض دیگر احباب کو بھی ہوگا - لیکن ہر حالت میں وہ شورش اور غیر آئینی طریق سے حقوق طلبی کے مخالف تھے - اور یہ مرحوم کی نہایت صحیح رائے تھی -

"خطوط اکبر" پر ایک مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حسن نظامی اور حضرت اکبر میں ایک روحانی تعلق تھا اور مرحوم چاہتے تھے کہ آخر عمر میں خواجہ صاحب کے قریب رہکر یاد الٰہی میں مصروف ہوں - لیکن مرحوم کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی - اسکا کوئی خاص سبب بھی نہیں معلوم ہوتا - گھر سے وحشت بیزار تھے - اسکی شکایت متعدد خطوط میں موجود ہے - اُنکی اہلیہ محترمہ کا انتقال ۱۹۱۰ء ہی میں ہوگیا تھا اُنکے چھوٹے صاحبزادے سید ہاشم نے ۱۹۱۳ء میں داغ مفارقت دیکر سید صاحب کی خانگی دلچسپیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا - آپ کے بڑے صاحبزادے سرکاری ملازمت کے سلسلے میں الہ آباد سے باہر رہتے تھے - اس صورت میں آپ کے لئے دہلی کا قیام کچھ مشکل نہ تھا - مرحوم کی مالی حالت بھی بہت اچھی تھی - ایک بیش قرار پنشن کے علاوہ ایک معقول رقم بطور اندوختہ بھی پاس تھی اور وہ ہر جگہ آرام اور فراغبالی کے ساتھ رہ سکتے تھے - اس صورت میں اسکے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب کی کشش ہی کمزور تھی یا حضرت اکبر کی یہ خواہش انتہائی منزل تک نہیں پہونچ سکی تھی - یہ بھی اُنکی طبعی کمزوری کی ایک دلیل ہے اور ایسی کمزوریاں ان خطوط میں اسقدر عام ہیں کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی اُنکو محسوس کر سکتا ہے - اسلئے کتاب کی اشاعت کا اصلی مقصد فوت ہوگیا - غرض تو یہ ہوگی کہ ان خطوط کی اشاعت سے کاتب و مکتوب الیہ دونوں کی شہرت میں اضافہ ہوا اور پبلک انکے متعلق پہلے سے بہتر خیال قائم کرے - جب یہ معلوم ہو کہ دونوں کے تعلقات ذاتی اغراض سے مبرا نہ تھے جیسا کہ تمام مجموعہ خطوط سے واضح ہے تو پبلک کا اعتقاد بڑی حد تک کم ہوجاتا ہے - یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب خواجہ صاحب کو نقد روپیہ بھی دیا کرتے تھے - اس قبیل کے دو خط اس مجموعہ میں درج ہیں - ایک میں حضرت اکبر دریافت کرتے ہیں کہ "اُس دن میں نے کئے روپیہ کے نوٹ آپ کو دیئے تھے" اور دوسرے میں تحریر ہے کہ "تحریر حساب میں غلطی تھی رفع ہوگئی" اس پر خواجہ صاحب کا نوٹ ہے کہ "الہ آباد سے چلنے لگا تو کچھ نوٹ عنایت ہوئے دہلی پہونچا تو کارڈ آیا کہ کتنے نوٹ دیئے تھے - پھر دوسرے دن یہ خط آیا" - خواجہ صاحب ایک درویش صفت

بزرگ ہیں انکو روپیہ اور روپیہ کے حساب سے کیا تعلق ؟

مجھے افسوس ہے کہ ایسے خطوط کی اشاعت سے دونوں کی شہرت کو نقصان پہونچتا ہے - میری رائے میں حضرت اکبر اپنے کلام ہی کی بدولت زندہ جاوید ہیں - اُنکے خطوط کی اشاعت اُنکی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتی سبب یہ کہ مرحوم کی نظم اُنکی نثر پر غالب ہے - اسیوجہ سے انھوں نے نثر سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھی - اور یہ خطوط بلا خیال انشا پردازی بھی لکھے گئے ہیں - غالب مرحوم کے خطوط اُس زمانے سے جبکہ اردو نثر ابتدائی حالت میں تھی ابتک جبکہ اردو انشا پردازی بہت کچھ ترقی کرچکی ہے یکساں دلچسپی کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں اور اردو نثر کا بہترین نمونہ خیال کئے جاتے ہیں حضرت اکبر کے بعض خط اوپر درج ہوئے ہیں - ذیل میں مرزا غالب کا بھی ایک خط درج کیا جاتا ہے جو انھوں نے سورت کے ایک رئیس کے نام لکھا تھا :-

نواب میر غلام بابا خاں بہادر کو مسرت بعد مسرت وجشن مبارک وہمایوں ہو - رقعۂ گلگوں نے بہار کی سیر دکھلائی - تمہاری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی - پانوں سے اپاہج - کانوں سے بہرا - ضعف بصارت - ضعف دماغ - ضعف دل - ضعف معدہ - ان سب ضعفوں پر ضعف طالع - کیو قصد سفر کروں - تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں - گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے - طاقت جسم میں حالت جان میں نہیں - آنا میرا کسی طرح امکان میں نہیں - خط لکھتے لکھتے خیال میں آیا کہ جیسا سید صاحب کی ولادت کی تاریخ لکھی سیدانی صاحبہ کی بسم اللہ کی تاریخ بھی لکھنا چاہئے - ماہ خجستہ بہار ذہن میں آیا - سات عدد کم پائے - خجستہ بہار پر ادب کے اعداد بڑھائے بشار میں ۳ ء ۱۲ نظر آئے - دوسرے ورق پر وہ قطعہ مرقوم ہے - بوڑھوں کی فکر کی طاقت معلوم ہے - صرف جوش محبت سے چار مصرعے موزوں ہوئے ہیں - گر مقبول افتد زہے عز و شرف -

قطعہ

خجستہ جشن دبستان نشینی بیگم | بفیض ہمت نواب مین اقبالش
چو از پئے ادب آموزیست خوش باشد | اگر خجستہ بہار آدب - بود سالش

سخت ناحق کوشی ہوگی اگر اس سے یہ خیال کیا جائے کہ حضرت اکبر کے خطوط میں کوئی ادبی شان نہیں ہے - اگرچہ یہ بچ کی تحریریں ایسا جو قلم برداشتہ لکھی گئی ہیں تاہم ان میں عبارت کی پختگی اول سے

آخر تک موجود ہے اور جستہ جستہ انشاپردازی اور ظرافت کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔کوئی شک نہیں کہ اگر مرحوم نظم کی طرح نثر کی طرف بھی توجہ کرلیتے تو اُنکی نثر اگر غالب مرحوم کی نثر پر سبقت نہ لیجاتی تو اُس سے کم درجہ پر بھی نہوتی۔پھر ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ مرزا غالب کے زمانے میں اردو نثر کا ایک معیار قائم تھا جس پر اُس عہد کے انشاپردازوں کی تحریرات کی جانچ ہوسکتی تھی۔ اس زمانے میں نظم و نثر دونوں کا کوئی معیار نہیں ہے اور سب کی تحریریں قریب قریب یکساں ہوتی ہیں۔بالخصوص خطوط نویسی کی تو ایک ہی شان ہے جس میں کوئی ما بہ الامتیاز نہیں پایا جاتا۔غالب کے بعد سے کئی اساتذہ اردو کے خطوط کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں لیکن خطوط غالب اسی وجہ سے سب پر غالب ہیں کہ اُنکی شان سب سے جدا گانہ ہے۔بہرنوع ہمکو "خطوط اکبر" کے دوسرے حصے کا انتظار رہیگا جس میں ایسے خطوط کی اشاعت کا وعدہ کیا گیا ہے جو مختلف اصحاب کے نام تحریر ہوئے ہیں اور جنھیں حضرت مؤلف نے نہایت دلچسپ اور قابل دید بتایا ہے۔

نوبت رائے نظر

مقالات ٹالسٹائی

انسان کا اصلی مذہبی صوبہ اُسوقت بیدار ہوتا ہے جب وہ دل میں اپنی غیر مستقل مزاجی، تنہائی اور گنا ہگاری کو محسوس کرتا ہے، جس طرح انسان بغیر دل و دماغ کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح مذہب کے بغیر بھی اُسکی زندگی نامکمل ہے۔

اپنے اہل و عیال کے کھلانے پہنانے اور دیگر ضروریات کے مہیا کرنے سے آدمی کی جسمانی خواہشات پوری ہوجائیں گی لیکن اگر وہی کام وہ دوسروں کے لئے کرے تو اُسکی روحانی ضروریات پوری ہونگی،

عورتوں کی طاقت زیادہ ہوگئی ہے اور اکثر مقامات پر وہ مردوں پر حکومت کرتی ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ ابتک اپنے قانون پر عمل کرتی ہیں بمقابلہ مردوں کے جنہوں نے اپنے قانون کو توڑ دیا ہے

(ترجمہ) عالی لکھنوی

ہندوستان عہدِ مغلیہ میں

عہدِ مغلیہ کی تاریخیں اگرچہ فارسی زبان میں اب بھی موجود ہیں لیکن اُنکے مطالعہ سے اتنی توضیح نہیں ہوتی جتنی کہ غیر ملکی سیّاحوں کے سفرناموں سے ہوتی ہے - مگر ان سیاحت ناموں سے عوام ایک حد تک ناواقف ہیں اور نہ ہر شخص کو اسقدر فرصت ہے کہ پُرانی کتابوں کی ورق گردانی اور تلاش سے تشنگیٔ تحقیق بجھائے - اسلئے یہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے کہ جو اگلے وقتوں کے حالات سے واقفیت پیدا کرنے کے شوق میں اپنا قیمتی وقت صرف کرتے اور دماغ سوزی سے کام لیتے - لیکن ہم یہاں پر عہدِ مغلیہ کے مختصر مگر دلچسپ حالات بیان کرنے کی کوشش کریں گے -

جو لوگ انگریزوں کی حکومت پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُنھوں نے بڑی بیدردی سے ملک ہند کو تباہ اور رعایا کو لوٹ کر نادار بنا دیا ہے وہ ذرا اگلے وقتوں کے طرزِ عمل کو ملاحظہ کریں - بعض لوگ انگریزوں کے پیشرو مغلوں کے زمانہ کو تاریخ ہند کا عہدِ زریں قرار دیتے ہیں لیکن ذیل کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زمانہ ایسا نہ تھا جیسا خیال کیا جاتا ہے - اِن حالات سے بالواسطہ یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ انگریزوں کی آمد سے پیشتر ملک ہند کی کیا حالت تھی -

جنوبی ہند کی ریاستیں | شمالی ہند میں مغلوں کی پُرشوکت حکومت تھی اور بندھیاچل کے [illegible]میں بھی مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں لیکن منتہائے جنوب میں ہندوؤں کا زور [illegible] شمالی ہند کی تھی وہی جنوبی ہند کی تھی - چاہے مسلمانوں کا غلبہ ہو یا ہندوؤں کا زور [illegible]رتوں میں یکساں تھے - انگریزوں کے آنے سے پہلے وجے نگر کی شان دار ہندو [illegible]ہوچکا تھا اور اسکے ساتھ ہندوؤں کی عظمت بھی معدوم ہوگئی تھی - گو یہ تین سو [illegible]رانی کے کھنڈروں سے ہندوؤں کی پولٹیکل قوت اور شوکت بخوبی عیاں ہے

جو اغیار کے دست برد سے برباد ہوئی تھی - مگر سترھویں صدی کے شروع میں ہندوؤں کی سطوت قطعی طور پر زوال پذیر نہ ہوئی تھی - ناٹک کی ریاستیں دکن کے مختلف حصوں میں آزاد و خود مختار تھیں وجے نگر کی تباہی کے بعد چندر گری کا راجہ ان سب کا سرتاج مانا جاتا تھا اور تمام فرمانروا اسکے زیر اثر تھے اور باقی ملک میں مسلمانوں کی حکومت تھی -

صوبوں کے گورنر اور اُنکے اعمال

حکومت کے صدر مقام دہلی اور آگرہ تھے اور مختلف صوبوں کا انتظام گورنروں کے سپرد تھا - مگر وہ بیشتر دار الصدر کے احکام کے پابند نہ تھے - یعنی جو جی میں آتا کرتے تھے - گویا اپنے اپنے صوبوں کے حقیقی فرمانروا تھے - بادشاہ کا اثر واقتدار عملاً دار الحکومت کے قرب وجوار کے علاقے ہی تک محدود رہتا تھا صوبہ کے گورنر دو طرح پر مقرر ہوتے یا تو خدمات جلیلہ کے صلہ میں جو میدان کارزار میں یا کسی اور آڑے موقع پر انجام دیجاتی تھیں - یا بڑی بڑی رقموں کے عوض میں صوبہ کی حکومت دیجاتی تھی - جب جنگ چھڑ جاتی تو شاہی خزانہ خالی ہو جایا کرتا تھا - اور اُسے پُر کرنے کے لئے سب سے بڑی رقم پیشکش کرنے والے کو کسی اچھے صوبہ کا حکمراں مقرر کر دیا جاتا - جب کوئی امیر اس طریقہ سے گورنری حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا - تو وہ جاتے ہی رعایا سے اپنی خاص تحصیل مالگذاری کے ساتھ شروع کر دیتا - اور جسقدر جلد ممکن ہوتا - اپنے عالی منصب کی قیمت مع منافع کے بہم پہونچا لیتا - اسکا انجام یہ ہوتا کہ رعایا پر سخت ظلم روا رکھا جاتا - کوئی سوداگر اور زمیندار خوشحال نہ رہنے پاتا - بلکہ معمولی کاشتکاروں کی خون پسینہ کی کمائی بھی چھین جاتی - اور وہ افلاس و تنگدستی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے - ظاہر ہے کہ اس قسم کے طریق حکومت میں محکوم کی فلاح کا کوئی لحاظ ہی نہ ہو سکتا تھا - عمّال اپنا اُلو سیدھا کرنے اور اپنی کامرانیوں میں مشغول رہنے کے سوا اور کسی بات کی فکر نہ کرتے تھے - شاید یہ گمان کیا جائے کہ اس قسم کے جور وستم اور سرکاری لوٹ مار صوبوں ہی تک محدود رہتی ہو اور دربار شاہی کے امراء اور ارکانِ دولت اس قسم کی کمزوریوں اور بداعمالیوں سے محترز رہتے ہوں لیکن اگر ایسا ہوتا تو سلطنت کو استقلال اور استحکام نصیب ہوتا - بادشاہ کے مصاحب اور ارکین دربار بھی رعایا کی گاڑھے پسینہ کی کمائی ہتھیا لینا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے -

اس زمانہ میں لندن کے چند اولوالعزم سرمایہ داروں نے مشرقی ممالک بالخصوص

ہندوستان کی تجارت سے مالامال ہونے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرکے ملکہ الزبتھ سے ۱۵۹۹ء میں پروانہ اجازت حاصل کیا تھا۔ اُسوقت شہنشاہ جلال الدین اکبر سریرآرائے سلطنت ہند تھا۔ کمپنی کے ملازموں نے جو خطوط اپنے عزیزوں کو لکھے تھے یا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو اصل حالات کی رپورٹیں روانہ کی تھیں اُن سے یہ بخوبی روشن ہے کہ صوبوں کے فرمانروا اور اُنکے ماتحت حکام رعایا کو کس طرح لوٹتے تھے عوام کی اقتصادی یا تمدنی حالت سنوارنے یا خوشحالی کی ترقی کے وسائل وضع کرنے اور سوچنے کی کسی کو فکر ہی نہ تھی۔ کمپنی کے ایک گماشتہ جان کرنجنے ۲۰ ر جولائی ۱۶۱۲ء کو ایک خط میں گورنروں کی بابت یوں لکھا تھا کہ "گورنر محض اپنا منصب عالی ہی نہیں خریدتے۔ بلکہ ہر قسم کی تجارت وحرفت کے فوائد سے بھی مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ سوداگروں کو اس الزام کی پاداش میں گرفتار کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے تجارت میں بہت نفع کمایا ہے انھیں اُسوقت تک سزائیں دیجاتی ہیں جب تک کہ بیوپار سے کمایا ہوا روپیہ بشکل فدیہ وصول نہ کرلیا جائے۔" ۱۶۱۶ء میں نکوعرف ڈوون ٹن نے اپنے خط میں تجارت کی مشکلات کی یوں شکایت مرقوم کی تھی:۔ منصب دار اپنے علاقہ کے تاجروں کو انگریزوں سے بلاتکلف لین دین نہیں کرنے دیتے۔ بلکہ خرید وفروخت کا تمام کام اپنے ذاتی منفعت کے لئے مخصوص ومحفوظ رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ان لوگوں کے ایمان کا کوئی ٹھکانا نہیں اپنی زبان کا پاس بھی نہیں کرتے بلکہ اپنی ذاتی غرض اور نفع کو سب باتوں پر مقدم سمجھتے ہیں" گورنروں کا یہ شیوہ تھا کہ خاص خاص تاجروں کو تجارت کا اجارہ عطا کرتے تھے۔ اور کوئی تاجر بے روک ٹوک خرید وفروخت کرنے کا مجاز نہ تھا۔ نکو کے خط میں مذکور ہے:۔ یورپ کی ساختہ اشیا کا اجارہ دار ایک سوداگر کے ہاتھ میں ہے جو ایسا مطلق العنان آدمی ہے کہ شہر کے تمام سوداگر اس سے ڈرتے ہیں وہ چیزوں کی قیمت بڑی بے پروائی سے مقرر کرتا ہے اور جہاں چاہتا ہے مال روانہ کردیتا ہے۔ اسکے سامنے کسی اور تاجر کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی۔"

ان حالات سے عیاں ہے کہ اگر وزرائے سلطنت نیک دل اور ضمیر شناس اور قابل منتظم ہوتے تو گورنروں کو اس قسم کی من مانی کارروائیاں کرنے کی مجال نہ ہوتی جنکی وجہ سے

تجارت پر ایسی تباہ کن قیود عائد ہوگئی تھیں۔ چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب عمال زر پرست اور طمع و حرص کے بندے اور پرلے درجہ کے نالایق تھے وہ رعایا کی بہتری کا مطلق خیال ہی نہ کرتے تھے۔

ٹامس کیرج نامی ایک اور ملازم کمپنی تھا۔ اُسنے اپنے خط مورخہ ۲ ستمبر ۱۶۱۴ء میں یوں لکھا ہے:- "اگر کوئی آدمی یہاں آکر کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کا خواہاں ہو تو اُسے بادشاہ اور اُسکے امرا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سامان سے آراستہ ہوکر آنا چاہیے ورنہ کچھ فائدہ نہوگا۔ بادشاہ بڑا نخوت پسند اور بندۂ زر ہے۔ وہ اپنے کو دنیا کا سب سے بڑا حکمران تصور کرتا ہے اسکے امرا ہر بات میں اسکی تقلید اپنا شعار خاص سمجھتے ہیں۔" ۱۶۲۵ء میں جان ڈریک نے شاہی کیمپ سے ایک خط میں یوں لکھا تھا "درباری بالعموم مٹھی گرم کرنے اور نذرانے لینے کے خواہاں رہتے ہیں۔ خسرو بیگ ایک مصاحب نے مجھ سے پانچ سو روپئے طلب کئے۔ آخر کار سو روپیہ نقد اور ایک طلائی زنجیر لے کر میرا کام کرنے کی حامی بھری۔" شاید یہ گمان کیا جائیگا کہ مغل عمال اور گورنر وغیرہ مغربی سوداگروں ہی کو لوٹنے پر تلے رہتے تھے۔ یہ گمان درست نہیں۔ رشوتی حکام گورے اور کالے میں امتیاز نہ کرتے تھے۔ جو آدمی انکے ہتھے چڑھ جاتا اُس سے حسب خواہ نذرانہ لے کر چھوڑتے تھے۔ متھوولڈ نے ۱۶۲۲ء میں اپنے ایک خط میں یوں لکھا تھا: "گورنر اور اُسکے ماتحت عمال کی رشوت ستانی کی عادت شاید درست نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کوئی سخت کارروائی نہ کیجائے۔ وہ ہر ایک آدمی کو لوٹنے کو تیار رہتے ہیں۔ جس سے اُنکا واسطہ پڑتا ہے بادشاہ سے لیکر ادنیٰ عمال تک سب کے سب رشوت لینے کی عادت مذمومہ میں مبتلا ہیں۔ ... رشوت دیکر جو کام چاہو کرا لو۔ یا اگر کسی کے بازو میں قوت ہو تو وہ بھی اپنی مطلب برآری کر سکتا ہے۔ بغیر ان دو کے کوئی مہم سر نہیں ہو سکتی۔ عرصے سے اس ملک سے سچائی۔ ایمان اور انصاف نابود ہوگیا ہے اور اس ملک کی حالت نہایت دردناک ہے۔ امیر غریبوں پر ظلم روا رکھتے اور ہر ممکن طریقہ سے اُنکا خون چوستے ہیں کہ جسکی کوئی داد فریاد نہیں ہوتی۔" وجہ یہ تھی کہ جیسے حاکم رشوت خوار تھے ویسے منصف اور قاضی بھی تھے۔ عدل کون کرتا!

متھوولڈ نے ۱۶۳۶ء میں معدلت گستری کی نسبت یوں لکھا تھا:-

سرکاری معاملات میں اس ملک اور یورپ کے دستور میں یہ بڑا فرق ہے کہ آخرالذکر ممالک میں وکلا قانونی بحث کے لئے محنتانہ لیتے ہیں۔ اور ہندوستان میں منصف قانون سے چشم پوشی کا معاوضہ طلب کرتے ہیں" یہ کیفیت سورت اور دیگر بڑے بڑے شہروں کی تھی۔ جو دارالسلطنت سے براہِ راست ربط ضبط رکھتے تھے۔

شاہی فرمان کی حقیقت گورنر اپنے اعلیٰ عہدہ پر مقرر ہونے کے بعد بادشاہ کے رعب وداب کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ فرمانِ شاہی کی کوئی حقیقت ہی نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتے کرتے تھے۔ انگریز تاجر بھاری بھاری نذرانے ادا کرکے جو فرمان دربار شاہی سے حاصل کرتے گورنر انھیں وقعت نہ دیتے۔ جب کوئی فرمان کسی گورنر کو دکھایا جاتا تو وہ دستور کے مطابق اُسے آنکھوں سے لگاتا۔ اور "بسر و چشم قبول" کہہ کر سرخ روئی حاصل کرتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک اسے رقم خاص نذر نہ کیجاتی تو کوئی کام نہ بن سکتا۔ اور گورنروں کا ظلم سب کو برابر برداشت کرنا پڑتا۔ چاہے ہندوستانی ہوں یا انگریز بغیر رشوت کے انکا کوئی کام نہ نکل سکتا تھا انگریز سوداگر اس غرض سے رشوت دیتے تھے کہ کمپنی کا کاروبار خیر و خوبی سے انجام پذیر ہوتا رہے۔ اور بسا اوقات یورپ کی ساختہ نفیس اور خوبصورت چیزوں سے گورنروں کی خوشنودی حاصل کرنا پڑتی تھی۔ بعض وقت دربارِ شاہی کے وزراء کو نذرانہ دیکر بھی مطلب برآری نہ ہوتی۔

متھ دلڈ رقم طراز ہے "آگرہ اُس کم بخت گائے کی طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو دُودھ دے کر لات مار کر سارا گرا دے" جن مراعات کے لئے بھاری رقم خرچ کیجاتی وہ بعد ازاں بیکار ثابت ہوجاتیں۔ گول کنڈے میں رشوت کا ایسا عام رواج تھا کہ انگریز اور ڈچ سوداگروں کی تجارت محال ہوگئی۔ ۱۶۲۸ء میں مچھلی پٹم سے وہ بوریا بستر اٹھا کر چلے گئے۔ وہاں پر گورنر نے تجارت کا استحقاق تین ہندوؤں کو عطا کردیا تھا اور کوئی آدمی بیوپار نہ کرسکتا تھا۔ اور ان ہندو تاجروں سے گورنر اور حکام آئے دن اسقدر نذرانہ اینٹھ لیتے کہ وہ مال کی قیمت ادا کرنے میں سخت قاصر رہتے۔ انگریز تاجر رات کو چپکے سے ایک کشتی میں سوار ہوکر بھاگ گئے۔ اسی طرح ڈچ لوگ بھی وہاں سے بھاگ نکلے۔ بیجاپور کی حالت یہ تھی کہ "جب جنگ چھڑ جاتی تو بادشاہ زرِ نقد بالجبر لیتا۔ اور اگر کوئی ساہوکار اور سوداگر برضا و رغبت نہ دیتا تو روپیہ کے ساتھ اُسکا سر بھی اُتار لیا جاتا۔"

بنگال کی حالت | سنہ ۱۶۷۶ء میں بنگال کی حالت بھی ابتر تھی " رعایا سے ہر ممکن طریقہ سے روپیہ چھینا جاتا - نواب (شائستہ خاں) ۷۵ سال کی عمر کا تھا وہ بڑا طامع اور زر پرست تھا - اسکے عمال ملک کے انتظامی معاملات میں بڑے ماہر تھے - اسلئے وہ رشوت ستانی کے ہنر میں بڑے ہوشیار اور اپنے آقا کو خوش کرنے کے ڈھنگ سے خوب واقف تھے - ہگلی نواب کے مشاہرے کی جاگیر میں تھا اور بالاسور بھی اسی میں شامل تھا - اسی وجہ سے ایک فرد واحد کی حکومت میں تجارتی کاروبار میں سخت مشکلات حائل تھیں "

سنہ ۱۶۵۸ء میں مدراس کی حالت حسب ذیل تھی :- " ہم بآسانی اندازہ کرسکتے ہیں کہ بیوپاری رعایا کو کسقدر آفات کا سامنا کرنا پڑتا ہے - کئی لشکر ادھر اُدھر سرگردان پھرتے تھے - ان حالات میں تجارت محال ہو جاتی ہے - چنانچہ ہمارے کاروبار کو بہت نقصان پہونچ رہا ہے - پس ہم اپنا مال شہر مدراس سے تیس تیس لیگ (تین میل کا اندازہ) دور لیجانے کو مجبور ہو جاتے ہیں " جن خطوط کے اوپر اقتباس دیئے گئے ہیں وہ زمانہ امن وسکون کی معمولی حالت پر روشنی ڈالتے ہیں - لیکن جب جنگ آرائی ہوتی تو رعایا کے مصائب اور تکالیف بہت بڑھ جاتی ہیں - بقول ایک انگریز کے - " انکا گوشت پوست اُتار کر انکی ہڈیاں چوس لیجاتی تھیں " جب کوئی لشکر کسی ضلع میں نمودار ہوتا تو اُسکی آمد ٹڈی دل کی طرح برباد کن سمجھی جاتی -

بحری قزاق | ساحلوں کے آس پاس سمندری قزاقوں کی لوٹ مار سے رعایا کی جان عذاب میں رہتی تھی - ہندوستان کے سوا اور کئی قوموں کے لٹیرے رات دن لوٹ مار میں مصروف رہتے تھے - کیونکہ مخلوق کے پاس کوئی خاص بیڑہ نہ تھا اسوجہ سے اُنھوں نے ان ساحلی مقامات کو تختہ مشق بنا رکھا تھا - سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں بحری لٹیروں کا برابر زور رہا کہ جو مرہٹوں سے بھی نہ لوٹ سکا ! ہندوستان کے بہترین جہاز راں اور ماہران فن جہاز رانی بحری قزاقی میں مشغول تھے - مغلوں اور مرہٹوں سے جو بیڑے تیار کئے تھے وہ غیر قوموں کے قزاق تو درکنار اپنے ہی ہم وطن لٹیروں کو پامال نہ کر سکے - اندرون ملک میں بھی راہزنوں کا بڑا زور تھا - مسافروں کے مسلح دستے ہی ڈاکوؤں کی دست برد سے محفوظ تھے - نہتے مسافر مال و متاع کے علاوہ جان سے بھی محروم ہو جاتے تھے -

یہ کیفیت اُس زمانہ کی ہے جب مغلوں کی قوت زوال پذیر نہ ہوئی تھی۔ اور جن انگریزوں نے چشم دید حالات خطوط میں مرقوم کیے تھے وہ نہ تو سیاح تھے اور نہ مورخ بلکہ اُنھوں نے تجارت کی مشکلات کا ذکر معمولی طور پر کیا تھا۔ جیسے کوئی اُولوالعزم ہندوستانی کابلی یا ایرانی یا ترکستان میں تجارتی کاروبار شروع کرنے کے بعد مقامی مشکلات اور حکومتی بدنظمیوں کا ذکر اپنے حصہ داروں اور دوستوں کو لکھے۔

فرانسیسی سیاحوں کے بیانات

انگریزوں کے سوا اور قوموں کے تاجر اور سیاح بھی ہندوستان میں آتے اور رہتے تھے۔ برنیر فرانسیسی سیاح ۱۶۵۸ء کے آخر میں آیا اور ۱۶۶۶ء تک ہندوستان کے مختلف حصوں کی سیر کی۔ اسنے بڑے تجسس سے تمام حالات دیکھے۔ اور بڑی صحت وخوبی کے ساتھ حوالۂ قلم کیے۔ مغلیہ طریقہ حکومت کی حرف گیری جس ڈھنگ سے کی ہے اسکی مثال تلاش کرنا دشوار ہے۔ وہ مغل لشکروں کی بابت لکھتا ہے "وہ ایسی بیقاعدگی سے کوچ کرتے ہیں کہ جس طرح حیوانات چلتے ہیں۔ اور جب انکی ترتیب اور قطار ٹوٹ جائے۔ تو پھر اصلاح محال ہے۔ وہ اُس پرزور دریا کی مانند معلوم ہوتے ہیں جو اپنے کناروں سے باہر نکل کر چاروں طرف پھیل جاتا۔ اور بے روک ٹوک تباہی لاتا ہے۔" اُسنے یہ بھی لکھا ہے کہ پچیس ہزار تربیت یافتہ اور قواعد داں سپاہ مغلی لشکروں کو مغلوب کرنے کے لیے کافی ہے۔ چاہے وہ شمار میں کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ پھر وہ لکھتا ہے :- "گو ہندوستان سونے چاندی کی کان ہے۔ مگر دنیا کی اور قوموں کی نسبت اہل ہند کی ظاہری وضع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکے پاس روپیہ پیسہ نہیں ہے۔"

برنیر کا مطالبہ مغلیہ طریقہ حکومت سے ہے کہ جسکے اراکین رعایا کو لوٹنے میں خوش ہوتے ہیں وہ گورنروں اور اعلیٰ حاکموں کی نسبت لکھتا ہے :- "کاشتکاروں پر انھیں اختیار مطلق حاصل ہے شہروں کے اہل صنعت اور تجارت پیشہ لوگوں پر بھی انکا اسی قسم کا غلبہ قائم رہتا ہے۔ جیسے دیہاتیوں پر۔ وہ مطلق العنان حکمرانوں کی طرح حکومت کرتے ہیں۔ کوئی ایسا حاکم اور فرمانروا نہیں ہے کہ جسکے روبرو کسان، صناع اور تاجر اپنی جائز شکایات پیش کرکے دادرسی حاصل کرنے کی توقع کرسکیں۔ نہ تو پارلیمنٹ ہے اور نہ انصاف پرست جج ہیں جو ان غریبوں کو ظالم حکام سے بچا سکیں۔" اسی وجہ سے کوئی آدمی

اپنے کو آسودہ حال ظاہر نہیں کر سکتا تھا - وہی لوگ راحت و خوشحالی کا بے کھٹکے ثبوت دے سکتے تھے جو بادشاہ یا کسی بڑے صاحب اختیار و قدرت حاکم کے منظور نظر اور پروردہ تھے " زراعت کا حال بہت برا ہے - اور بڑا حصہ ویران اور غیر مزروعہ پڑا رہتا ہے - کیونکہ آبپاشی کا کوئی خاص انتظام نہیں - کاشتکار اسوجہ سے محنت سے جی چراتا تھا کہ حکام اسکی خون پسینہ کی کمائی چشم زدن میں لیکر چل دیتے تھے اور گورنر اسوجہ سے اصلاح کی تجاویز سے گریز کرتا تھا کہ اُسے اپنا عہدہ متزلزل معلوم ہوتا تھا - مغلی طریقۂ انتظام کے باعث قصبے - شہر اور دیہات پختہ اینٹوں اور اعلیٰ چیزوں کے بجائے مٹی کے بنے ہوئے تھے -

تعلیم کی بابت وہ لکھتا ہے " جن حالات کا میں نے ذکر کیا ہے - انکی روشنی میں رعایا کے درمیان جہالت اور ناخواندگی کا عالمگیر ہونا امر طبعی ہے - کیا ان حالات میں ہندوستان میں کالج اور تعلیم گاہیں قائم ہو سکتی ہیں - اور اُنکے لئے اوقاف متعین کرنا ممکن ہے ؟ ایسے کالجوں کے بانی کہاں ملیں گے ؟ اگر بالفرض کسی نے کوئی تعلیم گاہ قائم بھی کر دی - تو طلباء اور معلم کہاں سے آئیں گے ؟

جو مختصر حالات چشم دید کوائف کی بنا پر مذکور ہوئے ہیں - ان کی بنا پر یہ خیال کرنا محال ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگ اور ہمارے اجداد ہماری نسبت زیادہ خوشحال تھے - یا مغلوں کے زمانہ کی حالت اس زمانہ سے بہتر تھی -

جے - آر - رائے -

مقالات ٹالسٹائی

کبھی اُس شخص کو خوشی نہیں ہو سکتی جو محض حصول مسرت کے خیال سے شادی کرتا ہو - شادی سے مسرت اُسوقت حاصل ہو سکتی ہے جب زن و شوہر دونوں کا مقصد ایک ہو - جو لوگ شادی کرنا چاہتے ہوں میں اُنسے درخواست کرتا ہوں کہ وہ شادی سے پہلے غور کر لیں اور سمجھ لیں کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے -

مترجمہ عالی لکھنوی

ابتدائی تعلیم پر ایک نظر

ابتدائی تعلیم سے میری مراد اُس تعلیم سے ہے جو ورناکیولر مدارس میں دیجاتی ہے۔ اسمیں اُردو ہندی زبان میں تقریباً کل اہم مسائل کی تعلیم زیادہ سے زیادہ سات سال میں ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر لڑکا چھ سال کی عمر میں (جیسا حکم ہے) داخل اسکول ہو تو ۱۲ سال کی عمر میں ایک معجون مرکب بنکر نکلتا ہے۔ وہ ادب کے لحاظ سے ادیب، حساب کتاب کے اعتبار سے خاصہ ریاضی داں، تواریخ کی حیثیت سے مورخ، جغرافیہ کے لحاظ سے تمام دنیا کا جغرافیہ داں، اقلیدس و جامیٹری کو پیش نظر رکھتے ہوئے پورا ہندسی، غرض ضروریات زندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہجاتی جس میں دسترس نہو۔

میں یہ کہنے کی تو جرأت نہیں کر سکتا کہ "ایں خیال است و محال است و جنوں" کیونکہ موجودہ تعلیم کے قصیدہ خواں فوراً کہہ اُٹھینگے کہ اتنے دنوں سے تجربہ ہوتا چلا آیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں پاس ہو کر نکل چکے ہیں اور آج ہر قسم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ لیکن میں ادب سے اُنکی جناب میں گذارش کرونگا کہ پاس کرنا منحصر ہے سوالات کے جواب لکھنے پر۔ غور سے دیکھئے امتحانات کے پرچے۔ کیا ایک طوطا رٹ کر پاس نہیں کر سکتا۔ اور اگر مختلف کاموں کی انجام دہی اسکی غرض ہے تو اُن چیزوں کی کیا ضرورت ہے جنکی انھیں مرنے کے بعد بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ خیر میں اس بحث کو کسی دوسرے موقع کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔ میں آج صرف اُن کتابوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں جنپر ہماری کورہ بالا تمناؤں اور خام خیالیوں کا مدار ہے۔

شعر

لو ابتدا سے کہتے ہیں ہم داستانِ عشق   آخر شب فراق کی تو انتہا نہیں

سکشن ۱۔ اسمیں کوئی کتاب مقرر نہیں ہے۔ اسی میں چارٹ اور نقشوں کی مدد سے حروف پہچنوائے جاتے ہیں اور پھر انہیں کے ذریعہ سے الفاظ بنوائے جاتے ہیں حساب کتاب میں

بالفریم اور تختہ سیاہ کی مدد سے گنتی اور پہاڑہ بتایا اور لکھایا جاتا ہے۔ بس یہی دو کام ہیں۔ چارٹ اور نقشے ممکن ہیں مختلف ہوں مگر اس صوبہ میں جو تعلیمی نقشے مستعمل ہیں اُن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو لڑکوں کی معلومات کو وسیع کرے۔ یہ میں ماننے کے لئے تیار ہوں کہ لڑکوں کو معلومات سابقہ کی وجہ سے آسانی ہوتی ہے مگر اس سے یہ نہیں ہوتا کہ معلومات میں کچھ اضافہ بھی ہو۔ معلومات میں اضافہ ہونا ہی تعلیم ہے۔ مثلاً "آم" "آلو" "آری" وغیرہ الفاظ کے پہلے "آ" کی آواز نکلتی ہے، ماسٹر "آ" کی صورت تحریر بذریعہ بلیک بورڈ بتا دیتا ہے یہ مان لیا کہ لڑکے "آ" سے تحریراً و تقریراً آشنا ہوگئے اور معلومات کا یہ پہلو روشن ہوگیا مگر ساتھ ہی ساتھ دوسرا پہلو کسقدر تاریک رہگیا کوئی ایسا لفظ نہیں بتایا گیا جس سے اُنکے دماغ پہلے سے ناآشنا ہوں۔ اسکے لئے اگر دو چار دس الفاظ واقفیت سابقہ کے ہوتے اور دو چار انجان ہوتے تو یقیناً اُنکے دماغ میں نئے الفاظ و معانی کا ذخیرہ جمع ہوتا اور یہی تعلیم کا ماحصل ہے۔ مثلاً "آم" "آلو" "آری" "آتش" "آب" "آدم" اِن سے پہلی غرض بھی پوری ہوتی اور نئے الفاظ اور اُنکے معانی بھی معلوم ہوتے۔ اسی طرح کل حروف کے نکلوانے میں لڑکوں کی واقفیت میں خاطرخواہ اضافہ ہوجاتا۔

سکشن ب۔ اسمیں پڑھنے کے لئے کتاب مقرر ہے مگر نصاب کی ساری کتاب اُلٹ ڈالیے ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملیگا جو واقفیت میں ترقی کرتا ہو اسمیں بھی ضرورت تھی کہ پہلی آسان الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہاں ہر سبق میں چند مشکل الفاظ بھی مناسب موقع پر چسپاں کئے جاتے۔

درجہ ۱۔ اس کلاس میں جو کتاب پڑھائی جاتی ہے اسپر بھی مجھے وہی شکایت ہے جو اوپر عرض کرچکا ہوں۔ اسمیں کہیں کہیں ایک آدھ لفظ دکھائی دے جاتے ہیں مگر "النادر کالمعدوم" وہ ہماری ضرورت کو پورا نہیں کرسکتے جس طرح کہیں کہیں اچھے اچھے الفاظ دکھائی دے جاتے ہیں اُس سے زیادہ ایسے لفظ ملتے ہیں جو اُردو کے لئے وبال جان ہیں۔ یہ کتاب ۳۶ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر کہانی کا نتیجہ مقولہ کی صورت میں نکالا گیا ہے۔ مقولے اچھے ہیں مگر اسپر جو کہانیاں تیار کی گئی ہیں وہ اکثر اُس سے کم تعلق رکھتی ہیں یا جو کہانیاں ہیں اُنپر وہ مقولے چسپاں نہیں یہ ایک نقص ہے۔ مقولے ٹھیٹھ ہندی کے لئے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ اُردو کے فصیح لفظوں میں ادا ہوسکتے تھے۔ کہانیوں میں اگر التزام کیا جاتا تو تاریخی۔ تمدنی۔ اخلاقی ہر ایک ہوسکتی تھیں مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس

کلاس میں نظم سے بھی آشنا کرنا ضروری تھا مگر یہ بھی نظر انداز کیا گیا ہے -

درجہ ۲ - اسمیں ریڈر نمبر ۲ پڑھائی جاتی ہے - زبان کے لحاظ سے جو شکایت مجھے پہلے تھی وہ اب بھی ہے - اسمیں ۳۴ کہانیاں ہیں - کہانیوں میں جو نقائص پہلے دکھا چکا ہوں، اس سے یہ بھی پاک نہیں - اسمیں بھی کوئی نظم نہیں -

درجہ ۳ - اسمیں جو کتاب ہے وہ تاریخی - زراعتی - اخلاقی مضمون سے پُر ہے - اگر ایسے مضامین کا لحاظ شروع سے رکھا جاتا تو اور بہتر تھا - زبان کے متعلق جو شکایت پہلے تھی اب بھی ہے - کوشش کی گئی ہے کہ کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جو لڑکوں کی سمجھ سے دور ہو - اب آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ پانچ سال کی تعلیم کے بعد لڑکے کو اگر معلوم ہوا تو کتنے - خصی کا قصہ یا درجہ ۳ میں پہونچکر چند تاریخی اور زراعتی باتیں زبان کے لحاظ سے ایک لفظ بھی نہیں آیا اگر انکو فصیح اُردو دیدیجاوے تو نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں، درجہ ۳ تک جو کتاب اُردو والوں کو پڑھائی جاتی ہے وہی ہندی حرفوں میں ہندی والوں کو بھی پڑھائی جاتی ہے - میری دانست میں دونوں زبانوں پر ظلم کیا گیا ہے -

مولوی محمد اسمعیل صاحب مرحوم نے بھی کتابیں تیار کی تھیں جنکو میں نے دیکھا ہے وہ بہ نسبت اسکے کہیں بہتر ہیں تقریباً کل ضروریات کا اسمیں لحاظ رکھا گیا ہے - ہاں صرف یہ فرق ہے کہ اس میں تصویریں نہیں ہیں نہ اسلئے قاعدہ کے پڑھانے کے لیئے ا سے انڈا - ب سے بکری کہنے کی ضرورت تھی۔

درجہ ۴ - اسمیں سواد اُردو مولفہ مولوی محمد اسمعیل صاحب مرحوم پڑھائی جاتی ہے - یہ اُردو کی حیثیت سے عمدہ کتاب ہے - نظم و نثر مناسب ہر قسم کے مضامین کا خیال رکھا گیا ہے - زبان بامحاورہ اور فصیح ہے مگر درجہ ۳ کی ریڈر کے ساتھ اسکی مواصلت ایسی ہی ہے جیسے حریر میں ٹرے ٹاٹ کا پیوند - میں تجربتاً لکھتا ہوں کہ جو لڑکے درجہ ۳ پاس کر کے آتے ہیں پڑھ نہیں سکتے عرصہ تک انکو محض پڑھنے کی تعلیم دی جاتی ہے - ایک سال کی مدت کورس کی زیادتی، فیل ہونے کا خوف نہ پوچھیئے کیا حالت ہوتی ہے اُن دشواریوں کا ذکر ہم آیندہ کریں گے -

درجہ ۵ و ۶ - میں ادیب اُردو مولفہ جناب مولوی محمد اسمعیل صاحب مرحوم پڑھائی جاتی ہے - میری سمجھ میں یہ کتاب درجہ ۷ کی کتاب سے بہت پیچھے ہے یعنی فائینل ریڈر جو درجہ ۷ میں پڑھائی جاتی ہے - اسکے پڑھنے اور سمجھنے کے لیئے تیار نہیں کرتی مضامین اچھے ہیں اور ہر موضوع کے ہیں -

درجہ ۷ - اسمیں فائنل ریڈر ہے جسمیں میرامن صاحب کی "باغ وبہار" مرزا رجب علی بیگ کا فسانۂ عجائب" "غالب مرحوم کی اُردوے معلی" "پنڈت رتن ناتھ سرشار" کی سیر کوہسار" "مولوی نذیر احمد صاحب و سر سید صاحب کے مضامین" "حالی صاحب کا مقدمہ شعر و شاعری" حکیم ناصر علی صاحب دھلوی اڈیٹر صلائے عام کے چند مضامین - غرض ابتدا سے لیکر انتہا تک تمام چوٹی کے انشا پردازوں کے مضامین جمع کئے گئے ہیں - اسی طرح نظم میں جملہ استادان سخن کے کلام کے نمونے موجود ہیں یہ کتاب پچھلے کورسوں کو دیکھتے ہوئے ایسی ادق ہوگئی ہے کہ بیان سے باہر ہے ایسے لڑکے جنھوں نے پانچ سال تک ابتدائی تعلیم میں ایک لفظ بھی فصیح اُردو کا نہ پڑھا ہو وہ کہاں تک ایسی کتابوں میں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں یہ جواب کہ انکا پاس کرنا انکی کامیابی کی دلیل ہے درست نہیں کیونکہ جس طرح پاس کرائے جاتے ہیں اُنکا جی ہی جانتا ہے - کورس کے علاوہ اس قسم کے مضامین خاک اُنکی سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ قابلیت اور چیز ہے طوطے کی طرح رٹ لینا اور بات، حالت یہ ہوتی ہے کہ صحیح املا تک نہیں لکھ سکتے - ایک خط میں بہت سی غلطیاں موجود - بولنے کا شعور نہیں - غیر درسی کتب کے امتحان پر یہ اچھی طرح روشن ہے کہ لڑکوں میں کہاں تک لیاقت ہوتی ہے -

ایسی تعلیم جسکی بنیاد بالکل کھوکھلی ہو کہاں تک صحیح کہی جاسکتی ہے اسکا انجام اُردو سے نفرت اور اس تعلیم سے وحشت پر مبنی ہوتا ہے - میرا مدعا یہ ہرگز نہیں ہے کہ اوپر کی کتابیں آسان کردی جاویں بلکہ یہ استدعا ہے کہ نیچے کی کتابیں ایسی کردی جاویں کہ لڑکے علی الترتیب اوپر کی کتابوں کی تعلیم کے لئے تیار ہوتے رہیں - اب لگے ہاتھوں دوسرے سبجکٹ کو بھی ملاحظہ فرمایئے -

حساب کے موجودہ کورس میری دانست میں بہتر ہیں نہ اتنے آسان ہیں نہ مشکل مگر ایسے سوالات کے ترمیم کی ضرورت ہے جنکی زندگی میں ایک عام آدمی کو ضرورت نہیں -

جغرافیہ کی تعلیم مڈل تک پہونچتے پہونچتے تمام دنیا کی ہو جاتی ہے - حالانکہ اسکی ضرورت نہیں جغرافیہ کی تعلیم ہندوستان یا زیادہ سے زیادہ ایشیا تک محدود ہونی چاہئے اوپر کے درجوں میں ہندوستان تک کافی ہے اور مڈل کے درجوں میں زیادہ سے زیادہ ہندوستان اور ایشیا تک کی ضرورت ہے تمام دنیا کے جغرافیہ جاننے سے لڑکوں کو کچھ فائدہ نہیں یہ بات روشن ہے کہ اردو ہندی کی تعلیم

غریب ہندوستانی لڑکے ہی پاتے ہیں سو اُنکے تعلقات تمدنی یا معاشرتی اپنے ضلع یا صوبہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ تمام دنیا کے ارضی حالات پیداوار۔ ندی۔ جھیل۔ پہاڑ کے ناموں سے غالبًا زندگی بھر فائدہ نہیں اُٹھاتے پھر اگر اُنکے مناسب حال تعلیم دی جاوے تو زیادہ مفید ہو اور اُسکے بجائے اُن اوقات میں جو دریا۔ پہاڑ۔ جھیل۔ مشہور شہر۔ آب ہوا۔ رقبہ۔ آبنائے۔ خاکنائے۔ راس۔ بندرگاہ وغیرہ کے رٹنے میں صرف ہوتے ہیں کوئی مفید کام سکھایا جائے۔

کوئی شخص ایسا نہ ملیگا (اور اگر ملیگا تو خال خال) کہ جسنے مڈل پاس کرنے کے بعد بھی کہیں کا جغرافیہ یاد رکھا ہو۔ ہم ایک دیہات کے رہنے والے "امریکہ" "افریقہ" "اسٹریلیا" میں کیوں پریشان پھریں وہاں کے ندی پہاڑ کو کیوں یاد کریں وہ ہمارے کس کام آسکتا ہے۔

اگر کوئی جغرافیہ داں ہونے کی حیثیت سے یہ علم سیکھنا چاہے تو اُسکے لئے علیحدہ اسکول ہونے کی ضرورت ہے جہاں جغرافیہ کی تعلیم خاص طور پر ہوتی ہو۔ ایسے اسکول میں اسقدر جغرافیہ کی تعلیم بالکل ناموزوں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسمیں لڑکے زیادہ ناکامیاب ہوتے ہیں۔ تاریخ پر نگاہ ڈالیے۔ ہے تو بہتر مضمون۔ مگر جس پیمانہ پر تعلیم ہوتی ہے درست نہیں۔ مارسڈن صاحب نے کتاب کیا لکھی ہے۔ ہندو مسلم کے نفاق اور آپس کے جھگڑے کے بیج بونے کا آلہ بناکر بچوں کے ہاتھ میں دیدیا ہے ایک ہندو لڑکا مڈل پاس کرنے کے بعد اسیقدر یاد رکھتا ہے کہ علاؤالدین بدکار۔ محمد تغلق مجنوں اورنگ زیب ہندو کش اور متعصب تھا۔

کیا تو اریخ سے ایسی تعلیم حاصل کیجاتی ہے کہ واقعات سے نتیجہ اخذ کرسکیں۔ کسی بُرے نتیجہ سے عبرت حاصل کریں۔ اور اچھی تجربات سے زندگی میں فائدہ اُٹھائیں۔ ہرگز نہیں۔ میری دانست میں تواریخ رٹانے سے ایسے فوائد حاصل کرنے کا ملکہ پیدا کرانا بہتر تھا۔ اگر لڑکوں کو مورخ بنانا ہے تو خیر۔ اگر اخلاق سدھارنا یا مذکورہ بالا فوائد حاصل کرانے ہیں تو اخلاق سدھارنے والی تاریخیں پڑھائی جائیں۔ ایسے قصوں سے پرہیز واجب ہے جس سے نفسانیت میں ترقی ہو۔ اسکے علاوہ اتنی مختصر تاریخ سے لڑکے مورخ بھی تو نہیں ہوسکتے۔ ہاں آپس کے نفاق کے لئے ضرور سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ مضمون ایسا ہے جسپر خاص طور پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے جسپر انشاء اللہ پھر کبھی لکھوں گا مضمون کی طوالت کی وجہ سے یہاں نظر انداز کرتا ہوں۔

جامیٹری - اگر فرضی لکیروں، مثلثوں، ذوار بعۃ الاضلاعوں یا متوازی الاضلاعوں کے بنانے و برابر کرنے کا ذریعہ ہے تو تضیع اوقات ہے - اور اگر علت معلول سے بحث - ترتیب قائم کرنا، استدلال پیش کرنا، نتیجہ اخذ کرنے کا مادہ پیدا کرنا مقصود ہے تو بہت بہتر ہے کیا ایسا ہوتا ہے؟ واقعات اسکے شاہد نہیں - پھر فرضی لکیروں سے فائدہ - ہم اس کامیابی سے خوش نہیں کہ لڑکے مڈل پاس ہو جاتے ہیں - ہم تو جب جانیں کہ اس سبجکٹ میں کامیابی ہوئی کہ جب ہر معاملات میں استدلال و ترتیب و ثبوت کا دھیان رکھیں -

ابتدائی تعلیم کی ترقی میں تنزلی کے آثار

موجودہ تعلیم کے بارے میں بہت کچھ عرض کر چکا اب اسکے انجام کی ایک دھندلی سی تصویر بھی ملاحظہ فرمایئے - غالباً دسمبر کے نمبر میں ڈسٹرکٹ گزٹ اعظم گڈھ نے تعداد طلبہ میں بمقابلہ سال گذشتہ ۲۱ نمبر فیصدی کی کمی دکھلا کر افسوس ظاہر کیا تھا، میرے نزدیک یہ کمی تعداد تعجب انگیز نہیں بلکہ تعجب یہ ہے کہ صرف اسیقدر کمی کیوں ہوئی - حصول تعلیم میں بظاہر دو فائدے ہیں - پہلا فائدہ یہ ہے کہ لڑکے تعلیم پا کر معاش حاصل کرنے اور زندگی آرام سے بسر کرنے کے قابل ہو جائیں - دوسری غرض یہ ہوتی تھی کہ تعلیم ایک جوہر لطیف ہے اسکا حاصل کرنا انسان کا فرض ہے مگر ایسے لوگ یہاں کم ہیں - یہ اغراض عام تعلیم کے ہیں - اردو مڈل کی تعلیم تین گروہوں پر مشتمل ہے - اول وہ غریب گروہ جنکا پیشہ دفتری ملازمت ہے - دوسرے عام پیشہ ور طبقہ کے افراد مثلاً لوہار - بڑھئی - حجام - دھوبی وغیرہ وغیرہ تیسرے وہ لوگ جو تعلیم کو جوہر لطیف سمجھکر حاصل کرتے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں - اب دیکھنا ہے کہ تینوں کے اغراض کہاں تک پورے ہوتے ہیں -

طبقہ اول کو لیجیے - پہلے مڈل پاس کر کے مختاری - وکالت - ڈپٹی کلکٹری تک پہونچنا ممکن تھا - اور یہی خیال ایسا تھا جو انکو مجبوراً ادھر متوجہ کرتا تھا - مگر اب یہ حالت ہے کہ مڈل پاس کو اچھی سائیسی بھی نہیں ملتی - پھر اس طبقے کے افراد کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے -

دوسرا طبقہ جس نے اپنے پیشہ پر اردو مڈل کو ترجیح دے رکھی تھی اور انکی امیدیں طبقہ اول کو دیکھکر متلاطم تھیں - لیکن اب وہ دیکھ رہے ہیں کہ مڈل پاس کرنے سے کوئی گنا فائدہ انکے پیشے میں ہو پھر وہ ادھر کیوں راغب ہونے لگے - اگر یہ تعلیم انکے پیشہ میں معاون ہوتی تو خیر اپنے پیشہ کی ترقی

کے خیال سے تعلیم حاصل کرے مگر نہ تو اسمیں زراعت کے اصول کی تعلیم ہے ۔ نہ تجارت کے گر۔ لوہار۔ بڑھئی وغیرہ وغیرہ کے کام سکھائے جاتے ہیں ۔ پھر یہ گروہ بھی ایسی تعلیم سے بیزار نہو تو کیا کرے۔

اب رہگیا تیسرا طبقہ ۔ یہ طبقہ متوسط الحال اور اُمرا کا ہے جنکو ضروریات زندگی ۔ سے فراغت ہے وہ زیادہ تر اپنے لڑکوں کو انگریزی کی تعلیم دیتے ہیں ۔ اگر کسی باخدا کے دل میں آگیا اور طبیعت مذہبی تعلیم کی طرف مائل ہو گئی تو گھر پر معمولی تعلیم دیکر کسی عربی اسکول یا سنسکرت کے اسکول میں بھیجدیا انکو اس گاؤ خر سے تعلق نہیں ۔

اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ موجودہ تعلیم کا کیا حشر ہونے والا ہے ۔

منظور الحق کلیم اعظم گڈھی

کہاروں کا گیت

(مسز سروجنی نائیڈو)

آسانی اور نہایت آسانی سے ہم اُسکو لئے جارہے ہیں ۔ وہ ہمارے نغموں کی فضا میں اس طرح جھوم رہی ہے جس طرح پھول نسیم سحر کے جھونکوں سے ۔

وہ مثل اُس طائر کے ہے جو سطح آب سے ملا ہوا اڑ رہا ہو وہ اس ہنسی کی طرح ہے جو خواب راحت میں اکثر ہونٹوں پر کھیلا کرتی ہے ۔

خوشی اور نہائت خوشی سے ہم گاتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہے ہیں ۔ ہم اُسکو نہایت آہستگی سے لئے جا رہے ہیں اور وہ شبنم کے قطرے کی طرح ہمارے نغموں کی جھرمٹ میں چمک رہی ہے ، اور اس طرح ادھر اُدھر جھک رہی ہو جس طرح سورج کی کرن سمندر کے مدوجزر میں موجوں سے کھیلتی ہے ۔

آسانی اور نہایت آسانی سے ہم اُسکو گیت گاتے ہوئے لئے جارہے ہیں ۔ ہاں ہم اُسکو دھاگے میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح نہایت آسانی سے لئے جارہے ہیں ۔

(ترجمہ) ثاقب کانپوری

جول سیمون

خدا کی قدرت کاملہ کا یہ ایک عجیب کرشمہ ہے کہ وہ ممتاز ہستیاں جو ملک اور قوم کے لئے مایۂ ناز ہوتی ہیں اور اپنے علم و فضیلت کی وجہ سے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیتی ہیں اکثر و بیشتر نہایت ہی تاریک اور گمنام گوشوں سے نکلتی ہیں لیکن اُنکی خداداد عقل و ذہانت اُنکو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے اور قدرت کا فیاض دست کرم اُنکو گوشۂ گمنامی سے نکال کر شہرت دوام کے بامِ رفیع پر لا بٹھاتا ہے۔

اِنہیں خوش نصیبوں میں فرانس کے فائد اعظم سیمون کا نام بھی شامل ہے جو ایک نامور عالم و فاضل مصنّف و مؤلف ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست سیاسی مدبّر بھی تھا۔

بعض مستند اصحاب الرائے نے علم و فضل اور تدبّر کے اعتبار سے اُسکو اسلافِ اسلام کے بعض مسلم الثبوت مشاہیر سے تشبیہہ دی ہے۔ جنکے تبحر علمی اور سیاست دانی کا ایک زمانہ قائل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ حضرات محض ذاتی جد و جہد اور ذوق شوق کی رہنمائی سے مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے اور سیمون ایک ایسی ترقی یافتہ قوم میں پیدا ہوا جسکے خمیر میں تعلیم و تربیت کا جزو غالب تھا۔ اور جو اہل علم و ہنر کی بطریق احسن حوصلہ افزائی کرتی تھی بلا شبہ سیمون کا اسقدر اوج ترقی پر صعود بہت کچھ اُس اصلاح یافتہ طریقۂ تعلیم و تربیت کا ممنون تھا۔

وہ صوبۂ لوریان کے ایک معمولی گانوں میں ایک غریب کسان کے یہاں پیدا ہوا جو محض کاشتکاری پر بسر اوقات کیا کرتا تھا۔ کچھ بڑا ہوا تو ایک ابتدائی مدرسہ میں بٹھا دیا گیا۔

اُس زمانہ میں غربا کے بچے مدرسے میں بڑی بے سرو سامانی سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جول سیمون بھی انہیں مصائب میں مبتلا تھا لیکن وہ اپنی اُولوالعزمی و استقلال اور طبعی ذوق و شوق کے باعث ان مشکلات سے ذرا متاثر نہیں ہوا بلکہ تمام ناگزیر مشکلات پر غالب آ گیا۔

اُسنے فان اور لوریان کی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کی اور بالآخر فارغ التحصیل ہو کر خود بھی مدتوں انہیں مدارس میں درس دیتا رہا۔

سب سے پہلے وہ تحصیل علم سے فارغ ہو کر سنہ ۱۸۳۲ء میں مدرسہ رین میں معلم مقرر ہوا۔ اور سرکاری درسگاہوں کے عام دستور کے موافق ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں تبدیل ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ پیرس کے جامعۂ سعدیوں میں وہ فلسفہ و سائنس کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ایک عرصہ تک اسی جامعہ میں مقیم رہا مگر جب تعلیم کا معاوضہ اُسکے اخراجات کے لئے ناکافی ہوا تو اُسے گذارہ کے لئے دوسرا ذریعہ بھی اختیار کرنا پڑا۔ چنانچہ اُسنے فرصت کے اوقات میں تصنیف و تالیف اور اخبار نویسی کا کام شروع کر دیا اور نو برس تک اسی طرح پر اپنی زندگی کے ایام گذارے۔ اس عرصہ میں وہ ایک زبردست صحیفہ نگار اور مستند انشاپرداز بن گیا۔

پہلے پہل اُسنے "برئین" اور "عالمین" میں لکھنا شروع کیا اور اسی طرح مختلف اخبارات و رسائل میں نامہ نگاری کرتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ دنوں "اسیکل" اور "النزلیس" کی اسسٹنٹ اڈیٹری اور سنہ ۱۸۷۵ء سے سنہ ۱۸۸۰ء تک چیف اڈیٹری کا کام انجام دیتا رہا۔ سنہ ۱۸۷۱ء سے سنہ ۱۸۸۱ء تک "شئون الفولو" اسی کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اسکے علاوہ اور بھی متعدد رسائل و اخبارات مثلاً "الدیا"، "البیوت" وغیرہ بھی اُسی کی زیرِ ادارت شائع ہوتے رہے۔

عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ "حالات اور زمانہ اپنے موافق لوگوں کو پیدا کر لیتے ہیں" یہ قول سیمون پر بالکل راست صادق آتا ہے۔

اگر حکومت فرانس میں اختلال پیدا نہ ہوتا اور سلطنت کا استبداد اپنی حد سے نہ گذر گیا ہوتا تو اسمیں شک نہیں کہ سیمون محض ایک پروفیسر اور مصنف و مؤلف کی زندگی بسر کرتا۔ مگر وطن کی محبت اُسے میدان سیاست میں کھینچ لائی اور مجبوراً اُسے قوم و ملک کا رہنما بننا پڑا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۱ء میں جبکہ امپیریلزم (شہنشاہیت) کا خاتمہ ہو گیا تو سوریوں کے میدان میں اُسنے ایک زبردست لیکچر دیا جو بجلی کی طرح تمام ملک میں پھیل گیا اور اُسکی مزید شہرت کا باعث ہوا۔ اُسنے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا۔

میں اسوقت آپ کے سامنے کوئی اخلاقی درس دینے کے لئے نہیں کھڑا ہوا ہوں کہ آپ نہیں

اور اُسے یاد کریں بلکہ میرا فرض منصبی مجھے اس امر پہ مجبور کرتا ہے کہ میں آپ کے لئے مثال بن جاؤں تاکہ آپ بھی اُس جذبے کو اپنے دل میں محسوس کرنے لگیں جو میرے دل میں موجود ہے - عنقریب ہی خوا ان فرانس کا اجتماع ہوگا اور حکومت نے ابتک جو کچھ کیا ہے اُسکی مخالفت یا تائید کیجائے گی - اگر تائید کی گئی تو میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ جو آواز ان متفقہ آراء کے خلاف ہوگی وہ میری اور صرف میری آواز ہوگی "

اس تقریر کی وجہ سے وہ پروفیسری سے معزول کیا گیا اور عرصہ تک بے روزگار رہا - یہ زمانہ اُسنے نائت میں تاریخی مباحث میں منہمک رہکر بسر کیا -

انقلاب فرانس کے بعد سیمون بھی نظام حکومت میں شریک ہوگیا اور وہ وزیر معارف و تعلیم مقرر کیا گیا - سیمون اصلاح تعلیم کا زبردست حامی تھا اُسنے اپنے زمانۂ حکومت میں جبریہ ابتدائی تعلیم کی ایک تجویز پیش کی اور لوگوں کو اپنا موافق بنا لیا - پھر کچھ دنوں بعد وہ اس عہدہ سے مستعفی ہوگیا -

سیاسی مصروفیتوں کے باوجود وہ علمی مشاغل میں برابر دلچسپی لیتا رہتا تھا - چنانچہ پیرس کی ایک خالص علمی انجمن کا (جو فرانس کے ۴۰ علماء پر مشتمل تھی) ممبر منتخب ہوا -

اُسی زمانہ میں پروسیا اور فرانس کے درمیان لڑائی چھڑنے والی تھی اُسنے بیچ میں پڑ کر صلح کرانے کی کوشش کی - مگر یہ اُسکی پہلی کوشش تھی جس میں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا -

۱۸۶۳ء میں مجلس واضع قوانین کا رکن منتخب کیا گیا - اُسنے اپنے زور بیان اور قوت استدلال سے اُن لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا جو اُسکے حد درجہ مخالف تھے - اُسنے اپنی قوم پر ثابت کردیا کہ وہ قوم کی پستی میں گری ہوئی خواتین کو ذلت و فلاکت سے نکالنے میں اُن کا ممد و معاون ہے اور مسئلہ تعلیم و تعلم اور نظام حکومت میں اصلاح کا دل سے خواہاں ہے - وہ اکثر علمی، ادبی اور سیاسی انجمنوں کا صدر مقرر ہوتا رہا، بالآخر ۱۸۷۶ء میں وزیر اعظم منتخب ہوا -

یہ وہ عظیم المرتبت شخص تھا جسکے ایک پہلو میں علم اور دوسرے پہلو میں عملی سرگرمی تھی اُسمیں علم و تہذیب تدبر دانائی اور عزم و استقلال یہ ایسی صفات تھیں جنکی وجہ سے وہ باطل پرست دشمنوں سے کبھی مخوف نہ ہوتا تھا اور نہ بڑے سے بڑے مصائب و آلام اور حوادث اُسکو رہ راست سے

ہٹا سکتے تھے - وہ ایک مستقل مزاج انسان تھا اور جو کہتا تھا ہمیشہ اُسی پر قائم رہتا تھا - آپ دیگر اقوام میں اُسکی سی مثالیں پا سکتے ہیں مگر جس چیز نے اُسے سب سے زیادہ ممتاز کیا وہ اُسکا وسیع اخلاق اور جذبۂ قومی تھا -

اُسنے صرف اپنی تحریر کے سہارے سے زندگی بسر کی اور باوجود مناصب جلیلہ پر فائز ہونے کے اُسکی گذر اوقات کی ہمیشہ یہی صورت رہی - اگر وہ اخلاق اور خدمت قومی کے اُس بلند رستہ سے جسپر وہ ہمیشہ سے چل رہا تھا نیچے اُترکر ذرا سی خود پرستی کی کوشش کرتا تو یقین جانیئے کہ جمہوریت فرانس کی صدارت اُسکے قدموں کے نیچے تھی اور جس طرح تحریر و تقریر میں اُس نے اپنا لوہا منوا لیا تھا اسی طرح یورپ بلکہ ساری دُنیا کے مسلم الثبوت اُلوالعزم بادشاہوں میں اُسکا شمار ہوتا -

بلاشبہ اُسنے ایک کامیاب اور بہترین زندگی گذاری - خصوصاً اُسکی زندگی کے آخری ایام قوم و ملک کے لیئے بہت زیادہ مفید ثابت ہوئے - آخر عمر تک صحیفہ نگاری ہی اُسکا ذریعۂ معاش رہا - حتیٰ کہ فرانس کے ایک مشہور اخبار نے اُسکا ایک آرٹکل چھاپا جو اُسنے مرض الموت میں لکھا تھا اور جسدن وہ شایع ہوا ہے اُسکا لکھنے والا اس دنیائے فانی کو خیرباد کہ چکا تھا،

نوشتہ بماند سیہ بر سفید   نویسندہ را نیست فردا اُمید

اُسکی مصنفات و مؤلفات اور مضامین کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے - سب سے پہلے جن کتابوں کو اُسنے شایع کیا وہ یہ ہیں - "الواجب" "الدین الطبیعی" "الحریۃ المدنیۃ" "الحریۃ السیاسیۃ" تین مؤخرالذکر کتابوں کا ایک ہی موضوع ہے جسکو مذکورۂ بالا تین عنوانوں میں تقسیم کیا ہے - اور اُسکے ذریعہ عوام کو جمہوریت کی تعلیم دینے اور اُنکے قلوب میں آزادی و حریت کی محبت بھرنے کی کوشش کی ہے -

اسکے علاوہ اُسنے اور بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں "کتاب الفلسفۃ" "الطبقۃ العاملۃ" "المدرسۃ اصلاح التعلیم الثانوی" "الوطنی الصغیر" "موت سقراط" "الفلسفۃ الاسکندریۃ" "المرأۃ فی قرن العشرین" "التعلیم المجانی الاجباری" اُسکی تصانیف اور مضامین اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اُنکا لکھنے والا اپنے اندر ایک شریف دل رکھتا تھا اور ایسا دل

ظلم وستم سے متنفر تھا۔ جو لوگوں کو باہمی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی رغبت دلاتا تھا۔ اور جو مایوس اور تنگ دست لوگوں کی اصلاح کے لئے بے چین تھا۔

اُسکی تصانیف وتالیفات سے ثابت ہوتا ہے کہ سیمون ایک معقول فراخ دل غیر متعصب مذہبی آدمی تھا۔ اُسکی مذہبیت میں عقل وحکمت کی تمزیج نے اُسکو صحیح معنوں میں مکمل انسان بنا دیا تھا۔

یہ اُن مخصوص ہستیوں میں سے ہے جسکی نظیر آسانی سے نہیں ملتی۔ خصوص اس زمانہ میں جبکہ یہ بات ناممکن سی ہوگئی ہے کہ کوئی شخص مذہب سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ دنیا سے بھی دلچسپی رکھے۔ عام رونغ ہے کہ جو شخص مذہبی ہوگیا اُسے دنیاوی معاملات سے کوئی تعلق نہ رہا۔ اور جسکا دماغ فلسفہ وحکمت سے روشن ہوگیا اُسکو خدا کی خدائی میں بھی شبہ ہونے لگا اور اپنے محدود دماغ کو کائنات کا مخزن اسرار سمجھنے لگا۔ لیکن سیمون کی ہستی عجیب وغریب ہستی تھی وہ فلسفہ اور علم الحقائق کا جتنا دلدادہ تھا اُس سے زیادہ مذہب اور ملت کا گرویدہ تھا۔ قابل ستائش ہے وہ ذات جسمیں سیمون کی سی ذہانت وفطانت موجود ہو مبارک ہے وہ قوم اور وہ سرزمین جسمیں سیمون کے سے سپوت پیدا ہوں۔ سیمون آزادی کو پسند کرتا تھا وہ پابندیوں سے ہمیشہ محترز رہا۔ وہ ملک وقوم کو حرّیت وآزادی کی طرف بلاتا تھا۔ اُسکے قول وفعل میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ وہ انسانیت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ وہ تمام صفات جو ایک انسان کے لئے ضروری ہیں اُس میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

قوم کی جانب سے اُسکی اِن خدمات جلیلہ کا اس صورت میں صلہ دیا گیا کہ فرانس کے دارالسلطنت پیرس میں جمہوریت کی زیر سرپرستی اُسکا ایک مجسمہ نصب کیا گیا اور (اُس کی نقاب کشائی کے موقعہ پر) فرانس کے بزرگترین افراد مجتمع ہوئے اُنھوں نے اُسکی زبردست علمی فضیلت، سیاسی تدبر اور ملکی وقومی خدمت کی بہترین الفاظ میں مدح وستائش کی خصوصاً اُسکی خوش اخلاقی اور فضیلت علمی کا خاص طور سے مرثیہ پڑھا گیا۔

محمد حسین حسّان بلی بھیتی

دلچسپی

بہت سے آدمیوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا دلچسپی کی جگہ نہیں ہے - تعجب کی بات ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ذرہ ذرہ میں لطف اور قدم قدم پر دلچسپیاں موجود ہیں - دنیا کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا غیر دلچسپ جگہ ہے - اصل بات یہ ہے کہ یہی عقیدہ آدمیوں کو دنیا کی دلچسپیوں سے محروم رکھتا ہے دنیا کے لوگ مردہ دل ہیں اور زندگی کی قدر نہیں جانتے بلکہ بہت سے تو لطف اور دلچسپی کی چیزوں سے گریز کرتے ہیں اور اپنے جسم اور روح کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے ہیں اور اسکو ذریعہ بہتری اور کلید آسائش سمجھتے ہیں - اسمیں نہ دنیا کا قصور ہے نہ آدمیوں کا - بلکہ یہ نادانی اور غلط خیالی کا نتیجہ ہے اگر دنیا کے لوگ دنیا کو دلچسپی کی جگہ خیال کرنے لگیں اور اپنی توجہ کو بجائے دردناک منظر میں لگانے کے دلچسپی کی کھوج اور لذت کی غور فکر میں صرف کریں تو ہر شئے ہر فعل ہر منظر میں انکو لطف معلوم ہونے لگے - بات یہ ہے کہ دلچسپی اور لذت کا دارمدار کسی خاص چیز پر نہیں ہے بلکہ دلچسپی اور لذت کا مادہ ہر انسان کی طبیعت میں ہوتا ہے - اور وہ مادہ غور کرنے سے بڑھتا ہے - جب انسان کی طبیعت خوش ہوتی ہے ہر ایک چیز بھلی معلوم ہوتی ہے - جب طبیعت میں پژمردگی ہوتی ہے اسوقت دلکی مسرت آفریں چیزیں بھی بری معلوم ہوتی ہیں - اور جتنا کسی چیز کی عمدگی یا اسکی برائی پر غور کیا جاتا ہے اُتنا ہی اُسکا اچھا یا برا اثر طبیعت پر پڑتا ہے - اسکی تصدیق ذاتی تجربوں اور عالموں کی رائے سے ہوتی ہے - بائیرن کا قول ہے کہ دنیا کی کوئی چیز لطف سے خالی نہیں - وہ کہتا ہے " ہر جگہ ہر چیز میں لطف ہے - ویران جنگل اور طوفانی سمندر میں بھی " بیشک یہی ہے بلکہ میں تو کہونگا کہ درد اور دُکھ میں بھی لطف اور دلچسپی موجود ہیں - ہم دیکھتے ہیں کہ بہت لوگ درد اور دُکھ میں بھی خوش رہتے ہیں - لاکھوں آدمیوں نے سچائی اور ایمان کے موقعوں پر تکالیف کو آرام پر ترجیح دیا ہے - بعض آدمیوں کا خیال ہے کہ تارک الدنیا لوگ عالم اور تجربہ کار ہوتے ہیں اور یہ سمجھ کے ترک دنیا کرتے ہیں

کہ وہ دلچسپی کی جگہ نہیں۔ مگر یہ کہنا غلط ہے۔ چند آدمیوں کا کسی چیز کو ترک کر دینا یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ چیز غیر دلچسپ ہے۔ بلکہ بعض آدمیوں کو ترک لذت ہی میں لذت ملتی ہے۔ پس یہ کہنا کہ دنیا سے گھبرا کر آدمی تارک الدنیا ہوتے ہیں غلط ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ بعض حالتوں میں دلچسپی کی چیزیں بدل جاتی ہیں۔ خوشی کے وقت کوئی اور چیز دلچسپ ہوتی ہے تو رنج کی حالت میں کوئی اور چیز پسند ہوتی ہے۔ ایک چیز سے دل کا ہٹ جانا اور دوسری چیز سے اُنس پیدا ہو جانے کے یہ معنی ہیں کہ وہ چیز غیر دلچسپ ہے۔ اگر بالفرض یہ بھی مان لیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ دنیا دلچسپ جگہ نہیں۔ اگر دنیا میں دلچسپی نہو تو ایک منٹ بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

انسان کی رغبت دنیاوی چیزوں سے اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ کسی اور شخص کا اسمیں حصہ لینا گوارا نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ ہر چیز اُسی کی ہو رہے اور اس خیال سے کہ کوئی مخل نہو وہ دوسروں کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور کبھی کبھی اُنکو ہلاک کر ڈالنے کی فکر کرتا ہے۔ اور اُسکی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اُس چیز سے تنہا متمتع ہو۔ انہیں خود غرضانہ خیالات اور غیر منصفانہ روش کی وجہ سے دنیا میں مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ اور دلچسپی نظر نہیں آتی۔ ورنہ دنیا ایسی دلچسپ جگہ ہے کہ باوجود تکالیف کے بھی آدمی اُسکو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ جسوقت کوئی آدمی خلاف عقل اور خلاف انصاف کام کرتا ہے اور دوسروں کو (جو اُسی کی طرح حقدار ہیں) بعض باتوں سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو دنیا اُسکے لئے دوزخ ہو جاتی ہے اور جب وہ اس فلسفہ کو سمجھ جاتا ہے کہ دنیا سب کے لئے ہے اور جتنے آدمی اُسکی دلچسپی میں شریک ہوتے ہیں اُتنی ہی اُسکی دلچسپیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے تو دنیا اُسکی نظر میں جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ صرف صوفی منش حضرات یا وہ لوگ جنکے خانگی حالات دنیا کو غیر دلچسپ بناتے رہتے ہیں اور وہ زیادہ غور و خوض کے عادی نہیں ہوتے۔ تارک الدنیا ہو جاتے ہیں اور تنہائی میں لطف اور مزہ اُٹھاتے ہیں۔

حقیقتاً دنیا کا کوئی حصہ دلچسپی سے خالی نہیں اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ دنیا میں دلچسپی نہیں ہے تو پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ارباب فہم اپنے کو مصائب کا خوگر بنا لیتے ہیں۔ آخر کار دکھ۔ دکھ نہیں رہتا بلکہ سکھ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دنیا میں دلچسپی نہوتی یا دلچسپی پیدا ہونے کی امید نہ ہوتی تو انسان کوئی کام نہ کرتا نہ بڑے بڑے

شہر آباد ہوتے اور نہ اختراعات جدیدہ سے سامان نشاط میں کوئی افزائش کی کوشش کرتا غرض انسان جو کچھ کرتا ہے اپنی دلچسپیوں کے لئے کرتا ہے۔ ورنہ بیفائدہ اپنی سعی بے سود سے اپنے نفس کو دکھ نہ پہونچاتا۔ قانون قدرت کا بھی اقتضا یہی ہے کہ انسان دنیا کی چیزوں سے مسرت حاصل کرے اور انھیں اپنے لئے دکھ نہ بنائے۔ اس سے اسوقت بحث نہیں کہ بازاروں اور شہروں کے بنانے اور ایجادوں کے کرنے سے دلچسپیاں بڑھ گئیں یا گھٹ گئیں کیونکہ یہ فعل کے نتیجہ اور صحیح سلامت روی اور غلط کوشی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمیں ارادہ اور منشا رسے مطلب ہے اور وہ بتاتا ہے کہ انسان ہر فعل دلچسپی کی امید اور منشا سے کرتا ہے۔ اس خیال کا پیدا ہونا انسان کی فطرت میں داخل ہے گو اسکو علم نہو۔ اس بات کا ثبوت انسان کے فعلوں سے ظاہر ہوتا ہے وہ ہر خطرہ پر بچاؤ کی کوشش کرتا ہے اور گو وہ دنیا سے بیزار ہو پھر بھی جہاں تک ہوسکتا ہے بہتر زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دنیا میں اتنی دلچسپیاں ہیں کہ ہم انکو شمار نہیں کرسکتے۔ سیر و تماشہ کی دلچسپیاں تو بچہ بھی محسوس کرلیتا ہے مگر علاوہ انکے اُن چیزوں میں بھی جو تکلیف دہ معلوم ہوتی ہیں۔ بعض آدمیوں نے دلچسپی حاصل کی ہے۔ مثلاً جنگ اور خطرہ کے موقعوں پر بہادر لوگوں کو بہت دلچسپی ہوتی ہے لیکن بزدل انکو وبال جان سمجھتا ہے۔ کوشش کیجائے تو جسمانی تکلیف اور عزیزوں کی موت میں بھی ایک دلچسپی کا پہلو نکل سکتا ہے۔

سینٹ کرنٹیم صاحب فرماتے ہیں کہ "دنیا دراصل تماشہ گاہ ہے۔ یہاں کل سامان سوانگ کا ہے۔ اور دنیا کا ہر ذرہ اُسکا ایکٹر ہے۔ جو حالت یا جو منظر ہمارے سامنے ہے وہ تھیٹر کا سین ہے" واقعی اگر انسان غور کرے تو دنیا تماشہ گاہ معلوم ہوگی اور اُسکے ہر منظر میں اُسے ایک تماشہ نظر آئیگا۔ خواہ وہ اُسکے عزیز سے عزیز کی موت کا کیوں نہ منظر ہو۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں دلچسپی کی کمی نہیں مگر دلچسپی محسوس کرنے کے لئے قوت غور کی ضرورت ہے جو شخص یہ قوت رکھتے ہیں اُنکے لئے دنیا نہایت دلچسپ جگہ ہے۔ جو نہیں رکھتے اُنکے لئے وبال جان ہے۔ جو اس قوت کو رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں دنیا دلچسپ جگہ ہے۔ جو نہیں رکھتے وہ اسکو بدنام کرتے ہیں۔ بڑے دماغ والے جنمیں قوت خیال بڑی حد تک ہوتی ہے دلچسپی میں محو

ہتے ہیں اور کھانے پینے کی لذتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ بعض عالم ایسے گذرے ہیں جو کہتے ہیں کہ
تابوں کے مطالعہ سے زیادہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں۔ فلاسفروں کی فلاسوفی کی دلچسپیاں تو
ام طور پر پسندیدہ ہیں۔ پولیٹکل آدمی کہتے ہیں کہ دخل سیاست میں جو لطف ہے وہ کسی چیز میں
ہیں۔ کئی آدمی ایسے گذرے ہیں جو دلچسپی کی وجہ سے خیال میں ایسے محو رہتے ہیں کہ اہم سے اہم
مناظر انکے سامنے سے گذر گئے اور انھیں خبر تک نہوئی۔ اور اگر خبر ہوئی تو انھوں نے ادھر توجہ ہی
نہ کی۔ ہندوستان کے یوگیوں کی بابت مشہور ہے کہ وہ مراقبہ کے سیروں کے سامنے دنیا اور
اسکی ساری لذتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں ہزارہا چیزیں ہر مذاق کے آدمی اور ہر حالت کے
مناسب موجود ہیں لیکن اگر کوئی خود ہی دلچسپی کی چیزوں کو برا سمجھے اور بہرہ ور نہو تو کیا کیا جائے

نیلی چھتری (نام کتاب) میں بہرام کہتا ہے کہ اسکا کوئی منٹ ایسا نہیں جو دلچسپی نہو۔ وہ کہتا ہے
کہ "لوگ جو کہتے ہیں کہ دنیا غیر دلچسپ جگہ ہے۔ یہ انکی مردہ دلی کا سبب ہے۔ اگر دنیا کے آدمی
اسکی طرح مردہ دل نہوں اور زندگی کی قدر کریں تو قدم قدم پر دلچسپیاں موجود ہیں" وہ اپنے
خطرہ اور تشویش کی حالت کی دلچسپی کو جو وہ اسوقت محسوس کر رہا تھا۔ .... ان لفظوں
میں بیان کرتا ہے " ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے کسقدر لطف کے ساتھ وقت کٹا۔ تم کنور صاحب
سے باتیں کرنے میں مشغول تھے اور میں کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا کتاب کے قیمتی ورق پھاڑ رہا تھا
پھر تم مسز جے رام سے باتیں کرنے لگے۔ میں سوچتا تھا کہ وہ تمھیں راز کی باتیں بتا دے گی یا نہیں
بتلا دیا تو میرا کیا حشر ہوگا۔ سب بنا بنایا کارخانہ برباد ہو جائیگا۔ مجھے اس نوکر کا جسے خط دے
رکھا تھا کسقدر انتظار تھا۔ ایک منٹ اور نہ آتا تو مسز جے رام تمھیں حال بتا دیتی۔ لیکن خیر ہوئی
خط وقت پر پہونچ گیا۔ پھر یہ خیال ہوا کہ مسعود سمجھ جائیگا کہ یہ میری کارستانی ہے مگر مسعود اسقدر
زود فہم کہاں تھا۔ اسنے بڑی دیر میں مجھے پہچانا۔ جب تم نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ گھوڑا چڑھایا
کیا بتاؤں میں کسقدر خوش تھا۔ اتنے کم وقت میں اتنی باتیں ہو جانا کیا غیر دلچسپ زندگی
اسی کو کہتے ہیں؟ لوگ کام کرنا اور زندہ رہنا جانتے ہی نہیں" بظاہر یہ ایک فرضی افسانے کی
عبارت ہے لیکن حقیقتاً قابل قدر ہے۔ بیشک زندہ دل کے لئے ہر چیز دلچسپ ہے وہ ہر چیز کو
دلچسپ بنا سکتا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ وہ دنیا کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

مردہ دل آدمی نہ دنیا کے کام کا نہ دنیا مردہ دل کے کام کی - دنیا مردہ دل کے لئے وبال ہے - اور مردہ دل دنیا کے لئے بار دوش ہے -

بدقسمتی سے مردہ دل حضرات زندہ دلی کی خوبیوں کو تسلیم نہیں کرتے - اکثر جب کوئی کسی مردہ دل شخص کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے - معلوم وہ اپنی ابتر حالت ہونے میں کیا بہتری دیکھتا ہے - دانشمند آدمی کو چاہئے کہ ہر وقت ہر حالت میں بہتری کا خیال رکھے - اگر اُسکو کوئی صدمہ یا رنج پہونچا ہو - یا کوئی تکلیف روحانی یا جسمانی لاحق ہو تو اُسکے رفع کرنے کی کوشش کرے - اور اپنے اُن خیالات کو ان باتوں کی یاد سے الگ کرے جو اُسکی تکلیفوں میں روحانی طریقہ سے اضافہ کرتی رہتی ہیں - مصائب و حوادث میں انسان مردہ دل ہو جاتا ہے - اور اپنے پریشان کن خیالات میں مستغرق رہتا ہے بعض وقت جب کسی ایسی چیز کے دستیاب ہونے کی امید باقی نہیں رہتی جسکے لئے وہ کوشاں تھا تو انسان مردہ دل ہو کر بیٹھ جاتا ہے - مگر یہی غلطی ہے جو ہمارے تکلیف کی باعث ہے اور ہمکو دلچسپیوں سے محروم رکھتی ہے دنیا کوشش کی جگہ ہے یہاں ہمت ہار کر یا رنج منانے کے لئے نہیں بیٹھنا چاہئے - یہاں ہر مدعا کے لئے کوشش کرنا چاہئے اور ہر حالت میں ترقی کے لئے آگے بڑھنا چاہئے - افسردگی یا مردہ دلی سے - مصیبت راحت سے نہیں بدل سکتی - لیکن اگر خیال کو مسرور بنانے کی کوشش کیجائے تو مصیبت میں راحت کا پہلو پیدا ہو سکتا ہے، درد ہوگا مگر درد کا تکلیف دہ اثر زائل ہو جائیگا، بزم ماتم میں بھی طبیعت خوش رہیگی - مگر اسکے لئے اگر سب لوگ دلچسپی کا فلسفہ اچھی طرح ذہن نشین کریں تو پھر دنیا میں دلچسپی ہی دلچسپی نظر آئے - پھر اُنسے وہ غلطیاں بھی سرزد نہوں جنسے غیر دلچسپی اور درد اور تکلیف کے سامان پیدا ہوتے ہیں - اگر ہم دنیا کی حالت پر غور کریں - سمجھیں اور مدعا کے حاصل کرنے کی کوشش کریں تو معلوم ہو جائے کہ دنیا کیسی دلچسپ جگہ ہے - یہاں کیسی عجیب اور پر لطف چیزیں ہیں اور ہم کس طرح اپنی غلطیوں سے اُنکی دلچسپیوں سے محروم رہتے ہیں - واقعی اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو بہ آسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا بڑی دلچسپ جگہ ہے مگر ہمارے عقائد و افعال اُسے اکثر غیر دلچسپ ثابت کرتے رہتے ہیں -

ہری رام - رسل گنج علیگڈھ

پہاڑ کی سیر

انگریز لوگ پہاڑ جاتے ہیں کسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں - جہاں تک اُنھیں ہر قسم کی آسائش میسر آتی ہے یا اپنے لئے کوٹھی کرایہ پر لیتے ہیں جس پر روپیہ صرف کرنے میں دریغ نہیں کرتے - پہاڑ کے پانی کو ہوا نہیں سمجھتے - غذا اندازہ کی کھاتے ہیں - سیر و شکار میں وقت صرف کرتے ہیں ہر ایک پہاڑی اسٹیشنوں پر انکی برادری کے کلب بنے ہوئے ہیں جنمیں وہ داخل ہو کر لطف اُٹھاتے ہیں - اور نفع صحت حاصل کرتے ہیں اور تنومند ہو کر واپس آتے ہیں - ہمارے دیسی رئیس بھی اب پہاڑوں پر کوٹھیاں خرید کر یا کرایہ پر لیکر رہتے ہیں بعض انمیں گھوڑے کی سواری تو درکنار پیدل بھی چلنے سے عاری ہیں بعض پیدل چلنا ہی خلاف شان سمجھتے ہیں - لباس کے بناؤ چناؤ ملاقاتوں کے چکر - ٹی پارٹیوں اور کھانوں کی دعوت میں مصروف رہتے ہیں - انکی مستورات کسی کمرہ میں پابہ زنجیر ہو جاتی ہیں - اس طرح رئیس اور رئیسہ دونوں کی صحت خراب ہونے لگتی ہے مستورات تو تھوڑے دن کے بعد مکان پر واپس آجاتی ہیں اور رئیس بھی چند روز ڈاکٹروں کے زیر مشق رہ کر روپیہ ضائع کرکے واپس آتے ہیں - مگر ہو نہیں سکتا کہ سخت درجہ کی خشت کرکے خرچ کی میزان پوری کرتے ہیں - کسی رئیس کو انگریزوں کو کھلا پلا کر گاہے گاہے کچھ مل جاتا ہے - بعض کف افسوس ملتے رہتے ہیں - دوسرے تیسرے سال اُنکے ہاں دعوتیں کم ہو جاتی ہیں - اخبار اور ناول خوانی سے اوقات بسر ہونے لگتی ہے - دو چار سال کے بعد انکی طبیعت منغص ہو جاتی ہے -

ایک اور فرقہ تعلیم یافتہ حضرات کا جو لگاتار دماغی محنت سے اپنی صحت کھو بیٹھتا ہے آخر وہ اس سے مجبور ہو کر پہاڑی آب و ہوا کی ضرورت پڑتی ہے - ان حضرات کے کئی اقسام ہیں

اوّل - وہ صاحب جو کتابوں میں پڑھ چکے ہیں کہ ریاضت جسمانی ہر شکایت کی دوا ... یا تو اُنکے پاس زر نہیں کہ پہاڑ کے قیام کا صرف برداشت کر سکیں - یا دل نہیں کر

آمادہ ہوں۔ ایسے حضرات بہ یک بینی و دوگوش بستر اور دو چار جوڑے کپڑے اور دو چار برتن ہمراہ رکھ کر ایک ملازم ساتھ لے پیدل پہاڑ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ ریل کا کرایہ تو طوعاً کرہاً دینا پڑتا ہے۔ منزل بہ منزل دیوانہ وار چلے جاتے ہیں۔ روکھا سوکھا جو ملگیا کھا لیا۔ کسی دوکان پر فروکشی کا انتظام ہوگیا تو ایک کھاٹ لیکر پسوؤں اور کھٹملوں کی ایذا رسانی اور تکان سفر کے شکار ہوتے ہیں۔ خلاف عادت اتنی ریاضت کرتے ہیں جنکا نفع مشتبہ ہے۔ بہرکیف وہ واپس آکر سمجھتے ہیں کہ وہ پہاڑی سفر سے کئی من حرارت غریزی سے لے آئے ہیں۔ مکان پر پہونچکر بعض تو بیمار پڑ جاتے ہیں اور بعض محتاط طبع حضرات اپنی صحت کا کافی اہتمام رکھتے ہیں۔ سب سے زیادہ دلی تسلی انکو یہ ہوتی ہے کہ ہم کوڑیوں کے مول سیر کو مسار کر آئے اور کامل نفع صحت کا حاصل کر آئے اُن لوگوں پر جنھوں نے پہاڑ کے سفر کے لئے صرف کثیر اُٹھایا قہقہہ لگاتے ہیں۔

دوئم۔ وہ اصحاب ہیں جو ہمیشہ یہ کہا کرتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگوں میں مہمان نوازی کی خصلت ہمدردی اور فیاضی اور قوموں سے بہت کم ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ خود اس خصلت کے عادی نہیں۔ مہمان بننے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ مثلاً اس سال پہاڑ کا شوق چرّایا تو وہ پہاڑ پر چند دوستوں یا رشتہ داروں کو خط لکھیں گے کہ فلاں تاریخ کو ہم پہاڑ آویں گے امید ہے کہ آپ کے ہاں فروکشی کی گنجائش ہوگی۔ جواب تو تصور کیا جا سکتا ہے۔ یعنی آئیے تشریف لائیے گنجائش نکال لیجاوے گی۔ حضرت معہ ملازم روانہ ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک دوست اور عزیز کے یہاں دو دو چار چار دن مہمان رہکر ممنون اور مشکور فرماتے ہیں۔ اگر اتفاق سے تجارت پیشہ ہیں تو واں سے کچھ اشیا خرید کر کے وطن لیجاتے ہیں اور ریل کا کرایہ نفع میں نکال لیتے ہیں۔ جب کوئی صاحب سوال کریں تو ایک مقرر جواب ہے۔ میاں اب کی مرتبہ فلاں عزیز یا دوست کے درجن بھر خط آئے کہ ضرور بالضرور چند یوم اُنکے پاس پہاڑ پر آکر رہو۔ کیا کیا جائے دلداری کرنی ضروری ہے۔ اگر کوئی حضرت قانون پیشہ لیموں نچوڑ ہیں تو وہاں کے کسی نہ کسی طریق سے دو چار مقدمات پھانس لیتے ہیں۔ ہم خرما و ہم ثواب!

سوئم۔ وہ خسیس شوقین پہاڑ کے ہیں جو ادنیٰ سے ادنیٰ خرچ سے اعلیٰ سے اعلیٰ مفاد اُٹھانے ہوتے ہیں۔ ہمت پیدل چلنے کی نہیں۔ خدا نے کوئی دوست مہمان اُنکے حصہ میں نہیں دیا۔

کسی عزیز سے موافقت نہیں خسیسوں کے دوست کم ہوا کرتے ہیں۔ ایسے حضرات بہ صرف قلیل ترین پہاڑ کے سفر کا انتفاع اُٹھانا چاہتے ہیں۔

ایک صاحب کا ذکر ہے کہ وہ کسی ضلع میں وکیل تھے اُنھیں ایک انگریز کو جو پہاڑ سے ہٹا کٹا ہو کر واپس آیا تھا دیکھکر یہ خیال پیدا ہوا کہ پہاڑ عجیب جگہ ہوگی جہاں انسان دوبارہ جوان ہوجاتا ہے اب آپ نے تیاری شروع کی۔ پہلے گھر میں سے سب سے ہلکا ٹرنک تلاش کیا۔ اُسمیں دو قفل مزید لگوائے۔ پُرانی لوئیاں تلاش کیں اُسکا بستر بنایا۔ اب اس فکر میں ہیں کہ انٹر کلاس میں جاویں یا سکنڈ کلاس میں۔ دوسری فکر یہ تھی کہ ملازم کی ضرورت پڑے گی یا نہیں۔ پہاڑ جانے کا ارادہ بھی مستقل نہ تھا۔ طبیعت ڈانواں ڈول تھی۔ پہلے سے انتظام نہ کیا تھا ورنہ اگر پہلے ہوٹل کا یومیہ دریافت ہوجاتا تو شاید سفر ہی موقوف ہوجاتا۔ چلنے سے پیشتر کوہ منصوری کی ہر سمت ہر ہوٹل ہر دوکان ہر مقام کا جغرافیہ ہر شخص سے پوچھا کرتے تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میاں وہاں پہونچکر سب انتظام کر لینا۔ خط وکتابت میں کرایہ کا فیصلہ نہیں ہوا کرتا۔ یہ تجویز اُنکو بہت پسند آئی۔ چنانچہ حضرت چلے۔ اور کوہ منصوری پہونچے۔ اب حضرت حیران و پریشان سارے دن گھوما کئے۔ آخر آپ کو ایک جگہ مل گئی جسکو ہوٹل کہا جاتا تھا۔ دو روپیہ یومیہ میں جگہ ملی انہیں خوراک دو وقتہ شامل ہوئی اُنکی باچھیں کھل گئیں کہ اتنا تو وطن میں بھی خرچ ہوجاتا ہے۔ ایک کوٹھری ملی جسمیں ہوا کی مداخلت خلاف مصلحت تصور کی گئی تھی۔ کھاٹ ایسے کھٹملوں سے بھری ہوئی کہ اُسپر نیند آنا دشوار تھا ایک مختصر سا پائخانہ تھا جہاں بھنگن صرف ایک مرتبہ آتی تھی اور بارہ آدمی سے زیادہ اُسمیں جایا کرتے تھے۔ بہرحال آپ وہاں فروکش ہوگئے۔ کھانے کے وقت ایک شخص ایک تھالی میں آم کا اچار دو روٹیاں اور دال کے کٹورے لے آیا۔ ہوٹل والوں سے ڈاکٹر نے کہدیا تھا کہ گھی جگر کے فعل کے لئے مضر ہے اور مرچ مصالحہ بھی مضر صحت ہے۔ ہمارے مسافر بیچارے کفایت کے نارے اسی طمانیت خاطر میں مست ہیں کہ کفایت سے پہاڑ کی سیر ہو رہی ہے۔ ناک بند کرکے وہ بیت الخلا سے واپس آتے۔ نہانے کے لئے ٹھنڈا پانی ملتا تھا۔ بہرا ور دیجئے تو پانی گرم ہوسکتا ہے آپ نے بہر دینا منظور نہ کیا غسل موقوف کردیا۔ ایک دن وہاں کی کیفیت برداشت کی اور گرم کپڑا پہنکر سیر کو نکلے۔ اُنھوں نے سُنا تھا کہ پہاڑ میں ریاضت جسمانی خوب کرنا چاہئے۔ اب میاں چلتے

جاتے ہیں اور زور زور سے سانس لیتے ہیں کہ اس ذریعہ سے اوکسیجن زیادہ حاصل کریں۔ ایک انگریز پاس سے گذرا وہ سمجھا کہ یہ کوئی دیوانہ جا رہا ہے مسکرا کر آگے چلا گیا۔ دو ایک ملاقاتی رستے میں ملے اُن کو اپنے قیام گاہ کا اُنھوں نے پتہ نہ دیا کہ مبادا وہ کسی دن وہاں آ نہ مریں۔ ایک دن گذر گیا۔ رات کو قدرے نیند آگئی۔ دوسرے دن تیسرے پہر پیٹ میں درد اُٹھا۔ چورن ٹرنک میں موجود تھا استعمال کیا کچھ نفع نہوا۔ ملازم ساتھ نہ تھا کہ کچھ خدمت کرتا۔ بیچارے کھاٹ پر تڑپ رہے ہیں۔ "آخر ہوٹل" کے مہتمم کو بلایا اُس سے کہا کہ جناب آپ کو درد قولنج کی شکایت ہے بہتر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو بلا لیا جاوے۔ بعد تامل بسیار فرمایا کہ اچھا لیکن سب اسسٹنٹ سرجن کو بلانا جسکی فیس دو روپیہ ہوتی ہے۔ مہتمم نے کہا بہت خوب۔ لیکن اگر وہ موجود نہ ہوا تو اسسٹنٹ سرجن کو بلا لوں۔ اچھا جیسا مناسب ہو کیجئے۔ سب اسسٹنٹ سرجن تو ملا نہیں اسسٹنٹ سرجن صاحب آگئے اُنھوں نے بہت ڈرایا اور علاج شروع کر دیا۔ ڈاکٹر کی فیس پانچ روپیہ تھی۔ دو پھیرے کے دس روپیہ دینے پڑے۔ دوا کی قیمت مزید برآں۔

تیسرے روز وکیل صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے وطن جانے کی اجازت طلب کی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اس نازک حالت میں تو آپ وطن نہیں جا سکتے۔ چار پانچ روز تک اور قیام کیجئے۔ غذا جو آپ کھاتے رہے وہ درست نہیں ہے۔ خاص پرہیزی غذا تیار کرا کر آپ کو بھجوا دیا کرونگا۔ قہر درویش بجان درویش۔ چار روپیہ یومیہ کا خرچ اور بڑھا۔ جب تین روز گذرے تو وکیل صاحب نے ارادہ مصمم کر لیا کہ اب یہاں سے واپس چل دیں۔ اب سوال یہ درپیش ہے کہ پہاڑی حصہ اُترائی کا پیدل طے ہو یا پالو لیا جاوے۔ یا رکشا پر جا دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ رکشا مناسب ہے اُنھوں نے ایک نہ سنی۔ ایک قلی کے کاندھے پر اسباب رکھ پیدل چل پڑے۔ راستہ میں نہایت تکلیف ہوئی۔ پانی پیتے پیتے دم لیتے ہوئے راج پورہ پہونچے۔ وہاں سے ٹم ٹم پر سوار ہو کر دہرہ دون پہونچے۔ وہاں بخار آگیا۔ اور انٹر کلاس میں جس میں لیٹنے تک کی جگہ نہ تھی۔ ہائے ہائے کرتے ہوئے اپنے گھر پہونچے۔ بیوی حیران کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ میاں تندرستی کے فائدہ کے لیے گئے تھے۔ اور وہاں سے اتنے نحیف اور کمزور ہو کر بخار میں مبتلا واپس آئے اُس نے پوچھا

سرکار یہ کیا معاملہ ہوا۔ آپ نے اور تو کچھ جواب نہ دیا صرف یہ کہا کہ پہاڑ صرف انگریزوں ہی کو موافق آتا ہے۔ دیسیوں کے لئے تو دوزخ ہے۔ حضرت نے حساب بنانا شروع کیا میزان ہوتے ہی غشی کی نوبت آنے لگی۔

یہ قصہ ایک تمثیل ہے جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندوستانیوں کو پہاڑ جانے کا شوق تو ہوتا ہے لیکن وہ اس امر سے ناواقف ہیں کہ پہاڑ پر کس طریق سے رہنا چاہیے وہاں نہ غریبوں کو نفع ہوتا ہے نہ امیروں کو۔ وہاں تو نفع اُس شخص کو ہو سکتا ہے جو روپیہ بیدریغ صرف کرے۔ جو مناسب درجہ کی ریاضت کرے۔ غذا وقت پر کھائے اور اندازہ سے تجاوز نہ کرے۔ مکان اچھا لیکر ساز و سامان کے ساتھ رہے۔ جو لوگ انگریزوں کی آدھی نقل کرتے ہیں۔ اُنکو پہاڑ سے قطعی فائدہ نہیں ہوتا۔ دراصل پہاڑ کی ہوا رقیق اور پانی کمزور ہوتا ہے۔ درختوں اور سبزہ زاروں کی کثرت سے پہاڑ کی رات کچھ زیادہ صحت بخش نہیں۔ لیکن فرحت بخش نظارے سرور انگیز ہوائیں اور ریاضت کے لطیف مواقع پہاڑ کی سیر کو دلچسپ اور مفید بناتے رہتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی جائز طریقہ استعمال سے واقف ہو۔

شمیم لاہور

نالۂ مجنوں

نہ پوچھو وحشت میں کیوں نالہ و فریاد کرتے ہیں　　بڑی حسرت سے ہم اُجڑا ہوا گھر یاد کرتے ہیں
غضب کی تھی ستم کیشی کہ ترکِ آرزو پر بھی　　جفاؤں کو تری ہم او ستمگر یاد کرتے ہیں

عمر بھر وقفِ رقیباں جام و پیمانہ رہا　　دل مرا مجنوں مگر ساقی کا دیوانہ رہا

چھپا کرتے تھے جو دل میں وہ ارماں یاد آتے ہیں　　وہ نشتر یاد آتے ہیں وہ پیکاں یاد آتے ہیں
نہ اب سر میں وہ سودا ہے نہ دل میں جوشِ وحشت ہے　　وہ بے سامانیوں کے مجھکو ساماں یاد آتے ہیں

حسرت کشِ لیلیٰ تھا نہ جاندادۂ محمل　　ہم جانتے ہیں قیس کو دیوانۂ دل تھا

بڑی عدالت

(۱)

خورجہ میں ایسا کون شخص ہے جو پنڈت گوپی ناتھ کو نہیں جانتا - آپ وہاں کی ہندو آبادی کے پروہت ہیں - ہندوؤں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو پنڈت جی کے جوتش کا قائل نہ ہو - بہت سے خوش اعتقاد تو ایسے ہیں جو پنڈت جی کی باتوں کو پتھر کی لکیر مانتے ہیں - ہندو تو ہندو اکثر مسلمان بھی پنڈت جی سے شگون دریافت کرنے آجاتے ہیں - بچہ ہو یا بوڑھا ہر ایک سے آپ بملائمت اور بخندہ پیشانی پیش آتے ہیں - اس خوش اخلاقی کی بدولت عزت و فراغت سے زندگی بسر کر رہے ہیں - بابو ہنومان پرشاد آپ کے ہمسایہ ہیں - اتفاق وقت کہیئے یا شامت اعمال کہ آج کل آپ سے اور ہنومان پرشاد سے اَن بَن ہو گئی ہے - اول اول تو زبانی تو تو میں میں رہی مگر اب عدالت تک بھی نوبت پہونچ گئی -

دنیا کے بہت سے اہم واقعات ذرا ذراسی باتوں سے شروع ہوتے ہیں - دُور کیوں جائیے اِس جنگ عظیم ہی کو لیجئے - اگر سرویہ کا شہزادہ قتل نہ ہوا ہوتا تو اِس عالمگیر اور تباہ کُن جنگ کا کبھی آغاز نہ ہوتا - ایسے ہی پنڈت جی کی لڑائی کا بھی آغاز ہوا - سلونو کے روز بابو ہنومان پرشاد صاحب کے یہاں گانے بجانے کا جلسہ تھا - بدقسمتی سے پنڈت جی بھی مدعو تھے - بھنگ کا نشہ سر پر سوار تھا - بابو صاحب اور پنڈت جی دونوں اپنے کو بیجو باورا اور تان سین سمجھنے لگے - اول تو دونوں نے دل کھول کر گایا اور خوب سُر و - زیادہ ہوا تو بات بات پر تکرار ہونے لگی اور یہ بحث چھڑ گئی کہ بہاگ میں ما کومل بجتا ہے یا تیز - بحث کا چھڑنا تھا کہ حاضرین محفل میں دو تفرقے پیدا ہو گئے - کوئی تو بابو صاحب کی رائے کی تائید کرتا تھا اور کوئی پنڈت جی کا ساتھ دیتا تھا - پنڈت جی بابو صاحب سے عمر میں بڑے تھے اُنھوں نے بزرگی کے زعم میں آ کر کہا " آخر تو - تو ہنومان ہی ہے نہ - بندر کیا جانے ادرک کا مزا - تم لوگ تو قلم قصائی ہو - گانا وانا کیا جانو - گانا جانیں برہمن

جو ویدوں کی رچاؤں تک کو نئے اور بھر سے پڑھتے ہیں۔

یہ الفاظ سُنکر بابو صاحب کو طیش آگیا۔ اُسوقت تو بدمزگی کا خیال کرکے خاموش ہوگئے مگر اُنھوں نے اپنی بات کو اپنے دل میں رکھّا اور بدلہ لینے کے لئے کسی عمدہ موقع اور محل کے متلاشی رہنے لگے۔ غصّہ کی آگ نے برسوں کی محبت اور عقیدت کو جلا کر راکھ کر دیا۔

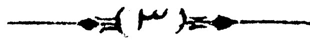
جو ئیندہ یا بندہ۔ بدلہ لینے کا ایک موقع اِن کو ہاتھ آگیا اور اُنھون نے پنڈت جی پر نالش ٹھونک دی۔ معاملہ یہ تھا کہ بابو صاحب کے مکان سے ملا ہوا اور پنڈت جی کے مکان کے ملحق ایک قطعہ اُفتادہ آراضی تھی۔ وہ دراصل پنڈت جی کی ملکیت تھی۔ مگر نہ معلوم کیوں پنڈت جی اب تک اُسپر مکان نہ بنا سکے تھے۔ مگر چونکہ بیٹے کی بہو کے آجانے سے اُنکو مکان کو زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ خیال کا آنا تھا کہ تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ مگر ناچاقی اور دلی کدورت کی وجہ سے بابو صاحب نے تعمیر کو روک دیا۔ اُنکا اعتراض تھا کہ اِدھر سے زنانی ڈیوڑھی کا راستہ ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ آراضی بھی ہماری ملکیت ہے جب پنڈت جی نے باوجود تاکید شدید کے تعمیر کو نہ روکا تو بابو صاحب نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور تعمیر کو روک دینے کا حکم امتناعی نکلوا دیا۔

---- ۳ ----

آج منصفی میں غیر معمولی بھیڑ بھاڑ ہے۔ ہر شخص پنڈت جی کے مقدمہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ کیونکہ آج جھوٹ اور سچ میں لڑائی ہے۔ پنڈت جی اپنی سچائی کے زعم میں وکیلوں کی بھی نہیں سُنتے۔ بابو جی کو اپنی دولت پر گھمنڈ اور اُنھوں نے اچھا وکیل کیا ہے۔ گواہ بھی ذاتی رسوخ کی وجہ سے آنریری مجسٹریٹ اور ذی حیثیت اصحاب ہیں۔ سابق منصف صاحب بھی بغرض ادائے شہادت طلب ہوئے ہیں۔

ہر ایک گواہ مدعی نے مدعی کے دعوی کی تائید کی۔ کیونکہ جب دعوتیں اور محفلیں ہوئی تھیں تو یہ سب اسی آراضی پر ہو کر زنانی ڈیوڑھی کی جانب سے جھت پر گئے تھے۔ صدر دروازہ تو سڑک کی جانب تھا مگر عام طور سے آمدورفت اسی طرف سے ہوتی تھی۔ ۱۲ سال قبل سے مدعی نے اپنا قبضہ ثابت کر دیا۔

مدعا علیہ کے پاس کوئی ثبوت سوائے اُس بڈھے خوبیا نائی کے نہیں تھا۔ جس سے آپ نے یہ زمین خریدی تھی۔ اُس کا بیان تھا کہ یہ آراضی میں نے پنڈت جی کے ہاتھ فروخت کی تھی مگر بوجہ بیعنامہ وغیرہ کی عدم موجودگی کے اُسکے بیان کی کوئی وقعت نہ ہوئی۔ ایک بات البتہ مدعا علیہ کے حق میں تھی وہ یہ کہ اُسکی زنانی ڈیوڑھی کا بھی راستہ اسی آراضی پر ہوکر تھا منصف صاحب نے موقع کا معائنہ کیا اور اُنھوں نے نصف نصف آراضی ملکیت فریقین قرار دی۔



پنڈت جی جب فیصلہ سُنکر گھر پہونچے تو پنڈتائن نے پنڈت جی کا اُترا ہوا چہرہ اور خشک ہونٹھ دیکھکر کہا "مکدمہ ہار گئے تو کیا ہوا پرماتما کے یہاں تو ہمارا نیاؤ ہوگا"

پنڈت جی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ پرماتما کے یہاں جب نیاؤ ہوگا تب ہوگا اب تو چھوٹے سے گھر میں گذر ہونا کٹھن ہے۔ آدھی زمین میں کیا ہوگا۔

پنڈتائن "تو منصف صاحب نے بھی ہماری نہ سُنی۔ میں تو اُنکی بہو کے لئے گنگا جی کا پرشاد لے گئی تھی اور اُنھوں نے ہماری مدد کرنے کو بھی کہا تھا"

پنڈت جی۔ اری چپ بھی رہ۔ تو باؤلی اِن باتوں کو کیا جانے۔ یہ کچہری دربار کے معاملے ہیں۔ پانسا پڑے سو داؤ۔ اور حاکم کرے سو نیاؤ۔ جیسا اُنکی سمجھ میں آیا کیا"

پنڈتائن "تو پوچھو کے باپ (خوبیا نائی) کی بھی نہ مانی۔ تم نے تو اُسی نسے زمین لی تھی"

پنڈت جی۔ اری اُس بیچارے نے تو سب کچھ کہا۔ جب دن اچھے ہوتے ہیں تو سبھی باتیں اچھی ہوتی ہیں۔ یہ ہمارے پاس کاگج داگج تو کچھ تھا ہی نہیں۔ اور اُنکی طرف سے بڑے بڑے گواہ تھے۔ ہماری کون سُنتا۔

پنڈتائن (پلّہ پسار کر) جیسی بابو نے ہمارے ساتھ کی ہے پرماتما کرے اُسکے بیٹے . . .

پنڈتائن اتنا ہی کہنے پائی تھیں کہ پنڈت جی نے اُنکے منھ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا "اری تو کیا بکتی ہے۔ یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے۔ تجھے خبر نہیں کہ اسی گھر کا نمک کھاکر میں اتنا بڑا ہوا ہوں۔ اور سچ تو یوں ہے کہ بابو جی کے لالہ ہی نے یہ زمین لیکر دی تھی۔ اب اُنکے

بیٹے کی خوشی نہیں دیتے نہ سہی اگلی عدالت سے دیکھ لیں گے۔ کوسنے دوسنے سے کیا فائدہ۔"

(۴)

خوب کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ گھاسی رام کے چھپر میں بیٹھے ہوئے کئی شخص آگ تاپ رہے تھے۔ انہیں میں ہمارے پنڈت جی بھی تھے۔ ہر ایک شخص پنڈت جی سے اظہار ہمدردی کر رہا تھا کیونکہ کل ہی یہ ہائی کورٹ سے مقدمہ ہار کر آئے تھے۔

گھاسی رام۔ "پنڈت جی صبر کرو۔ تم نے ناحق رار بڑھائی۔ بڑوں سے اٹک کر چھوٹوں ہی کا نکسان ہوتا ہے۔ تم نے اِتنے (اتنے) روپیہ کھرچ (خرچ) کئے پھر بھی کچھ پھایدہ (فائدہ) نہوا۔ جج سے بھی ہارے اور ہائی کورٹ سے بھی۔

ملوا تیلی۔ "اجی سیٹھ جی تم نے بھی بھلی کہی آجکل کی عدالتیں بھی کوئی عدالتیں ہیں سچّا روئے اور جھوٹا ہنسے۔"

خدا بخش۔ "ہاں بھئی ملوا کہتے تو سچ ہو۔ ایسا نہوتا تو یہ وکیل مختار اتنے مالدار کیوں ہوتے۔ جسے دیکھو جیبیں بھرے کچہری سے چلا آتا ہے۔ ہمارا تمھارا خون پیکر ہی تو یہ موٹے ہوتے ہیں۔"

پنڈت جی۔ "یہاں تو جو چاہیں سو کرلیں پر بھگوان کے یہاں نیاؤ ہوتا ہے۔ دیر سے ہو یا اویر سے۔ کرنی کا پھل اوشیہ ملتا ہے۔"

ملوا۔ "ملتا کیا پتھر ہے تمھارا معاملہ کتنا سچا تھا سب جھوٹا ہو گیا۔"

پنڈت جی۔ "بابو جی کو اپنے کئے کا پھل ملگیا۔"

سب نے یک زبان ہو کر پوچھا "وہ کیا ہم نے تو کچھ بھی نہیں سنا۔"

پنڈت جی نے غرور سے سر اوپر اُٹھا کر اور اِدھر اُدھر دیکھکر مگر دھیمی آواز سے کہا "کسی سے کہنا نہیں بہو جی کا گربھ پات (اسقاط حمل) ہو گیا۔ بڑی دھوم دھام سے ست ماسہ پوجا تھا۔ اب رہ گئے اپنا سا منھ لیکر۔"

ملوا۔ "تو اس سے تمھیں کیا ملا۔"

پنڈت جی۔ "ہمیں بھی کبھی ملجائیگا اب تو اُنھیں کرنی کا پھل ملا ہے۔"



(۵)

آج کل بابو صاحب کے یہاں غیر معمولی چہل پہل ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ کے یہاں آج ایک جلسہ ہے بظاہر السنت کی خوشی منائی جاتی ہے - مگر در پردہ مقدمہ جیتنے کا جلسہ ہے - دور، نزدیک کے سب رشتہ دار مدعو کئے گئے ہیں - شہر کے بھی بہت سے سربرآوردہ اصحاب تشریف فرما ہیں - بابو صاحب کے بڑے بھائی بابو گردھر پرشاد صاحب بھی حسن اتفاق سے آئے ہوئے ہیں - یہ زیادہ تر ٹھاکر جی کی پوجا پاٹھ میں رہتے ہیں اور بالکل تارک الدنیا ہیں آپ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں ٹھیکہ دار تھے - ایک مرتبہ آپ کو اس سڑک پر جو کاس گنج سے ایٹہ کو جاتی ہے دو طرفہ ببول کے درخت نصب کرنے کا ٹھیکہ دیا گیا - ٹھیکہ لیتے تو لے لیا مگر ضمیر کی آواز نے رنجیدہ کر دیا - بیوی نے جب لطف ہو کر رنجیدگی کا سبب دریافت کیا تو کہا عجب کشمکش میں جان ہے - کوئی باغ لگاتا ہے - کوئی مندر بنواتا ہے - میں ببول کے پیڑ لگواؤنگا عاقبت میں نہ معلوم میرا کیا حشر ہوگا ہمارے یہاں کہا ہے -

کرنی کرے تو کیوں ڈرے اور کر کے کیوں پچھتائے -

پیڑ بوئے ببول کے تو آم کہاں سے کھائے -

بیوی نے ہنسکر کہا تو یہ کون بڑی بات ہے - تم شوق سے آم اور جامن کے پیڑ لگوا دو - بلا سے نقصان ہوگا تو ہو جانے دو -

چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا - اس زمانہ کے حاکم بھی کچھ نیک نیت اور شریف ہوا کرتے تھے جب اسکو اصل حال معلوم ہوا چیف انجنیر سے خاص منظوری منگوا کر مزید بل دینا چاہا مگر آپ نے اقرار نامہ سے زیادہ روپیہ لینے سے انکار کر دیا -

اِس جلسہ میں پنڈت جی بھی موجود تھے یہ آپ ہی کی خاطر چلے آئے تھے - ورنہ جب سے مقدمہ بازی شروع ہوئی تھی آنا جانا قطعًا بند ہو گیا تھا -

تمام مجمع میں خوشی چھا رہی تھی - اگر کوئی رنجیدہ تھا تو پنڈت جی -

بابو صاحب نے غرور سے جھوم کر کہا کہئیے پنڈت جی آپ کا اب کیا ارادہ ہے - ہائیکورٹ سے بھی ہار گئے"

پنڈت جی نے آنکھیں نیچی کر کے کہا "تو کیا ہوا - ابھی ایک عدالت اور باقی ہے"۔
بابو صاحب نے قہقہہ مار کر کہا "اور عدالت - ناممکن - میں نے ہائی کورٹ کے وکیلوں سے دریافت کر لیا ہے - یہ مقدمہ بوجہ کم مالیت ہونے کے پریوی کونسل تک نہیں جا سکتا"۔
اب کی مرتبہ پنڈت جی نے ہنسکر کہا - "بابو صاحب سرکاری عدالتوں سے بھی بڑھکر ایک عدالت اور ہے اور وہ دھرم اور انصاف کی عدالت ہے"۔
اتنی بات سنکر بابو صاحب کا چہرہ اتر گیا - خوشی کا نشہ ہرن ہو گیا - چمکتے ہوئے آفتاب کو ابر نے ڈھک لیا -
بھائی صاحب نے کہا "ہنومان! کیا دیکھتا ہے - سرکاری قانون کی تو قدر و عافیت معلوم ہو گئی - اب دھرم اور انصاف کی عدالت میں پنڈت جی نے چارہ جوئی کی ہے - جو بات سچی ہے اسکے ماننے میں تجھے اب کیا اعتراض ہے"۔
بابو صاحب نے آنکھیں نیچی کر کے کہا "آپ کا حکم سر آنکھوں پر"۔
بھائی صاحب نے کہا - "اچھا تو معہ خرچہ اپیل منظور - مدعی رسپانڈنٹ اپیلانٹ مدعا علیہ کو ایک ہزار تاوان ادا کرے اور اپنے قصور کی معافی مانگے"۔
عدالت عالیہ کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور ایک ہزار کا توڑا پنڈت جی کے گھر پہونچ گیا -
پنڈتاین نے گود پھیلا کر دعا دی - جے جے کار کی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں - اسیوقت بابو صاحب کے فرزند ارجمند تولد ہونے کی خبر فرحت اثر سنکر بھائی صاحب نے کہا -
"نند کے آنند بھئے جے کنھیا لال کی"۔

شیام لال

مقالات ٹالسٹائی

کیا بائیں ہاتھ سے چند پیسے دینے کا نام جبکہ داہنے ہاتھ سے ہزاروں روپے جمع کئے جاتے ہوں، خیرات ہے؟ اس سے بیشتر کہ تم اچھے کام کرنا شروع کرو، برے کام ترک کرنا چاہیے۔

مترجمہ عالی لکھنوی

ڈین مہر

۱

شاہ احمد حسین کی شادی جس شان سے ہوئی قصبہ والے اب تک اُسکا گیت گا رہے ہیں معمولی لوگوں کی بات کیا بڑے بڑوں کی زبان پر ہے کہ اس شان کی بارات کم دیکھنے میں آئی ہے جہاں اور باتوں میں افراط تفریط سے کام لیا گیا تھا ڈین مہر میں بھی فیاضی دکھلائی گئی تھی۔ قاضی صاحب نے پانچ لاکھ روپیہ سکۂ رائج الوقت زبان سے نکالا تھا کہ منظور کر لیا گیا۔

چوتھی چالے کی رسمیں بھی طرفین سے جس پیمانے پر ہوئیں وہ بھی یادگار رہیں۔

شاہ احمد کریم (احمد حسین کے والد) کی حیثیت دیکھتے ہوئے لوگ اس دریا دلی پر مختلف الآرا تھے۔ سطحی نگاہ رکھنے والوں کی زبان پر اگر واہ تھی تو نظر تعمق سے دیکھنے والے لب خاموش سے آہ کے مصوّر تھے۔

پارسال شاہ احمد کریم کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمہ کا اثر شاہ احمد حسین پر جسقدر ہوا ہو تھوڑا تھا۔ اس سلسلہ میں جو سب سے بڑھکر ناخوشگوار بات ہوئی وہ اُنکی تعلیم سے علٰحدگی تھی۔ کیونکہ انٹرنس کے امتحان کو صرف دو مہینہ باقی تھے۔

ابھی تک شاہ احمد حسین خانہ داری کے انتظامات سے بیخبر تھے یک بیک گھر کا سارا جنجال سر پر پڑ گیا۔ اگرچہ ناتجربہ کاری پریشانیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے تاہم اُنھوں نے استقلال کے ساتھ ہر ایک کام کو سنبھالنا شروع کیا۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ اُنکو مہاجنوں کے تقاضے تھے۔ جائداد کا سالانہ منافع صرف چار ہزار تھا۔ جسمیں اُنکے والد مرحوم بمشکل گذر اوقات کرتے تھے۔ شاہ احمد حسین کے لئے پرانی آن بان قائم رکھتے ہوئے قرضوں کی ادائگی جسکی تعداد دس لاکھ تھی ناممکن تھی مجبوراً اُنھیں اپنی موروثی فیاضی سے ہاتھ اُٹھانا پڑا۔ ادہ ملازموں کی تعداد سواری کے اخراجات۔ دسترخوان کی

وسعت اور انعام و اکرام میں حیرت انگیز کمی کرنی پڑی گو یہ کفایت شعاری کا زریں اُصول تھا۔ مگر بے ترتیب برتا گیا۔



شاہ احمد حسین کی بی بی زیادہ تر میکے میں رہا کرتی تھیں۔ سسر کے انتقال کی خبر سُنکر سسرال آئیں۔ مگر وہی پرانی شان سے آگے پیچھے بیس بیس خادمہ۔ کوئی پاندان لئے ہے کوئی خاصدان۔ کوئی اُگالدان۔ کوئی پائنچہ سنبھالے ہے تو کوئی دوپٹہ۔ یہ ادا ممکن ہے کہ احمد حسین کو کبھی اچھی معلوم ہوتی رہی ہو۔ مگر اب نہایت تکلیف دہ تھی۔ وہ بھی اپنی بی بی سے خوش نہ تھے کیونکہ وہ ایک بدشکل مغرور اور جاہل عورت تھی۔ میکے کی حالت گو بہت اچھی نہ تھی مگر پھر بھی سربرآوردہ لوگوں میں شمار تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مقدمہ بازی میں انکا خاندان یگانۂ روزگار تھا۔ جہاں کسی سے چشمک ہوئی ایک مقدمہ بنا کے داخل عدالت کر دیا۔ یہ ایسا ہتھیار تھا کہ چھوٹے بڑے سب کانپتے تھے۔

احمد حسین نے چاہا کہ اپنی بی بی کی لونڈیوں میں بھی کمی کر دے۔ مگر اسمیں خانہ جنگی کے آثار نظر آئے۔ اسنے اپنی بیوہ بھاوج اور ماں کی خادمہ کو نکال دیا۔ نیز باورچی خانہ کے پانچ ماماؤں کو بھی الگ کر دیا اپنی بھاوج اور ماں سے (جو تمام نشیب و فراز کو سمجھتی تھیں) یہ کہدیا کہ آپ لوگ اُنھیں ماماؤں سے کام لیجئے جو پائنچہ اٹھائے پھرتی ہیں۔ تجویز تو مناسب تھی۔ مگر جاہل بی بی کی جہالت کی وجہ سے اُلٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔

ایک ہفتہ بھی یہ انتظام ٹھکانے سے نہ چل سکا۔ بی بی الگ چراغ پا۔ لونڈیاں الگ بے دل۔ ماں بہن نے الگ شکایتیں شروع کیں۔

ایک روز اسکی بہن جبکہ وہ کھانا کھاتا تھا۔ یوں کہنے لگی۔

بہن۔ بھیّا! آج بھابھی نے "شنو" (ملازمہ کا نام) سے کام لینے پر ہم لوگوں کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ میرے میکہ کی لونڈیاں ہیں ان سے کوئی کام لینے والا کون ہوتا ہے تم لوگوں پر بے پیری وقت آپڑا ہے اُترے میں شریک نہیں ہوسکتی۔ اگر میری لونڈیوں سے کچھ کام لیا گیا تو خیر نہیں ہوگی۔

احمد حسین (بہن کی طرف دیکھ کر) تم کہو تو انکو اُنکے میکے پہونچا دوں۔
"میکے ہی میں رہتے رہتے تو دماغ بگڑ گیا"۔
"تو پھر کیا کیا جاوے"۔
"انکو سمجھانے کی کوشش کیجیے ممکن ہے کہ آپ کے کہنے کا اثر پڑے"۔
"میں کہونگا توضرور۔ مگر انکی اصلاح میری دانست میں ناممکن ہے"۔
بہن کھانا کھا کر چلی گئی۔ اور قیلولہ کے لئے احمد حسین سونے کے کمرے میں چلے گئے۔ بی بی بھی غصہ سے بھری ہوئی پاس بیٹھ گئی۔ تیور دیکھتے ہی احمد حسین سمجھ گیا کہ آج رنگ بگڑا ہوا ہے خدا خیر کرے۔ دل ہی دل میں اُسے راضی کرنے اور اُسکی ناخوشگوار باتوں کو تحمل سے سُننے کا اہتمام کرنے لگے۔ مگر جو لفظ پہلے پہل بی بی کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا
"مجھے میکے پہونچا دیجیے مجھ سے یہاں نہیں رہا جائیگا"۔
احمد حسین۔ خیریت تو ہے کیا تکلیف ہوئی۔
بی بی۔ مجھ سے ایسی تکلیف برداشت نہیں ہوسکتی۔ آپ نے کُل لونڈیوں کو نکال دیا۔ میری ماماؤں سے سارے کام لئے جاتے ہیں۔ آپ نے تو آج بخالت کو راہ دیا ہے کہ جسکی انتہا نہیں۔ یہ کتنی بےغیرتی ہے کہ میرے میکے کی لونڈیاں چولہا جھونکیں۔
احمد حسین۔ یہ تو کوئی بری بات نہیں مجھے دیکھو اپنا کام خود کر لیا کرتا ہوں۔ پیغمبروں اور ولیوں کی بیبیاں (جو ہم لوگوں کی سردار ہیں۔ جنکے نقش قدم پر چلنا فلاح دارین ہے) کُل کام اپنے ہاتھوں سے کیا کرتی تھیں۔ ہم لوگوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ گھر کی حالت دیکھتی ہو قرضہ سے تمام جائداد زیر زوال ہے۔ کیا اخراجات میں کمی کرنا اور قرضہ ادا کرنے کی صورت پیدا کرنا ایک عقلمند کا فرض نہیں ہے۔ احمد حسین اسی سلسلہ میں اور کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر بی بی نے بات کاٹکر کہا۔
"میں یہ سب دُکھڑا سننا نہیں چاہتی۔ میں تو سمجھتی ہی ہوں کہ والدین نے مجھے بھاڑ میں جھونک دیا۔ میں ہرگز یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ آپ مجھے کل ہی روانہ کر دیجیے۔ خدا کے فضل و کرم سے میں یہاں سے وہاں اچھی رہوں گی۔
احمد حسین۔ جانے نہ جانے کے متعلق میں سوچ کر جواب دونگا۔ مگر خیال تو کرو میکے میں کب تک ہوگی۔

بی بی۔ اگرماں باپ لائق ہیں تو ہمیشہ کے لئے۔ اور اگر نالائق ہیں تو میں ایسی سسرال کی تکلیف سے میکے کی بھیک پسند کرتی ہوں۔

احمد حسین۔ تم تو غصہ میں بھری ہو۔ میں کیا کہوں جو تم مناسب سمجھو کرو۔ مگر یاد رکھنا تمھاری وجہ سے میں تباہ ہوتا ہوں۔ یہ اچھا نہیں۔

بی بی۔ (اُٹھ کر) لیجئے میری وجہ سے تباہی ہے تو میں جاتی ہوں۔



احمد حسین آدمی ہی تھا۔ بی بی کی اس نامعقول حرکت اور بے وجہ خفگی سے اُسکا دل غصہ سے کانپ اُٹھا۔ مگر کیا کرتا۔ کبھی دل میں آتا کہ اسکو اسکے میکے روانہ کر دوں۔ پھر یہ خیال ہوتا کہ سسرال والے ایک ہی شہر میں ہیں۔ بی بی نالائق ہے۔ یہ تین میں بیرہ جوڑے گی۔ ملازمین کی تعداد بڑھانا نہیں چاہتا۔ اسکا خیال تھا کہ رفتہ رفتہ بی بی کے اخراجات میں کمی کریگا مگر سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ کبھی کبھی اُسکے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ طلاق دیدوں۔ مگر مہر کی رقم بھی کثیر ہے سسرال والے کب چین سے بیٹھنے دیں گے۔ انھیں خیالات میں غلطاں پیچاں باہر نکل آیا۔

اسکو اسپر بھی افسوس ہے کہ پانچ لاکھ مہر میں نے قبول کیوں کرلیا۔ پھر دل ہی میں جواب ملتا ہے کہ والد مرحوم کے ایما سے منظور کیا تھا۔ اُنکو یہ باتیں کب معلوم تھیں۔ افسوس شریف مسلمانوں میں یہ کتنا بڑا رواج پڑ گیا ہے کہ مہر اتنا زیادہ بڑھا دیتے ہیں جسکی ادائگی کسی صورت سے ممکن نہیں ہوتی۔

افسوس وہ تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ یہ طریقہ زن و شو کے تعلقات کے لئے کسقدر مضر ہے۔ بی بی بدمزاج ہوئی تو شوہر کو اپنا زرخرید غلام سمجھتی ہے۔ اور شوہر بی بی کو ایسا عذاب سمجھتا ہے جس سے جیتے جی چھٹکارا ممکن نہیں۔ کلو خلاصی کی صرف ایک صورت طلاق ہے۔ مگر مہر کا خیال ایک خوفناک اژدہے کی طرح ہر وقت اُسکا محافظ ہے۔ مرد نے دوسری شادی کرلی تو اور بھی آفت برپا ہوئی۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ بی بی کی بدمزاجی اور بڑھ گئی۔ جوتیوں میں دال بٹنے لگی تھکا فضیحتا کی نوبت پہونچی۔ ذرا بات اور بڑھی تو دینِ مہر کا قصہ پیش ہو گیا۔

لیکن اگر شوہر کی ذاتی حیثیت دیکھکر اور مہر کی ادائگی مدنظر رکھکر مہر مقرر کیا جائے تو یہ ناخوشگوار واقعات ظہور میں نہ آئیں۔

احمد حسین انھیں خیالات میں غلطاں پیچاں تھا کہ ایک چپراسی کے آنے سے سلسلۂ خیالات جو بادل کی طرح اُمنڈے چلے آتے تھے چپراسی کی تشفق گوں پگڑی سے ٹکر کھا کھا کر پھٹ گئے اور مطلع صاف ہو گیا۔

چپراسی۔حضور ایک سمن ہے۔

احمد حسین۔کس کا۔

چپراسی۔لکھرام ساہ کا۔(لکتا ہوا سمن احمد حسین کے ہاتھ میں دیدیتا ہے)

احمد حسین نے دیکھا ساڑھے پانچ ہزار کا دعویٰ ہے سر پکڑ لیا۔چپراسی کو ایک روپیہ دیکر کہا کہ اسکو عدم تعمیل واپس کردو۔چپراسی نے بھی اپنی مٹھی گرم کی اور چلتا ہوا۔



آج سویرے ہی سویرے احمد حسین اپنے کارندوں کے ساتھ کچھ حساب کتاب دیکھ رہے ہیں کچھ باتیں ہوتی جاتی ہیں مگر اُسی حساب کتاب کے متعلق مواضعات کی آمدنی اور رقبے دیکھے جاتے ہیں۔ایک کارندہ نے کہا حضور رام پور سے چھوٹا کوئی موضع نہیں ہے۔اسکی آمدنی سالانہ ۱۱ ہزار ہے۔اگر اسی کو لکھرام ساہ لے لیں تو مناسب ہے۔احمد حسین نے کہا سوا اِسکے چارہ کار کیا ہے۔مگر ابھی تک آئے نہیں۔میں نے بُلا بھیجا تھا۔یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ لکھرام ساہ مع اپنے منیب کے ہاتھی پر سوار دروازہ پر آگئے۔احمد حسین نے اُٹھ کر اُنکو فرش پر اپنے ساتھ بٹھال لیا اور صاحب سلامت کے بعد یوں گفتگو شروع ہوئی۔

احمد حسین۔منیب جی دیکھئے کسقدر رقم واجب الادا ہے۔

منیب۔چار ہزار زر اصل اور ڈیڑھ ہزار سود کی رقم ہے۔

احمد حسین۔کہئے ساہ جی اسمیں کسقدر رعایت ہو سکتی ہے۔

لکھرام ساہو۔اسمیں کیا رعایت کراتے ہو۔تمھارے والد مرحوم نے جسوقت تمھاری شادی میں قرضہ لیا اُسی وقت سود کی رقم اتنی کم کرا دی جتنی میں نے کسی کے ساتھ نہیں کی تھی۔

احمد حسین۔آپ کی مہربانی تھی میری حالت اسوقت جیسی ہو رہی ہے میں کیا عرض کروں۔بس اب آپ سے کیا چھپا ہے۔اگر آپ لوگوں نے نہیں سنبھالا تو میں تباہ ہو جاؤنگا۔

ٹھکرام ساہ - تو پھر تمہیں کو کیا چھوڑ دوں -

احمد حسین - مجھ سے کیا کہلاتے ہو - میں تو کہونگا کہ سود کی رقم چھوڑ دیجیے -

ٹھکرام ساہ - لڑکے کہیں ایسا بھی ہوا ہے - ایسی بات کہو کہ میں مان بھی لوں -

احمد حسین - اچھا پانچ سو روپیہ چھوڑ دیجیے اسمیں تو آپ کو غالبًا عذر نہو گا -

ٹھکرام ساہ - عذر کو تو نہ کہو مگر تمھاری خوشی مجھے منظور ہے -

احمد حسین - میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے کوئی موضع بیع کرنا چاہتا ہوں آپ رامپور لکھوا لیجئے -

ٹھکرام ساہ نے چند باتیں دریافت کرکے رضامندی ظاہر کی اور رجسٹری کے لئے ایک تاریخ تعین ہو گئی اور خوش خوش ٹھکرام ساہ واپس گئے -

رجسٹری کے لئے ایک ہفتہ کا دن ملا - احمد حسین نے کل ماجرا اندر آکر والدہ سے کہا انھوں نے بھی منظور کر لیا - کھانے کے بعد احمد حسین باہر آئے - عصر کی نماز پڑھکر ٹہل رہے تھے کہ دیکھا میاں احمد سعید صاحب گھوڑے پر سوار اور چالیس کہار معہ محافہ پالکی دروازہ پر موجود - احمد حسین بھوچکا سا ہو گیا - انکی تشریف آوری کی وجہ اسکی سمجھ میں نہ آئی - صاحب سلامت کے بعد احمد سعید نے رخصتی کی بات چیت شروع کی - احمد حسین سمجھ گیا کہ ہو نہو یہ بی بی کی نازل کی ہوئی بلا ہے ضرور اسنے یہ تحریک کی ہے - پھر کیا کیا جاوے ؟ اگر روکتا ہوں تو یہ مانیگا نہیں اسلئے زیادہ طوالت سے یہی مناسب ہے کہ رخصت کر دیا جاوے - چنانچہ تھوڑے سے انکار کے بعد رخصت کرنا منظور کر لیا اور سویرے ہی رخصت بھی کر دیا -

احمد حسین نے رجسٹری سے فراغت پاکر کل مہاجنوں کو بلاکر انسے معاملہ صاف کر لینا مناسب سمجھا اور ایک مہینہ کے اندر اندر کل قرض کا جھنجھٹ کچھ رہن کچھ بیع کی صورت میں صاف کر دیا -

بی بی نے میکے پہونچکر اپنی جا و بیجا تکالیف کی داستانیں شروع کیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے شوہر کے متعلق کہا کہ انکی آوارگی کی وجہ سے تمام جائدادیں بکی جا رہی ہیں -

احمد حسین کے سسر اور سالوں کو جب یہ خبر پہونچی تو دریافت کرایا کہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے انکی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ درحقیقت جائداد رہن اور بیع ہو رہی ہے - لڑکی کی تکلیف سنکر ایک غم اور غصہ کا جوش پیدا ہوا اور ۵ لاکھ دین مہر کا دعویٰ عدالت میں دائر کر دیا -

احمد حسین خوش تھا کہ اب کسی طرح گذر اوقات ہو جائیگی۔ مگر دوسرے ہی ہفتہ پھر چپراسی کو دیکھکر
ان ہی عقل گئی دیکھا تو ۵ لاکھ کا دعوی۔ اب اسکے رنج کی انتہا نہ تھی۔ سمن ہاتھ میں لیا اور دستخط کرکے
واپس کردیا۔ مارے رنج وغم کے کمرے میں آکر گر پڑا۔ ابھی وہی غم تازہ تھے جو مہاجنوں کی نازبرداری
اور جائداد کے نکلنے سے دل پر لگے تھے۔ یہ سمن پروانۂ اجل بنکر ایسا آیا کہ کوئی صورت بچنے کی نظر
نہ پڑی۔ سب کی خوشامد وہ برداشت کرسکتا تھا مگر بی بی کی خوشامد سسرال کے آگے سرنگونی
ناقابل برداشت تھی اسکا دل درد سے بھر آیا ہوش وحواس نے ساتھ چھوڑا۔ میز پر پڑے ہوئے
کاغذ پر اسنے یہ جملہ لکھا "دین مہر یا خدا کا قہر" اور رائفل کا منہ سینے پر رکھکر گھوڑا گرادیا اور اسطرح
دھڑکتے ہوئے دل کو ہمیشہ کے لئے ساکن کردیا۔

بندوق کی آواز نے دعوی مہر کی جوابدہی کی۔ گھر کی تمام عورتیں محلہ کے تمام آدمی دوڑکر
کمرے میں پہونچ گئے مگر یہاں کیا تھا "ایک تڑپتا ہوا لاشہ اور پہلو سے لگی ہوئی کارتوسی بندوق"۔

منظور الحق کلیم اعظم گڈھی

جذبات اثر

جو تمہاری آرزو کرنے لگے — آپ اپنی جستجو کرنے لگے

بول بالا ساقئ گلفام کا — پھول مجھ سے گفتگو کرنے لگے

جامۂ تقوی میں تھے کچھ داغ مے — شیخ صاحب شست وشو کرنے لگے

جوشش گریہ میں کمی منظور تھی — شامل اشکوں میں لہو کرنے لگے

اُسکی قدرت اُسکی رحمت کے نثار — بت سُنا ہے گفتگو کرنے لگے

جسکے ذمہ تھا فریضہ عشق کا — خون سے اپنے وضو کرنے لگے

میری کشتی بے ستیز اندازہ تھی — الاماں جام وسبو کرنے لگے

اِسقدر اُنکی پرستش کی اثر
بت ہماری آرزو کرنے لگے

اثر لکھنوی

تنقید کتب

ارمغانِ کلام

سرزمین اعظم گڈھ کی مردم خیزی میں کسکو کلام ہو سکتا ہے۔ اگلے وقتوں میں اعظم گڈھ (اور مضافات اعظم گڈھ) علماء و فضلاء کا مرکز رہ چکا ہے، اور اب بھی وہاں ایسی باوقار اور ذیشان ہستیاں موجود ہیں جن پر دنیائے علم و ادب بجا طور سے فخر کر سکتی ہے۔

ترقی زبان کے لحاظ سے بھی اس سرزمین کا درجہ کچھ کم نہیں، دارالمصنفین اعظم گڈھ میں مستقل طور پر تصنیف و تالیف کا کام ہو رہا ہے۔ ترقی اردو کی انجمنیں بھی قائم ہیں پچھلے سال میں بزم ادب اعظم گڈھ نے، داغ جگر، شائع کر کے اپنی سعی عمل کا ثبوت دیا تھا، اب انجمن بزم ادب جے راج پور نے اپنا کارنامہ بشکل ارمغانِ کلام کی صورت میں پیش کیا ہے۔

ارمغانِ کلام مجموعہ ہے جناب کلام کے کلام کا۔ اسکی تقطیع وغیرہ بالکل داغ جگر کی طرح ہے۔ شروع میں ایک مختصر سا دیباچہ ہے، جسکی بنیاد تاریخ بزادرانجام، مبارکباد اور امید پر ہے قوم کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ بزم ادب کا پرجوش خیر مقدم کرے، اسکے بعد گذارش کے عنوان سے حضرت نسیم نے جناب کلام کے کلام اور بزم ادب جے راج پور کے اس کارنامے پر خوشی کا اظہار کیا ہے، آپ فرماتے ہیں، کہ اسکا مقصد صرف لائٹ لٹریچر کی نشو و نما ہے لیکن جب ہم بسم اللہ کے بعد حضرت کلام کے کلام کا مطالعہ شروع کرتے ہیں تو الف سے لیکر یے تک ہمیں اکثر و بیشتر فرسودہ اور پامال خیالات ہی نظر آتے ہیں، نسیم صاحب فرماتے ہیں، شروع شروع میں کچھ غزلیں اور قصائد ضرور پھیکے نظر آئینگے کیونکہ وہ بالکل آغاز شاعری کے نقوش ہیں لیکن جوں جوں وہ منزل طے کرتے جائینگے کشمیر زار نظر آئیگا،

لیکن ہمیں اپنی کوتاہ نظری پر افسوس ہے کہ جس کشمیر زار کی امید دلائی گئی تھی اسکی سیر سے ہماری تماشا پسند آنکھیں محروم رہگئیں۔

ہم مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے ہم آہنگ ہیں کہ "حضرت کلام کا کلام طفلی دیکھکر ہم کو اُنسے بہت کچھ اُمید ہے - انشاء اللہ وہ آیندہ آسمانِ شاعری پر آفتاب بنکر چمکینگے"۔ لیکن افسوس ہے کہ ارمغانِ کلام کو ہم بزم ادب کا زرّین کارنامہ نہیں کہہ سکتے - درحقیقت جناب کلام کا دیوان طفلانہ نغمہ سنجیوں کا مجموعہ ہے اور اس حیثیت سے یادگارِ طفلی بھی ہے - اسکا فائدہ موصوف کی ذات سے وابستہ ہے، مگر وہ کسی حیثیت سے بھی دنیائے ادب کے لئے مفید نہیں ہوسکتا - ارمغانِ کلام میں کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جنھیں لائٹ لٹریچر کہہ سکتے ہیں لیکن اُنکی تعداد کم ہے، مثلاً

رہ نہ جائے کہیں عاشق کی تمنا دل میں　　　شرم کا پاس کریں وہ مگر اتنا نہ کریں

اب نہیں دلمیں کسی کے آرزوئے حسن وعشق　　　سب کو عبرت ہوگئی میری مصیبت دیکھکر

اسے بھی تابِ سخن بھی نہ رو برو اُنکے　　　پیام بر بھی نہ کچھ کہہ سکا سلام کے بعد

گرے بیہوش ہوکر ہر قدم پر صورتِ موسیٰ　　　تری محفل میں ہم آئے کہ بزمِ طور میں آئے

شکر صد شکر کہ ممنون مسیحا نہ ہوا　　　تیرا بیمار بُرا کیا ہے جو اچھا نہ ہوا

اس قسم کے اور اشعار بھی ہیں، جو کسی نہ کسی لحاظ سے قابلِ داد ہیں، مگر بزم ادب کا فرض تھا کہ اُن اشعار کو انتخاب سے خارج کردیتی جنکا شمار کسی طرح بھی لائٹ لٹریچر میں نہیں ہوسکتا، اور جو مذاق سلیم کے معیار پر پُورے نہیں اُترتے - مثلاً

اُس جانِ جاں کو گھر پہ بلایا کسی طرح　　　نکلی ہماری دل کی تمنا کسی طرح
بوس و کنار میں نہ رہیں کچھ رکاوٹیں　　　شرم و حیا کو گھر سے نکالا کسی طرح

مدت کے بعد مجھکو ہوئی ہے یہ شب نصیب　　　بوسوں کا کرنہ لے بت پُرفن شمار آج

حسن میں اک مہ تمام ہوا		چودھواں لگتے ہی وہ آئینہ رو

اسکو یوں لکھ سکتے تھے۔ چودھویں سال میں وہ آئینہ رو۔

کیا اس قسم کے اشعار کو بزم ادب کی تہذیب گوارا کر سکتی ہے جنکا سننا بھی شمات کے لئے نعرۂ ناگوار سے کم نہیں، معشوق کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی ہے وہ حضرت نظیر اکبر آبادی کے کلیات میں ہوتی تو مضائقہ نہ تھا، مگر بزم ادب کے اس کارنامہ میں اسکا پیوند بے جوڑ ہے۔

معشوق کا یہ کہنا، فرخندہ پئے خجستہ قدم خوش عنان ہوں میں" خدا جانے کب کی بات ہے اور پھر یہ فرمانا "میری ہنسی گراتی ہے سینوں پہ بجلیاں"

دلوں پر بجلیاں گرتی ہیں یا سینوں پر۔

اسکے علاوہ زبان و محاورہ کی غلطیاں بھی اکثر نظر آتی ہیں۔ مثلاً

کسی کا آکر وہ میری بالیں پہ صبح سے شام تک گھلنا		حسد سے جل جل کے رات بھر وہ رقیب کا دل کباب ہونا

معلوم نہیں اس موقع پر گھلنا، کہاں کا محاورہ ہے۔

بعض بعض ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جنھیں شاید توارد کہہ سکتے ہوں، مثلاً

نقش قدم کے سجدے کا اتنا تھا اشتیاق		میں جب گیا گلی میں تری سر کے بل گیا

حضرت مومن فرماتے ہیں،

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل		میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

حضرت کلام نے ایک باریک سا پردہ چھوڑ رکھا ہے، مگر ہیں حقیقت میں دونوں ایک ہی چیز

لاغر تھا اسقدر کہ نہ آیا نظر اسے		ناکام ڈھونڈھکر مجھے پیک اجل گیا

حضرت داغ فرماتے ہیں۔

موت بھی سو بار آئی اور الٹی پھر گئی		شکل پہچانی نہیں جاتی ترے بیمار کی

اسی غزل کا یہ شعر بھی قابل ملاحظہ ہے۔

آخر ہا نہ اٹھتے ہی جوبن کے پھر کوئی		آنچل سرک گیا تو دوپٹہ بھی ٹل گیا

جوبن پر نظر نہ کیجئے، دوپٹہ کا ٹل جانا ملاحظہ کیجئے، اور پھر آنچل اور دوپٹہ کے فرق پر غور کیجئے۔

بہر حال ہم ارمغان کلام کی اشاعت پر کارکنانِ بزم ادب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی انکی کوششیں دنیائے ادب میں مشکور ہوتی رہینگی۔
حجم ۲ صفحہ، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت دیدہ زیب، قیمت دس آنہ (۱۰/)
شائقین ادب اس پتہ پر درخواست خریداری ارسال فرمائیں۔ اخلاق احمد صاحب نسیم جاج ہائی اسکول اعظمگڈھ

کلامِ محروم

منشی تلوک چند صاحب محروم دنیائے ادب کی اُن نمایاں ہستیوں میں ہیں، جو اپنے کمالات کی وجہ سے کسی تعارف کی محتاج نہیں، اکثر ادبی رسالوں میں آپ کی قومی، تاریخی ملکی، نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں، مناظرِ قدرت کی عکاسی، اور جذباتِ فطرت کی مصوری میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ آپ کی تاریخی، قومی، ملکی نظموں کا مجموعہ کلامِ محروم کے نام سے شایع ہوا ہے، جسمیں آپ کی وہ تمام نظمیں شامل ہیں جو اب تک ہندوستان کے ادبی رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکی ہیں۔

آپ کے بیان میں دلکشی اور دلکشی میں ایک خاص اثر ہے۔ قومیت کا اثر آپ کے قلب پر اس درجہ غالب ہے کہ اکثر اشعار اسی رنگ میں ڈوب کر نکلتے ہیں، عاشقانہ غزلوں میں بھی بعض بعض اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے قومی رنگ جھلکتا ہے، اکثر نظمیں ایسی ہیں جو قطعی غیرفانی ہیں۔ اور آپ کی شاعری کے لئے بھی سرمایۂ ناز ہیں،

"شعاعِ امید" کے عنوان سے جو اشعار، کلامِ محروم، حصۂ دویم میں درج ہیں وہ اِس خوبی سے نظم ہوئے ہیں کہ چشمِ بصیرت میں شعاعِ امید کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

جلوۂ صبح یقینی ہے شبِ تار کے بعد — دورِ اقبال ہے ہر قوم کو ادبار کے بعد
قافلے والے اس امید پہ ہیں گرم سفر — منزلِ عیش ہے قطع رہِ پر خار کے بعد
قابلِ رحم تو ہو جائے دلِ غمدیدہ — نگہِ لطف بھی ہو گی ستمِ یار کے بعد

تیسرا شعر خاص طور پر قابل داد ہے۔ حضرتِ محروم اپنے اشعار میں مضامین کی ندرت کیساتھ بندش کی چستی کا بھی بہت کچھ خیال رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آپ کی نظمیں اکثر و بیشتر پُر اثر ہوتی ہیں۔

اگرچہ آپ دہلی اور لکھنؤ دونوں مقاموں سے بہت دور رہیں، لیکن زبان اسقدر شستہ ہے کہ بعض وقت یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ جناب محروم پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ ہاں کہیں کہیں آپ کے شعروں میں ایسے محاورے اور بندشیں بھی نظر آجاتی ہیں جو خصوصیات پنجاب میں شامل ہیں۔ مثلاً کلام محروم حصہ دوم کے صفحہ ۴ پر یہ مصرعہ نظر آتا ہے۔

تاثیر آہ سینے سے ہے تجھکو آزمانا

میں "نے آزمانا ہے" یہ خاص پنجاب کا محاورہ ہے، تعجب ہے کہ جناب محروم بھی ایسی غلطی سے بچ نہ سکے۔ اسی حصہ کے صفحہ ۵ پر "بدنصیب گائے" کے عنوان سے جو نظم ہے وہ مجموعی حیثیت سے بہتر نظم ہے، مگر بعض الفاظ کچھ ایسے غیر مانوس طریقہ پر استعمال کیے گئے ہیں جنھیں دیکھکر تعجب ہوتا ہے۔ نظم کا پہلا بند یہ ہے۔

دنیا میں رہ کے میں نے صدمے جو ہیں اٹھائے　　میں تجھکو گر سناؤں تو سنکے سہم جائے
دریائے شیر کل تک جس گھر میں ہیں بہائے　　اب خوں بہیگا میرا اُس گھر میں ہائے ہائے
ہوگا ثواب اعظم گر تو مجھے بچائے
او جانیوالے میں ہوں اک بدنصیب گائے

"ہائے اور گائے" کو اشباعی حالت میں کھینچ کے پڑھنا ہرگز جائز نہیں، نہ معلوم محروم صاحب نے اسے کیوں جائز سمجھ لیا ہے، دوسرے بند میں مکرر فرماتے ہیں۔

میں بدنصیب گائے اِس گھر میں جب سے آئی
سختی پہ تازہ سختی ہر روز اک اٹھائی

اسمیں بھی "گائے" اشباعی حالت میں موجود ہے۔

بعض بعض تلمیحیں بجائے خود کچھ ایسی مضحکہ انگیز ہوتی ہیں، اور کبھی کبھی موقع و محل کے لحاظ سے ایسی مضحک بنجاتی ہیں کہ پڑھنے والوں کو بیساختہ ہنسی آتی ہے، شعرائے باکمال اِس قسم کی تلمیحات و تشبیہات سے گریز کرتے ہیں۔ کلام محروم حصہ ۲ صفحہ ۸۵ پر یہ شعر درج ہے۔

چونک بھی اب خواب ہستی سے کہ ہے وقت رحیل
بیخبر سوتا ہے کیوں انساں ہے یا خرگوش ہے

غور فرمائیے اس شعر میں اگرچہ خرگوش کی تلمیح موقع کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔ مگر مذاقِ سلیم کو اتنا گدگداتی ہے کہ ہنسی نہیں رکتی۔

بایںہمہ کلام مرحوم کا مطالعہ بہر صورت مفید اور سبق آموز ہے۔ عمدہ اور دلکش نظمیں، پاکیزہ غزلیں قابل دید ہیں۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت حصہ اول عہ، حصہ دوم ۱۲ تیسرے حصہ کی قیمت ٹائٹل پر تحریر نہیں۔ ملنے کا پتہ نراین دت سہگل اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب لاہوری گیٹ لاہور۔

بجلی کے کرشمے

اس کارآمد کتاب کے مؤلف محمد معشوق علی خاں صاحب بی۔ اے علیگ ہیں۔ اور یہ نظامی پریس بدایوں میں چھپکر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (حیدرآباد دکن) سے شائع ہوئی ہے اسمیں برقی قوت کے متعلق گزشتہ و موجودہ تجربات نہایت شرح و بسط سے جمع کئے گئے ہیں، اور ہر تجربہ کے متعلق باقاعدہ تصویر دی گئی ہے، تاکہ شائقین خود تجربہ کر سکیں۔

عبارت سلیس، عام فہم، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت فی جلد مجلد ۱۲ عہ ملنے کا پتہ۔ دفتر انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ حیدرآباد دکن۔

چار چاند

یہ ۴۸ صفحے کا ایک مختصر سا رسالہ ہے، جو چھوٹی تقطیع پر انڈین بک ڈپو اندر کوٹ شہر میرٹھ سے شائع ہوا ہے، حامد اللہ صاحب افسر بی۔ اے نے اس چھوٹی سی کتاب میں بچوں کے لئے چار دلکش اور سبق آموز کہانیاں لکھی ہیں۔ جنھیں پڑھکر بچے علاوہ خوش ہونے کے عمدہ عمدہ نصیحتیں بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

عبارت سادہ اور مختصر، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت نظر فریب، قیمت ۵ر مذکورۂ بالا پتہ سے طلب فرمائیے۔

اعظمی

مشاہیر نظم اردو

یہ نظم ناظم ہردی کی مشہور ابیات مندرجۂ ذیل کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے - اتنا اضافہ میں نے اور کیا ہے کہ مشاہیر سلف کے علاوہ مختلف اصناف شاعری کے بنیائے عصر سخن طرازوں اور دورِ موجودہ کے نامور شعراء کے تخلص بھی نظم کر دیے ہیں - اس مختصر سی نظم میں کم و بیش ایک سو بار و تخلص نظم کئے گئے ہیں - تقدیم و تاخیر سے مراد کسی کو ترجیح و تفوق دینے سے ہرگز نہیں ہے - بلکہ اسے قیود نظم پر محمول فرمایا جائے - نہ دانستہ کسی نامور شاعر کو نظر انداز کیا گیا ہے - اگر کوئی تخلص سہواً رہ گیا ہو تو مطلع کئے جانے پر شامل نظم کر دیا جائیگا۔ برقؔ

ابیات فارسی

شنیدم کہ در روزگار کہن
شدہ عنصری شاہ صاحب فن

چو اورنگ از عنصری شد تہی
بہ فردوسی آمد کلاہ مہی

چو فردوسی آورد سر در کفن
بہ خاقانی آمد بساط سخن

جو خاقانی از دار فانی گذشت
نظامی بملکِ سخن شاہ گشت

نظامی چو جام اجل در کشید
سر چتر دانش بہ سعدی رسید

چو اورنگ سعدی فرو شد زکار
سخن گشت بر فرق خسرو نثار

ز خسرو چو نوبت بجامی رسید
ز جامی سخن بر مقامی رسید

ز جامی بعرفی و طالب رسید
ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

آخری شعر کا اضافہ مرزا غالب نے اپنے قلم سے فرمایا ہے -

ناظم ہردی کے ابتدائی سات شعر ہیں -

نظم اردو

وَلی سے ہوئی ابتدائے سخن | کہ مشہور ہے وہ خدائے سخن
ولی نے جو لی راہِ باغِ جناں | ہوا میر و سودا کا سکّہ رواں
پھر انشا و جرأت ہوئے نامور | رہا اِنکے تاجِ سخن زیبِ سر
بندھی ناسخ۔ آتش کی پھر وہ ہوا | کہ دونوں کا عالم میں شُہرہ ہوا
زمانے نے لی ایک کروٹ جو اَور | ہوا غالب و ذوق و مومن کا دور
جما بعد ازاں رنگِ داغ و امیر | یہ دونوں ہوئے مہر و ماہِ منیر

پسِ داغ چمکا نہ رنگِ سخن
ہوا برق ایسا نہ یکتائے فن

سخندانِ کامل نسیم و حسن | فنِ مثنوی میں تھے یکتائے فن

ہوئے مرثیہ گوئی میں بے نظیر | ضمیر و خلیق و انیس و دبیر
نفیس اور مونس کا چمکا کلام | رشید اور جاوید نے پایا نام

ڈراما نویسی میں مشہورِ عام | ہوا حشر و بیتاب و احسن کا نام

تغزّل کے اب رنگ میں بے عدیل | ہیں شاعر۔ ریاض اور بیخود و جلیل
زبانوں پہ ہے باغ و سائل کا نام | صفی۔ نوح۔ شیدا و مائل کا نام
شفق۔ بزم و مضطر ہیں نازک خیال | جگر۔ غوث و ثاقب ہیں شیریں مقال
عزیز و احسن و یاس ہیں تر زباں | قمر۔ شمس و رونق ہیں شیوا بیاں
سخنور ہیں اطہر۔ دلیر و رفیق | نسیم و تشرف۔ شاد۔ ندرت شفیق

زلالی و بیباک مفتون - ابر عطا - ہادی و کیف و سیماب و صبر
شمیم - آرزو - حسرت و نظم و جوش مبین - برتر و شوق و آزاد و ہوش
دبیر افسر و مہر و تاباں قرار صمیم - اصغر و محو و وحشت - بہار
وجاہت - آثر - محشر و شوخ و ناز یہ قید تعارف سے ہیں بے نیاز

تصوف میں مہر اور ساحر ہیں فرد رہِ معرفت کے ہیں یہ ہم نورد

جو ہے آجکل برمحل شاعری جسے کہتے ہیں نیچرل شاعری
بنا اسکی ڈالی تھی آزاد نے جِلا دی تھی حالی سے اُستاد نے
سُرور اور اکبر نے دی دادِ نظم یہ تھے رنگ میں اپنے اُستادِ نظم
اب اقبال و چکبست ہیں نامدار نظر اور محروم ہیں سحر کار
فدا اوج و نا فرخ و تاجور رواں - سحر - ارماں ہیں نامور
فلک بیدل و کیفی خوش کلام نیاز اور سالک ہیں مشہورِ عام

اب اِن سے ہے تازہ دماغِ سخن
یہ ہیں برق گلچینِ باغِ سخن

حسن فطرت

بادشہ کو بھی میسر اپنے قلعہ میں نہیں جیسی عافیت کہ حاصل مجھکو اپنے گھر میں ہے
اُسکی نظریں ہیں تصنع اور نمائش پر تھیں سادگی کا لطف لیکن میرے ہر منظر میں ہے

اُسکے پائیں باغ میں ایسا نہیں رنگِ بہار جو مجھے قدرت نے دے رکھا ہے سبزہ زار میں
ہے خرامِ ناز بھی اُسکو روش پر ناگوار میں مگر رہتا ہوں سیرِ وادی و کہسار میں

ارشد تھانوی

شاعر کا دِل

نہ کیوں شاعر کا دل ہم مرتبہ ہو ماہِ تاباں کا
بہا کرتا ہے چشمہ اسکے اندر آبِ حیواں کا

یہ حل کرتا ہے پیچیدہ مسائل رازِ ہستی کے
یہ ہی عقدہ کشا معشوق کے گیسوئے پیچاں کا

یہ شاعر کا ہے دل یا ساغرِ گیتی نما کوئی
نظر آتا ہے نقشہ جسمیں کل دنیائے امکاں کا

تماشہ دیکھا رہتا ہے بازیگاہِ عالم میں
ہوا کرتا ہے ظاہر نور اسکے چشمِ پنہاں کا

عروسِ فکر سے اٹھکھیلیاں دن رات کرتا ہی
پھرا کرتا ہے منظر اسکی آنکھوں میں شبستاں کا

دلِ شاعر کا ہے اک قطرۂ خوں شعرِ پُر معنی
یہ اک چھوٹا سا مجموعہ ہے جذباتِ پریشاں کا

دلِ شاعر نہیں یاقوت کی کانِ معلّٰی ہی
ملا ہر شعر کو ہے مرتبہ لعلِ بدخشاں کا

نہ دل شاعر کا چھونا ہے یہ شیشہ، ٹوٹ جائیگا
بنا نقشہ بگڑ جائیگا اس سلطاں کے ایواں کا

نظامِ عالمِ امکاں ہی سارا اسکے ہاتھوں میں
یہی شاعر کا دل ناظم ہی اس دنیائے گرداں کا

یہ ہفت اقلیم کی گھر بیٹھے بیٹھے سیر کرتا ہے
نمونہ ہی یہی شاعر جہاں میں نوعِ انساں کا

یہ دل اک مسکنِ آزادی و عیشِ دوامی ہی
مئے وحدت سے ہی لبریز یہ اک جامِ عرفاں کا

نہیں کر سکتا اندازہ کوئی اس دل کی طاقت کا
پلٹ دیتا ہی اک جنبش میں کل تختہ دوراں کا

دلِ شاعر کی دنیا ہی جدا ہی سارے عالم سے
گذر اسمیں نہ حیواں کا نہ انساں کا نہ سلطاں کا

کبھی دنیائے دل اسکی دو رنگی ہو نہیں سکتی
چڑھا رہتا ہی اسپر رنگ خالی عشقِ یزداں کا

یہی دل نور افزا ہے تجلّی گاہِ عالم کا
کہ ذرہ ذرہ دنیا میں اسی کے فیض سے چمکا

اسی شاعر کے پارہ ہائے دل گردوں پہ تاباں ہیں
اسی کے معجزے کونین میں ہر سو نمایاں ہیں

اسی دل سے ہی وابستہ تغیر سارے عالم کا
اسی دل کے فرشتے عرش اعظم پر ثنا خواں ہیں

پڑے لاکھوں مسیحا ہیں اسی کے گوشۂ دل میں
اسی کی روکشی پر ہر نفس آمادہ سلطاں ہیں

اسی دل کی بدولت مذہبوں میں جان باقی ہے
اسی کے تار رگ سے منسلک اجزائے ایماں ہیں

غرض اس دل کی ہستی ایک عبرت خیز ہستی ہے
ہمیشہ اسکی دنیا مائل وحدت پرستی ہے

منور مجھکو اپنے دل پہ دائم ناز رہتا ہے
کہ یہ سازِ نفس پر زمزمہ پرداز رہتا ہے

گذرتے ہیں مرے ایام اک مستی کے عالم میں
مرا دل چپکے چپکے مائل اعجاز رہتا ہے

پیامِ عیش دیتا ہے تسلی مجھکو عسرت میں
برابر رنج و راحت کا مجھے انداز رہتا ہے

سفر میں اپنے دل کو میں عدم سے ساتھ لایا ہوں
یہی مشکل کشا ہمدم و ہمراز رہتا ہے

سماع کوس رخصت سے کبھی غافل نہیں رہتا
سدا بہرِ سفر یہ گوش بر آواز رہتا ہے

نہیں حالانکہ میں شاعر، مگر یہ دل بنا دیگا
مجھے یہ شعر کا اک عاشقِ کامل بنا دیگا

منوؔر لکھنوی

غزل

وصل میں پچھلے خیالوں پہ ہنسی آتی ہے
انھیں مجھ پر مجھے نالوں پہ ہنسی آتی ہے

اب قیامت کے وہ انداز نہیں کوسوں تک
حشر کے دن تری چالوں پہ ہنسی آتی ہے

میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ ہنسے کیوں مجھ پر
اور انھیں میرے سوالوں پہ ہنسی آتی ہے

کیا کہا لاکھ ہنساؤ نہ ہنسینگے ہرگز
وہ کھلے ہونٹ وہ نالوں پہ ہنسی آتی ہے

زندگانی کی جو ہو جاتی ہیں کچھ امیدیں
موت کو میرے سنبھالوں پہ ہنسی آتی ہے

کل مصیبت کے اندھیروں میں گرے تھے آنسو
آج قسمت کے اجالوں پہ ہنسی آتی ہے

اک نظر دیکھتے ہی آپ کہیں ہوش کہیں
آپ کے دیکھنے والوں پہ ہنسی آتی ہے

میری پھوٹی ہوئی تقدیر میں یہ تھے ساغر
مجھے ان ٹوٹے پیالوں پہ ہنسی آتی ہے

ساغر نظامی

بہار

(از محمد امین نازش بدایونی)

نورِ فلق کی ضو سے ہیں افلاک گلگوں پیرہن
موجِ شفق کی رو سے ہے فرشِ زمیں رشکِ چمن

گوہر ہے آبِ حسن کا بزمِ عناصر کی چمک
جوہر ہے تابِ حسن کا اشیائے عالم کی پھبن

ذوقِ حقیقت ہے عیاں اندازِ گل ہی خود نما
لیتا ہے دل میں چٹکیاں بلبل کا مستانہ سخن

خود ہے شجر خود ہے ثمر خود ہے وہ غنچہ خود ہی بُو
خود ہے وہ گلچیں خود صبا خود ہی سمن خود ہی چمن

لالہ ہے اپنے ہاتھ میں یاقوت کا ساغر لیے
گلہائے سوسن کی زباں ہے غیرتِ نسرین

نرگس کی عشوہ سازیاں پردہ کشائے حور ہیں
شبنم کے آئینہ میں ہے روئے جناں پرتو فگن

وادی کی ہے دلکش فضا ٹیلے زمرد سے فزوں
موجوں پہ عالم وجد کا چشمے ہیں کوثر کا دہن

صحرائے حیرت ناک میں یوں گونجتی ہے بادِ خوش
ہوں شانِ قدرت دیکھکر جیسے فرشتے نغمہ زن

ہے لمبی لمبی گھاس پر قطراتِ شبنم کی جھلک
یا گلرخانِ شوخ کے دامن میں ہیں دُرِ عدن

سُرخی شفق کی دوڑ کر لیتی ہے بوسے پھول کے
غنچے ہیں قیل و قال میں صرفِ تبسم ہے دہن

ہے آبشاروں کی صدا اک نغمۂ الہامِ نو
ہیں آسماں پر رقص کُن سیارگانِ ضو فگن

حوروں کے گیسو چھوڑ کر آئے ہیں جھونکے خلد کے
فردوس کی ارواح ہیں یا عندلیبانِ چمن

آتی ہے رہ رہ کر صدا سجدہ کناں ہوں ڈالیاں
اللہ اکبر کے لئے ہو وقف غنچوں کا دہن

بلبل کے رنگیں بال و پر بنجائیں چترِ زرفشاں
ہے تاجدارِ نامیہ گلزار میں جلوہ فگن

اِس پُر فضا آواز سے اُٹھتی ہے دل میں گدگدی
نیرنگِ ہستی کا سبق پڑھتے ہیں اشجارِ چمن

جو پھول ہیں زیبِ نظر آنکھوں کو دھوکا ہیں وہی
عبرت جتاتی ہے ہمیں دنیا ہے اِک باغِ کہن

گلگشت کر ایسی جگہ جسکو ازل سے ہو بقا
پھولو رے رنگِ شوخ سے گلچیں کا دامن ہو چمن

لطفِ سخن

حضرت مولانا آزاد سبحانی صاحب مدظلہ العالی

دود انگیزیٔ دل گیسوئے شبرنگ سے ہے — تنگیٔ جان فسردہ دہنِ تنگ سے ہے

شور ہر جان میں پاشیدہ تری کاکل کا ہے — فتنہ ہر دور کا بالیدہ ترے ڈھنگ سے ہے

شمع تاباں کی تجلی ہے رخِ روشن سے — گلِ رنگیں کی لہک عارضِ گلرنگ سے ہے

اک صدا ہی تری برہمزنِ جمعیتِ دل — سارا ہنگامۂ جاں ایک لبِ چنگ سے ہے

ہر دم برق سے ہی جلوہ ترا چشمک زن — شعلہ زن ذکر ترا ہر شررِ سنگ سے ہے

جو بھی پیدا ہی تری صورتِ پنہاں کا ہے عکس — جو بھی ہے رنگ تری ہستیٔ بیرنگ سے ہے

کیا عجب ہے جو اشارے میں ہو ذرّہ خورشید — اس طلسمات کی ہستی بس اک آہنگ سے ہے

آہ اک کھینچ کے مرجاؤں مداوا ہے یہی — اسقدر جان خفا قالبِ دل تنگ سے ہے

اب فقط قصۂ ناکامیٔ دل کہنا ہے — اب کمر کھولنا باقی سفرِ لنگ سے ہے

خاک اب تخت ہے اور موئے پریشاں ہے تاج — کام دیہیم سے باقی ہے نہ اورنگ سے ہے

کیوں نہ نیرنگیٔ باطن ہو نمایاں تجھ میں
نسبت آزاد تجھے خواجۂ بیرنگ سے ہے

جناب جگر مرادآبادی

روح اس قالبِ خاکی میں جو مسحور نہو — اس جگہ ہو کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہو

خود ضیا بار جو اک جلوۂ مستور نہو — آئینہ خانۂ عالم میں کہیں نور نہو

خاک ہے سوزِ غمِ عشق کی تاثیر کلیم — دل کا ہر ذرّہ اگر برقِ سرِ طور نہو

اس تقیّد پہ تو عالم ہے یہ آزادی کا — کیا قیامت کرے انسان جو مجبور نہو

ایک کی بھی نہ چلی جذبۂ دل کے آگے
چاہتے سب تھے کہ رسوائی منصور نہو

ہر نفس اسکو محبت میں ہے پیغامِ حیات
آدمی اپنی حقیقت سے اگر دور نہو

عین ایماں ہے انا الحق کا ترانہ لیکن
ہے یہی کفر اگر دیدۂ منصور نہو

کوچۂ عشق سے باہر وہ نکل جائے جگر
جیتے جی خاک میں ملنا جسے منظور نہو

جناب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی

روگ ہیں جان کو دنیا بھر کے
ہم تو پچتائے محبت کر کے

جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں
ملگجے پھول ترے بستر کے

آدمی اپنی حقیقت کو نہ بھول
ٹھوکریں کھاتے ہیں کاسے سر کے

سادگی حسن کا تیرے زیور
حسن قربان ترے تیور کے

پہلے چپ لگ گئی پھر موت آئی
جان لی عشق نے رسوا کر کے

وہی تکلیف سوا دیتے ہیں
زخم گہرے جو نہ تھے خنجر کے

دیکھتے بھی نہیں دنیا کیا ہے
جب گدا ہو گئے تیرے در کے

تم ابھی کچھ تھے ابھی ہو کچھ اور
دیکھ لینے دو ذرا جی بھر کے

زخم میں دل کے بھی اجزا شامل ہیں
چارہ گر دیکھ نہ پھایا سر کے

عقل بیدار معطل ہیں حواس
تجھکو پایا تو مگر مر مر کے

آبلوں کا بھی تو اندیشہ ہے
آہ کر آنکھوں میں آنسو بھر کے

بھولتا ہی نہیں یہ قول اثر
ہم تو پچتائے محبت کر کے

جناب محمود الہ آبادی

بقاءِ زندگی ہے درد کا دل میں ٹھہر جانا
فناءِ زندگی ہے جذبۂ الفت کا مر جانا

لگاہِ ناز جاناں تیری اس رفتار کے صدقے　　کہ آنکھوں سے اترنا دل میں اور دل میں ٹھہر جانا
فقط اک امر ہے عنصر اضداد کا ملنا　　پھر اپنے وقت پر اک دوسرے کا خود بکھر جانا
لحظہ شوق ہوئی جان آ رہی ہے نعش بیجان میں　　ٹھہر جانا ذرا او جانے والے پھر ٹھہر جانا
یں گیا ہوں کس لیے بھیجا گیا اس دہر ہستی میں　　نہ ابتک خود کو پہچانا نہ کچھ رازِ سفر جانا
بونِ عشق کا عمرِ رواں کو یہ اشارہ ہے　　کہ یاس اور غم کی منزل سے بھی خوش ہو کر گذر جانا
ہی ذراتِ اول ہیں کہ جنکا بحرِ ہستی ہیں　　کہیں پر ڈوبنا انکا کہیں پر خود ابھر جانا
اک افسانۂ غم تھا مریضِ ہجر کے دل کا　　کہ آتے ہی تمہارے اسکی نبضوں کا ابھر جانا

سیہ پوش اسلئے ہر نظم ہے محمود دنیا میں
کہ ان سب کے لئے اک حشر ہے اکبر کا مر جانا

حضرت خواجہ عشرت لکھنوی

تر زر ہتے ہیں رنگِ بزمِ عالم دیکھکر　　پاؤں رکھتے ہیں زمینِ شعر میں ہم دیکھکر
ے ثباتیٔ چمن کچھ ایسی حسرت خیز ہے　　جب کلی ہنستی ہے رو دیتی ہے شبنم دیکھکر
درت اچھی ہو تو اچھے اچھے ہوتے ہیں فدا　　قید میں آئے فرشتے حسنِ آدم دیکھکر
ب ادائیں دلکشی کی ہیں تری تصویر میں　　دم فنا ہوتا ہے خاموشی کا عالم دیکھکر

پار ہونا عشق کے دریا سے عشرت ہے محال
ڈوبنے لگتا ہے دل یہ بحرِ اعظم دیکھکر

جناب صدرالدین صاحب سرشار کسمنڈوی

ہ نظر ہے سلسلہ جنبانِ آرزو　　سو بار بڑھا چکی ہے جوا یوانِ آرزو
ارسے جنوں نوازیٔ حسنِ نظر فریب　　ہے دل کا ہاتھ اور گریبانِ آرزو
ہ سے تیرے کتنے جنازے نکل چکے　　تجھکو بھی کچھ خیال ہے او جانِ آرزو
سے نکل رہا ہے دھواں بات بات میں　　اللہ رے سوزِ سوختہ سامانِ آرزو



یہ کہکے دل کا تیر نے قصّہ کیا تمام — لے کھولتا ہوں میں درِ زندانِ آرزو

کیا جانئے سلوک کیا زخمِ دل نے کیا — نکلا لہو میں ڈوب کے پیکانِ آرزو

لے کام اعتدال سے اے شورشِ جنوں — تاراج ہو نہ جائے گلستانِ آرزو

پھر دے رہا ہے حسن صلائے جنوں نواز — پھر جمع ہو رہے ہیں پریشانِ آرزو

کس حسن سے فریب دیا ہے امید نے — پھر شادماں ہیں سوختہ سامانِ آرزو

یوں بیحجاب ہو نہ جمالِ نظر فریب — بیہوش ہو نہ جائیں مریضانِ آرزو

ہر حرف دے رہا ہے نویدِ وصالِ دوست — کس درجہ دل فریب ہے عنوانِ آرزو

اِک آہ بھر کے کھولدیں آنکھیں مریض نے — تیری نگاہِ ناز تھی یا جانِ آرزو

اے انقلابِ دہر بتائے کوئی مجھے — پاتے ہیں کب نجات اسیرانِ آرزو

تو نے بھی اپنے در سے ستمگر اُٹھا دیا — اب کس طرف کو جائیں گدایانِ آرزو

سرشار اُس نگاہ سے پھر ربط و ضبط ہے
پھر جمع کر رہا ہوں میں پیکانِ آرزو

جناب مولوی حافظ محمد اشرف علی صاحب حافظ کانپوری

میں اُنکے حسن جفا دوست کا شکار رہا — نظر ملی تھی کہ اک تیر دل کے پار ہوا

جو قلب سوزِ محبت سے داغدار رہا — نفس نفس مجھے آئینہ بہار رہو

گدازِ غم کی سرور آفرینیاں دیکھو — کہ خونِ دل بھی محبت میں خوشگوار رہو

فریبِ حسنِ تکلم نہ پوچھ اے ہمدم — جب اُسنے وعدہ کیا مجھکو اعتبار رہو

گئی نہ دل سے مرے حسرتِ قدمبوسی — ہوا جو خاک تو خاکِ رہِ نگار ہوا

خدنگ ناز کی کیسی لگی ہے دُہری چوٹ — جو تیر دل پہ پڑا تھا جگر کے پار ہو

رہیگا فرقتِ ساقی میں خاک نشۂ زیست — سرورِ شوق سے اندازۂ خمار رہا

شہید برقِ تبسم ضرور تھا حافظ
کہ دل کی خاک کا ہر ذرّہ بیقرار رہوا

زمانہ

جلد ۴۰ مئی سنہ ۱۹۲۳ء نمبر ۵

ملکانہ راجپوت مسلمانوں کی شدھی

شمالی ہندوستان مین ملکانہ راجپوتون کی شُدھی کا مسئلہ اپنے نتایج کے اعتبار سے جتنا اہم ہورہا ہے اُتنا شاید اور کوئی مسئلہ نہوگا۔ بالخصوص اسلئے کہ جہان تک اخبارون سے ظاہر ہوتا ہے ہندو جماعت اس تحریک کو جاری رکھنے اور قوی تر بنانے کے لئے متفق ہوگئی ہے۔ شاید ہندوستان کی تاریخ مین پہلی بار آریہ سماج اور سناتن دھرم، مصلحین اور راسخین مین اتفاق اور اتحاد نظر آرہا ہے۔ کوئی شک نہین کہ ہمارے مسلم برادران وطن اس اتفاق کو شُبہ آمیز نظرون سے دیکھ رہے ہین اور اس اجتماع کو اپنے قومی وجود کے لئے خوفناک سمجھتے ہین۔ اب تک تبلیغ کے میدان مین مسلمان یکّہ تاز تھے۔ کوئی انکا رقیب نہ تھا۔ لیکن یہ صورت حال بہت سُرعت سے تبدیل ہوتی جارہی ہے اور مسلمانون کو یہ اندیشہ ہونے لگا ہے کہ کہین یہ تحریک ہمارے قومی زوال کا پیش خیمہ تو نہین ہے۔ آریہ سماج سے انھین زیادہ خوف نہین تھا جب تک شُدھی کی تحریک آریہ سماج تک محدود تھی وہ اُسکی زیادہ پروا نہ کرتے تھے۔ لیکن ہندوؤن کی مجموعی طاقت کو اسکی امداد اور اشاعت پر آمادہ دیکھکر مسلمانون مین سخت بدگمانی پیدا ہوگئی ہے۔ اب بھی کچھ غیر متعصب مسلمان کانگریس کے کامون مین شریک ہوتے ہین اور اس مغایرت کے فتنہ کو فرو کرنے کی کوشش مین منہمک ہین۔ مگر انھین جمہور اسلام اپنے مذہبی دائرہ سے خارج

سمجھتا ہے۔ ایسے آدمیون کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے جو سوراجیہ کی تحریک ہی سے بدظن ہو گئے ہین اور سوراجیہ کو 'ہندو راجیہ' کا مترادف کہنے لگے ہین۔

ہم یہ مانتے ہین کہ ہر ایک قوم کو اپنے مذہبی صداقتون کی اشاعت کا کامل استحقاق ہے اس عام حق سے کسی ذی فہم انسان کو انکار نہین ہو سکتا۔ مگر اسکے ساتھ ہی ہمکو یہ بھی معلوم ہے کہ تبدیل مذہب کی ہر ایک مثال بیشمار آدمیون کو اس سے کہین زیادہ روحانی صدمہ پہونچاتی ہے جہانتک اونکو روحانی سکون عطا کرتی ہے ایک ہندو مسلمان ہوتا ہے تو لاکھون ہندوؤن کے دلون مین تعصب کا جوش پیدا ہو جاتا ہے' یہان تک کہ وہ اس مرتد کو جان سے مار ڈالنے کی تدبیرین سوچنے لگتے ہین۔ مذہبی توہین کا سب سے مہلک پہلو یہی ہے کہ کوئی آدمی اس سے منحرف ہو جائے۔ یہ گویا اُس مذہب کے خامی کا اعلان ہے۔ اور ایسے شخص کی نہایی جو ہمیشہ اسکا مطیع رہا ہے۔ ایک ہندو بدھوا کسی مسلمان کے نکاح مین آجاتی ہے تو ہندوؤن کو اِس سے جتنا صدمہ ہوتا ہے اُسکا اظہار نہین کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے لوگ مذہب پرور واقع ہوئے ہین۔ یہان مذہب نے "قومیت' ذات' حسب ونسب' سب پر سکہ جما لیا ہے۔ اور اس زمانے مین مسلمان ہندوؤن سے کوسون آگے ہین۔ اسلئے ہم اندازہ کر سکتے ہین کہ کسی مسلمان کے ہندو ہو جانے سے انھین کتنا صدمہ ہوگا۔ ایسی حالت مین کیا یہ مناسب نہین ہے کہ تبلیغی تحریکین بند کر دی جائین۔ اور چند افراد کے روحانی اطمینان کے لئے ایک قوم کے دل کو ایذا نہ پہونچائی جائے۔ مذہب اپنے سچے معنون مین خالق اور معبود کا معاملہ ہے۔ ہر ایک شخص کو اختیار ہے وہ جس طریق سے چاہے معبود کی پرستش کرے۔ مگر اسکی کیا ضرورت ہے کہ اس خفیف سے واقعہ کی سارے ملک مین تشہیر کیجائے۔ خواہ مخواہ جلوس نکالے جائین۔ جشن منایا جائے۔ اِس سے کسی مذہب کی وقعت زیادہ نہین ہوتی' کم ہوتی ہے۔ ہم گلہ نہین کرتے' مگر حق ہمکو یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہندوؤن مین اس تحریک کی بنا مسلمانون نے ڈالی۔ وہی اسکے ذمہ دار ہین۔ انھین کے مذہبی جوش نے ہندوؤن کو اجتماع اور انضباط پر آمادہ کیا۔ جن صوبون مین مسلمانون کی آبادی زیادہ ہے وہان ہندوؤن کو آسائش اور اطمینان میسر نہین۔ انکی لڑکیان' انکی بیوائین ہمیشہ اسلامی دست برد کا شکار ہوتی رہتی ہین اور مسلمان سرغنایانِ قوم سکوت کی زرین پالیسی

توڑنا مناسب نہین سمجھتے۔ ہم ہندوؤن کو اس تحریک کے اجرا کے لئے متہم نہین کرتے لیکن چونکہ ہندو قوم زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ باخبر، قومیت کی زیادہ دلدادہ ہے۔ اسوجہ سے یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ بالآخر اسنے بھی تبلیغ کا وہی رویہ اختیار کیا جس پر اُسے خود اعتراض تھا۔ چاہے بانگ دہل سے اعلان کیا جائے کہ ہندو قوم نے شدھی کی تحریک محض اپنا شیرازہ باندھنے کے لئے جاری کی ہے۔ اور اُسے کسی فرقہ یا مذہب کو نقصان پہونچانا منظور نہین ہے۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہین رہ سکتے کہ یہ صریح Retaliation کی پالیسی ہے۔ اور اسی موقعہ پر جبکہ ہمنے کو سیاسی معاملات مین ممنوع سمجھ رکھا ہے، مذہبی معاملات مین اسپر کاربند ہونا ناقابل عفو ہے۔

یہ مادیات کا دور ہے۔ مادی اغراض و مقاصد جسکا مجموعی نام سیاسیات رکھا گیا ہے زندگی کے کل شعبون پر حاوی ہین۔ مذہب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہین۔ ہم آج کل مذہب کی تلقین اور تبلیغ روحانی صداقتون کی بنا پر نہین کرتے۔ اسمین سیاسی اور ملکی فوائد مضمر اور مخفی ہوتے ہین زمانۂ قدیم مین مذہب کل دنیاوی امور پر حکمران تھا۔ اب سیاسی حکومت اور چیرہ دستی کا زمانہ ہے ہندوستان مین عیسائیت کی منادی اسلئے ہو رہی ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کو ایسی جماعت کی امداد کا یقین ہو جائے جو ہم ملت ہونے کے باعث اسکے دامن سے وابستہ رہنا اپنے وجود کے لئے لازمی سمجھے۔ ہندو بھی اسی سیلاب کی زد مین آگئے ہین۔ اسلامی حکومت کا زمانہ مذہبی تعصبات کا زمانہ تھا۔ اسوقت تبلیغ اسلام کا منشا سیاسی نہین بلکہ محض مذہبی تھا۔ اور غالباً موجودہ زمانہ مین بھی یہ تحریک سیاسی وجود پر مبنی نہین ہے۔ مگر ہندوؤن کی شدھی کی تحریک خالصاً اور کلیتہً سیاسی اُمور پر مبنی ہے۔ ذات کی تفریق کو مٹانا، اُصولون کو ہم آغوش کرنا، اور اسی قسم کی دیگر تمدنی تحریکین سیاسی فوائد کو مدنظر رکھکر جاری کی گئی ہین۔ ہمارا حُب وطن۔ حُب ملت ہے۔ ہم کسی امر کو ملکی نقطۂ نظر سے نہین، بلکہ مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہین۔ ہم زبان سے چاہے کچھ بھی کہین، مگر دل سے ہم پہلے ہندو اور بعد کو ہندوستانی ہین۔ اسمین شک نہین کہ دیگر مہذب ملکون مین بھی حب وطن نے حب ملت کو کلیتہً محو نہین کیا ہے۔ مگر وہان مذہب کی حیثیت ثانوی ہے۔ انکی نگاہین وسیع ہیں۔ وہ کسی معاملہ کو ملکی اعتبار سے جانچنے کے عادی ہین۔ فرانس، جرمنی یا امریکہ مین اگر ہندو یا مسلمان تعداد مین زیادہ ہونے لگین تو وہان کھرام نہین مچیگا۔ امریکہ مین آج ہندوؤن کی تعداد اتنی زیادہ

ہوجائے کہ وہان ہر ایک تعلیم گاہ مین ہندی کی تعلیم کو جبری قرار دینے کا مسئلہ دارالقوانین مین منظور ہوجائے تو یقیناً امریکہ والے اسے اپنے ملک کے لئے تباہی کا شگون نہ خیال کرین گے۔ وہان تفریق کی بنیاد رنگ ہے۔ مذہب نہین۔ ہم یہ نہین کہتے کہ انکے تفریق کی بنیاد ہماری بنیاد مخاصمت سے کم مضر ہے۔ وہان بھی آئے دن سب وشتم کی نوبت آتی رہتی ہے۔ مگر انکی تقدیر اپنے ہاتھ مین ہے۔ اس مسئلہ پر انکی زندگی یا موت مبنی نہین ہے۔ جہان اور متنازعہ امور ہین مثلاً مزدورون اور سرمایہ دارون کا مسئلہ، وہان ایک یہ بھی ہے۔ مگر ہندوستان کی حالت بالکل جداگانہ ہے۔ ہندو اور مسلمان دونون ہی سیاسی، تمدنی، مالی، مسائل مین مذہبی تفوق کے حامی ہین اور حقیر فوائد کے لئے متہم بالشان قومی اغراض کو قربان کردینے مین پس وپیش نہین کرتے۔

آئیے اب دیکھین کہ اس شدھی سے ہندوؤن نے کیا فائدہ سوچ رکھا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ہندوؤن کی تعداد زیادہ ہوجائیگی اور اسی مناسبت سے مسلمانون کی تعداد کم ہوگی مگر کیا قومی معاملات مین تعداد ہی سب کچھ ہے۔ تجربہ تو یہ بتلاتا ہے کہ فی زمانہ تعداد کی کوئی وقعت نہین۔ جرمنی کے ۶ کروڑ باشندے روے زمین کے باشندون کو دعوتِ جنگ دے سکتے ہین۔ ۴ کروڑ کا انگلستان ۳۲ کروڑ کے ہندوستان پر کامیابی کے ساتھ حکمرانی کرسکتا ہے۔ تو تعداد کی اتنی اہمیت کیون ہے؟ سکھون کی تعداد کبھی ۱۶ یا ۱۷ لاکھ سے زائد نہ تھی لیکن اُنھون نے پنجاب اور سرحدی صوبون پر حکومت کی اور اگر انگریزون نے انکے قدم نہ روک دیئے ہوتے تو غالباً وہ اپنی سلطنت کے حدود کو اور بھی زیادہ وسیع کرسکتے۔ غوری یا غزنی دس بیس کروڑ کی جماعت لیکر ہندوستان پر حملہ آور نہین ہوئے تھے۔ یونان نے کسی زمانہ مین عالمگیر سلطنت قائم کی۔ اٹالی بھی ایک زمانہ مین سارے یوروپ پر حاوی تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عددی فوقیت سیاسی فوقیت کی موجب نہین بلکہ باہمی انضباط اور اتفاق ہی وہ چیز ہے جو قوم کو قوی اور باا‌ثر بنادیتی ہے۔

ہندو آج ۲۴ کروڑ ہین اگر بہت سرگرمی سے کام لیا گیا تو غالباً دو چار سال مین ۲۴½ کروڑ ہوجائین گے۔ اِس سے زیادہ کسی طرح نہین ہوسکتے۔ سارے ملک کو ہم مذہب بنانے کا خیال جنون سے زیادہ وقعت نہین رکھتا۔ تو جب ۲۴ کروڑ ہندوؤن نے اپنے کو سیاسی غلامی

سے آزاد کرنے کے ناقابل پایا تو ½ کروڑ ہندوؤن کے اضافہ سے کیا توقع کی جا سکتی ہے - شاید
زیادہ سے زیادہ اسکا اثر یہ ہوگا کہ ایک یا دو ممبر کونسل مین زیادہ ہو جائین - تو اتنے حقیر نتیجہ
کے لئے اسقدر شور و شغب کی کیون ضرورت سمجھی جاتی ہے - کیا اس تحریک کے حامیون کو اتنا بھی
نظر نہین آتا کہ اس سے باہمی مغائرت بڑھتی جاتی ہے اور ہم روز بروز سوراجیہ کے منزلِ مقصود
سے دور ہوتے جاتے ہین - وہی امرت سر ہے جہان تین سال قبل ہندوؤن اور مسلمانون نے
خونی یگانگت کا ایسا اونچا معیار پیش کیا تھا جسکی نظیر ہندوستان کی تاریخ مین مشکل سے ملسکتی ہے
اُسی امرتسر مین آج دونون فرقون مین خونریزی کا بازار گرم ہے ! اسکے لئے ہم ایک بڑی حد تک
اسی شدھی کی تحریک کو موردِ الزام سمجھتے ہین غنیمت ہے کہ ابھی تک کانگرس کے حامی مسلمانون نے
تحمل اور ضبط سے کام لیا ہے - مگر اب اسکی علامتین نظر آ رہی ہین، جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی
ایک تازہ تقریر سے ثابت ہوتا ہے (خدا کرے وہ رپورٹ نادرست ہو) کہ اب اُن لوگون کا تحمل بھی
انتہائی حد تک پہونچ گیا ہے اور یہی کیفیت رہی تو وہ دن دور نہین ہے جب ہمکو انکی مخالفت کا
علانیہ سامنا کرنا پڑیگا - یہ خبر بھی جب اُس قدسی صفات، فنا فی القوم، پاک نفس بزرگ کو ملیگی جو اسوقت
برودا جیل مین اپنے قوم کا کفارہ ادا کر رہا ہے تو معلوم نہین کہ اُسکے سریع الحس دل پر کیا گذریگی -
ہندو مسلم اتحاد اسکے قومی تعمیر کی بنیاد تھی - اُسے اس نے اپنے خونِ جگر سے قائم کیا تھا - وہ اسی
مضبوط بنیاد پر اپنی عالیشان عمارت کھڑی کرنی چاہتا تھا - اس سے قبل زمانۂ حال کے مدبرون
مین کسی نے اس بنیاد کو مستحکم اور پایدار بنانے کی ضرورت نہین سمجھی، یا اُنہین اسکی صلاحیت ہی نہ تھی -
مگر افسوس ہے کہ آج ہمارے چند مذہبی فدائیون کی مجنونانہ سرگرمی اس بنیاد کو متزلزل کئے دیتی
ہے - ہمکو ہندوؤن کے تدبر پر اعتماد تھا - ہمکو اندیشہ تھا کہ ہندو قوم کی جانب سے اس اتحاد کو
کوئی اندیشہ نہین ہے - اگر اندیشہ تھا تو مسلمانون کی جانب سے کہ کہین وہ اربابِ اختیار کی
تحریص و ترتیب کا شکار ہو جائین - مگر ہوا کیا ؟ ہندوؤن نے پہلے اس بنیاد پر پھاوڑا چلایا -
اور یہ حضرات دلیلین کیسی پیش کرتے ہین ! کوئی کہتا ہے ہندو اپنے تئین مضبوط بنا رہے ہین اور
مسلمانون کو خوش ہونا چاہئے کہ انکے برادرانِ وطن مین مقابلہ اور مجادلہ کی قوت پیدا ہو رہی ہے
اس عقل پر آنسو بہانے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے - ایک بھائی کو دوسرے بھائی کا گلا گھونٹ کر

مقابلہ کا سبق سکھایا جا رہا ہے - اس پہلو سے دیکھا جائے تو ہمین ہندوستانیون سے زیادہ بہمہ صفت موصوف اور کوئی قوم نظر نہ آئیگی - کیونکہ یہان ہر ایک گھر ایک اکھاڑہ ہے - اور وہان بھائی بھائی، باپ بیٹے مقابلہ او رمجادلہ کی مشق کر رہے ہین - ہم سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہوگا!

دنیا مین سب سے خوفناک کام مذہبی تعصبات کو برانگیختہ کرنا ہے - یہان تک کہ سلطنتین بھی اس دائرہ مین قدم رکھنے کی جرأت نہین کرتین - مگر ہندوؤن کی دلیر قوم اسوقت شجاعت کے جوش مین کسی رکاوٹ کی پروا نہین کرتی - کوئی مارشل لا اور سخت سے سخت جبری قوانین اتنے ہلاک نہین ہو سکتے جتنے برانگیختہ تعصبات اس سے مستورات کو باہر نکلنا مشکل ہو جائیگا - امرتسر مین ایک ہندو لڑکی کی بے حرمتی نے کتنی جانین ہلاک کین - ایسے حادثے روز ہی وقوع مین آتے رہینگے - اور اس طرح روز ہی خون خرابہ ہوتا رہیگا - اگر اس باہمی جنگ و جدل سے کوئی تیسری پارٹی فائدہ نہ اٹھانیوالی ہوتی اور ہندو اور مسلمانون ہی کے شکست اور فتح پر مسئلہ کا دار و مدار ہوتا تو ایک فریق دوسرے پر غالب آکر اپنے تئین مبارکبادی کا مستحق سمجھ سکتا تھا - لیکن جب ہم دیکھ رہے ہین کہ اس قسم کے اختلافات ہماری غلامی کی زنجیرون کو اور مضبوط کئے دیتے ہین تو قرین قیاس نہین معلوم ہوتا کہ کیونکر کوئی فہمیدہ شخص ان حالات کو مطمئن نظرون سے دیکھ سکتا ہے - ہمارے باہمی اتفاق نے دشمنون کے پتے پانی کر دیئے تھے - اتنا اہم ہوتے ہوئے بھی یہ ہماری قومی قلعبندی کا کمزور ترین پہلو تھا - حریف اسی مقام پر اپنی مرکزی طاقت کا اثر ڈالنا چاہتا تھا - اور ہماری ناعاقبت اندیشی اور کوتاہ نظری کے باعث اسکی کوششین کامیاب ہوگئین -

ہم شدھی کے حامیون سے پوچھتے ہین کیا ہندوؤن کو مستحکم بنانیکا یہی ایک وسیلہ ہے انکو کیون نہین اپناتے جنکے اپنانے سے ہندو قوم کو اصلی قوت حاصل ہوگی - کرورون اچھوت عیسائیون کے دامن مین پناہ لینے چلے جاتے ہین - انھین کیون نہین گلے سے لگاتے ہو اگر آپ قوم کے سچے ہی خواہ ہین تو ان اچھوتون کو اٹھائین، ان پامالون کے زخم پر مرہم رکھین - انھین تعلیم اور تہذیب کی روشنی پہونچائین - اعلیٰ اور ادنیٰ کی قیدون کو مٹائین - چھوت چھات کے بے معنی اور مہمل قیدون سے قوم کو پاک کیجئے - کیا ہماری راسخ الاعتقاد مذہبی جماعتین ڈومون اور چمارون سے برادرانہ مساوات کرنے کے لئے تیار رہین ؟ اگر نہین ہین تو انکی شیرازہ بندی

کا دعویٰ باطل ہے - آپ یا تو حکام کی ریشہ دوانیون کے شکار ہو گئے ہین یا مذہبی تنگ نظری نے آپ کی بصارت کو غائب کر دیا ہے - آپ کو واضح ہو کہ مسلمانون سے دشمنی کر کے، اپنے پہلو مین کانٹے بو گئے، آپ اپنی قوم کو مضبوط نہین کر رہے ہین - آپ مسلمانون کو جبراً قہراً حکمران قوم کی مدد لینے کے لئے مجبور کر رہے ہین - آپ اپنی تلوار مقابل کے ہاتھ مین دے رہے ہین - آپ کا خدا ہی حافظ ہے - پھر بھی کیا خبر ہے کہ جن مسلمانون یا برائے نام مسلمانون کو پاک کرنے کے لئے آپ ساری قوم کو تباہی کی طرف لئے جا رہے ہین وہ ہمیشہ ہندو دامن سے وابستہ رہین گے؟ کم از کم سابقہ تجربات تو اس استقلال کی شہادت نہین دیتے - اور سماج نے جتنے معرکے کی شدھیان کین، ہر موقعون پر دھوکا کھایا - دھرم پال دھرم بیر وغیرہم، سب کے سب آج پھر مسلمان ہین - تو کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ ملکانے راجپوت اس نئی مہمانی کا لطف اُٹھانے کے بعد اپنے گھر کی طرف رُخ نہ کرین گے - ہمکو شک ہے کہ اس جوش و خروش کے بعد جب ان کو ہندوون کو ہندو سوسایٹی سے کما حقہ واقفیت ہو گی، وہ دیکھین گے کہ ہمکو شدھی سے کوئی خاص فائدہ نہین حاصل ہوا، ہمارے ساتھ اب بھی وہی چھوت چھات جاری ہے، ہماری اولادون کی شادیون مین اب اور بھی زیادہ رکاوٹین پیدا ہو گئی ہین تو متنفر ہو کر پھر اسلام کا دروازہ کھٹکھٹائین گے - مسلم سربرآوردگان قوم کی پالیسی کی جتنی مدح و ستائش کیجائے وہ کم ہے - وہ معترف ہین کہ ہندوؤن کو اپنی مذہبی تبلیغ کا کامل استحقاق ہے - لیکن جب یہ تبلیغ انفرادی حیثیت سے گذر کر مجموعی صورت اختیار کر لیتی ہے - جب اخبارون مین اسکے زور اور ترقی کی خوش آیند خبرین شائع ہوتی ہین، جب اس خوشی مین سبھائین ہوتی ہین، مبارکباد دی جاتی ہے چندے ہوتے ہین، والنٹیر جمع کئے جاتے ہین، ایک باقاعدہ شدھی کیمپ کھولدیا جاتا ہے - تو صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے - اور اُنکا یہ قول بالکل صحیح ہے،

زمیندارون اور کاشتکارون مین جا بجا بدمزگیان ہوتی رہتی ہین - انکا شمار ملک کے معمولی واقعات مین کیا جاتا ہے - اُس طرف کسی کی توجہ بھی نہین ہوتی - لیکن اگر یہی بدمزگیان زیادہ اجتماعی صورت اختیار کر لین، کسانون کے جتھے قائم ہو جائین، اُدھر زمیندارون کی ٹولیان بنجائین اور آپس مین باقاعدہ جنگ چھڑ جائے تو سارے ملک مین واویلا مچ جائیگا -

بڑے شد و مد کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ ملکانہ تو دراصل ہندو ہین - انھین مسلمان سمجھنا ہی غلطی ہے - وہ ہندو نام رکھتے ہین ہندوؤن کے دیوتاؤن کی پوجا کرتے ہین، شادیون مین برہمنون کو بلاتے ہین - صرف مردے دفن کرتے ہین اور ختنہ کراتے ہین - اسلئے انھین پھر ہندو دائرے مین لیکر ہم مسلمانون پر کوئی زیادتی نہین کر رہے ہین - مگر سوال تو یہ ہے کہ اب تک ملکانون کا شمار مردم شماری کے کاغذات مین کس ذیل مین ہوتا تھا - ہندوؤن مین یا مسلمانون مین ؟ جب یہ ظاہر ہے کہ وہ مسلمان شمار کئے جاتے ہین تو انھین تبدیل مذہب پر آمادہ کرنا یقینا مسلمانون کی اعدادی قوت کو ضرر پہونچانا ہے - ہندوؤن مین کتنے ہی ایسے فرقے ہین جو اسلامی رسم و رواج کی پابندی کرتے ہین - پانچون پیرون کی پرستش کرتے ہین، سید غازی کے مزار پر سجدے کرتے ہین، تعزیون کو شربت چڑھاتے ہین، محرم مین سبز کپڑے پہنکر نکلتے ہین - اگر اسی دلیل پر آج وہ سب کے سب مسلمان ہو جائین تو کیا ہندو یہ خیال کرکے اپنے کو تسکین دے لین گے کہ وہ تو برائے نام ہندو تھے - ہندوؤن مین ایسے فرقے موجود ہین جو کاشتکاری کرتے ہین، مسلمانون کے گھر کے جھوٹے ٹکڑے کھاتے ہین، مگر آج انکے مسلمان ہونے کی خبر پاکر ہندو جامے سے باہر ہو جائین گے - اسی لئے کہ اس سے انکی تعدادی قوت معرض خطر مین آتی ہے - یہ بھی ایک حجت پیش کیجاتی ہے کہ ملکانے خود بخود دست بستہ التجا کر رہے ہین کہ ہمین ہندو برادری مین داخل کیجئے - ہم اب مسلمان رہنا نہین چاہتے - مانا - مگر کیا اب تک ملکانے سوتے تھے، یا آج کسی معجزے سے انکی مذہبی ارادت ہندوؤن کی طرف منتقل ہو گئی ہے - کوئی تحریک بلا خارجی تحریک اور اشتعال کے عالمگیر نہین ہوا کرتی - نمک ہی کے اضافہ محصول کو لے لیجئے - سیاسی اور باخبر حلقون مین اس پر جسقدر رجون و چرا ہو رہی ہے اسکا عشر عشیر بھی غریب دیہاتیون مین نہین ہے جن پر اس اضافے کا بار پڑیگا - عوام مین اشتعال پیدا کرنے سے ہوتا ہے - یہ شدھی کی تحریک بھی اسی قسم کی ہے - شدھی کے حامیون نے مہینون اور برسون سے انھین تیار کی ہوگی، ڈھیلے توڑے ہونگے، کنکر چنے ہونگے، پانی سے سیراب کرکے ڈھیلون کو نرم کیا ہوگا، تب جاکے اب تخم ریزی کا موقعہ آیا ہے - اس قسم کی دلیلین پیش کرنا اپنے کو تودۂ تضحیک بنانا ہے -

سمجھ مین نہین آتا کہ یہ تحریک اس خاص موقعہ پر کیون جاری کی گئی مسلمانون کے دلین

یہ شک پیدا ہونا فطری ہے کہ انہیں ملاکر انھیں دوست بناکر تو یہ بغلی گھونسہ نہیں لگایا جا رہا ہے جبتک اُنسے چشمک تھی رقیبانہ مخالفت کا ہنگامہ گرم تھا تب تک ہندوؤں کو یہ تحریک جاری کرنے کی ہمت نہیں پڑی - اب جب اُنسے برادرانہ اتحاد قائم ہونا شروع ہوا تو ہندوؤں کو انکی جانب سے کوئی اندیشہ نہیں رہا ؟ یہ سوال ہر ایک مسلمان کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے اور اسے منطقی انتہا تک لیجانے سے اُسے گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ سب دلجوئیاں اور تلطف آمیزیاں یہ اتحاد اور ارتباط ہمیں صفحۂ ہند سے مٹانے کا پیش خیمہ تو نہیں ہے - اس گمان کا ازالہ کیونکر کیا جائے - دلیلوں سے انکا ازالہ نہیں ہوتا - جب حامیانِ شدھی ڈنکے کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ ہم اس تحریک سے ہرگز دست بردار نہوں گے چاہے اس کے نتائج کتنے ہی ناخوشگوار کیوں نہوں ہم تقدیر کی سی ثبات کے ساتھ خموشی سے موانعات کی مطلق پرواہ نکرکے اس تحریک کو جاری رکھیں گے - تو ایسی حالت میں اس گمان کا ازالہ ہونا تو دور رہا وہ اور واثق ہوتا جاتا ہے - یہ ثبات اور عزم کسی زیادہ کارآمد تحریک کے لئے موزوں تھا !

شدھی کے حامیوں سے تو اب ہمیں زیادہ معقول پسندی کی اُمید نہیں - انھیں مذہبی جنون نے از کار رفتہ کر رکھا ہے - مگر ہم ہندو قوم سے پوچھتے ہیں اب ایسی حالت میں شدھی تحریک کے متعلق آپ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہتے ہیں ؟ کیا آپ اسکے حامیوں کی دامے درمے سخنے امداد دیکر ہمیشہ کے لئے ہندو مسلم اتحاد یا دوسرے لفظوں میں سوراجیہ اور قومی حکومت سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں یا اپنی زبانی اور عملی ہمدردی کو اس تحریک سے الگ کرکے اس اتحاد کو قائم رکھنا چاہتے ہیں - اتنے ہی دنوں میں بہت کچھ نقصان ہوچکا ہے - ضبط اور تحمل کی رسیاں تن گئی ہیں گھر میں بڑی سینڈ پڑ گئی ہے لیکن اگر آپ اب بھی چونکے تو اس نقصان کی تلافی ہوسکتی ہے ضبط و تحمل کی رسیاں پھر ڈھیلی ہوسکتی ہیں اور چور سینڈ کے دروازے سے بھاگ سکتا ہے - یہی موقعہ آپکے جاگنے کا ہے - یہی موقعہ آپکو آنیوالی تباہی سے بچنے کا ہے ایک جھپکی اور لے لی سہل انکاری سے گھاٹ پر پڑے رہے تو پھر جاگنا بے سود ہے کیونکہ اسوقت تک آپ کا سب کچھ غائب ہوچکا ہوگا - ہندوؤں کی مذہبی رواداری مشہور ہے - مذہبی مزاحمت انکے یہاں ممنوع ہے - یہ موقع ہے کہ ہم اس رواداری کا اظہار کریں - اور پھر پچھتانا اور ہاتھ ملنا بے سود ہوگا -

پریم چند

میرا بائی

میرا بائی[1] جودھپور کے راٹھور خاندان سے تھی اور اودے پور کے سیسودیا خاندان میں مہارانا سانگا جی کے ولی عہد بھوج راج کے ساتھ بیاہی تھی۔ یہ رتن سنگھ کی اکلوتی بیٹی تھی اور کڑکی میں تقریباً سنہ ۱۴۹۸ء میں پیدا ہوئی تھی۔ بچپن ہی کے زمانہ میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ جب یہ حال دوداجی کو معلوم ہوا تو اپنے پاس بلا لیا اور بڑے لاڈ پیار سے پرورش کی۔ جب اسکی عمر تقریباً ۱۶ سال کی ہوئی تو رتن سنگھ نے سنہ ۱۵۱۶ء میں رانا سانگا کے لڑکے بھوج راج سے شادی کر دی اور یہ اپنی سسرال چتوڑ چلی گئی تھی۔

ٹاڈ راجستان میں میرا بائی کو راجا کُنبھا کی بیوی لکھا ہے مگر یہ غلط ہے کیونکہ رانا کُنبھا تو میرا بائی کے شوہر کے دادا تھے۔ اور میرا بائی کی وفات سے ۲۵-۳۰ برس پہلے مر چکے تھے۔ پنڈت گوری شنکر صاحب کا یہ خیال ہے کہ چتوڑ کے قلعے پر کُنبھ شام جی کا مندر رانا کُنبھا کا بنوایا ہوا ہے۔ اسکے پاس ایک اور مندر ہے جسکی تعمیر میرا بائی سے منسوب ہے۔ ان دونوں کے پاس پاس ہونے سے شاید ٹاڈ صاحب نے دھوکا کھایا ہو۔

میرا بائی کی شادی رتن سنگھ نے بھوجراج سے اس امید پر کی تھی کہ آگے چلکر میرا بائی ملکہ سلطنت بنیگی مگر افسوس قسمت میں اور ہی کچھ لکھا تھا۔ میرا بائی عین عالم جوانی میں دنیا کے سارے آرام و آسائش سے دست بردار ہو گئی۔ یعنی اسکے شوہر نے ہمیشہ کے لئے اسکا سہاگ ٹھنڈا کر دیا۔ راجپوتانہ کے تاریخ کی تاریکی کچھ ایسی ہے کہ باوجود تلاش بسیار کنور بھوجراج کی وفات کی صحیح تاریخ نہیں ملتی، مگر گمان غالب ہے کہ سنہ ۱۵۱۶ء اور سنہ ۱۵۲۶ء کے اندر اندر یہ سانحہ پیش آیا ہے۔

میرا بائی کو شوہر کے انتقال کا سخت صدمہ ہوا۔ مگر بہت جلد حقیقت میں نگاہوں کے سامنے سے

[1] اس مضمون میں منشی دیبی پرشاد صاحب کی تحقیقات اور کتاب ٹاڈ راجستان، میرا بائی کا جیون چرتر، بھگت مال، وغیرہ وغیرہ سے مدد لی گئی ہے۔

پردہ ہٹ گیا۔ دنیا کی فانی لذتوں کا انجام معلوم ہوگیا، اور ابدی خوشی اور راحت کی جستجو کرنے لگی۔

لڑکیوں کو عموماً گڑیوں کا زیادہ شوق ہوا کرتا ہے بچپن میں اسے بھی بہت شوق تھا یہ گردھر لال (سری کرشن جی) کی چھوٹی سی مورت کو کپڑے گہنے پہنا کر اس سے کھیلا کرتی تھی۔ یہ کھیل رفتہ رفتہ شوق و عشق کے درجہ پر پہونچ گیا۔ شادی کے بعد یہ میکے سے جہاں اور بہت سے سامان لائی۔ سری کرشن جی کی مورت بھی لائی بچپن کا کھیل عقیدت سے بدل گیا۔ اور یہ سچے دل سے سری کرشن کی پرستش کرنے لگی، انجام کار پرستش میں عشق کی جھلک نمودار ہوئی۔ شوہر کے مرنے کے بعد ساری دنیا سے دل بیزار ہوگیا تھا۔ محبت ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر سری کرشن جی کی بھگتی میں لگ گئی اور میرا بائی اسی کو اپنی نجات کا سبب سمجھنے لگی۔

طبیعت شاعرانہ پائی تھی اور ساتھ ہی ساتھ گانے کا بھی شوق تھا۔ پوجا کرتے کرتے عالم استغراق میں مورت کے گرد رقص عاشقانہ کرنے لگتی اور دنیا کی شدھ بدھ باقی نہ رہتی۔

میرا بائی کا بیوہ ہونا خاندان کی تباہی کا پیش خیمہ تھا۔ رانا سانگا نے ۱۵۲۶ء میں بابر پر چڑھائی کر کے شکست کھائی۔ جس میں میرا بائی کے باپ اور راے مل جی جودھ پور کے راؤ کی طرف سے مدد دینے آئے تھے کام آئے۔ ۱۵۲۷ء میں خود رانا سانگا بمقام ایرچ ضلع بندیل کھنڈ بیمار ہو کر راہی عدم ہوا۔ مرنے کے بعد تین لڑکوں رتن سنگھ، اودے سنگھ، اور بکرماجیت (جو میرا بائی کے شوہر بھوج راج کے بھائی تھے) میں سے دو دعویدار سلطنت رتن سنگھ اور بکرماجیت اٹھ کھڑے ہوئے۔ رتن سنگھ چتوڑ میں باپ کی گدی پر (۱۵۲۷ء میں) بیٹھ گیا۔ اور بکرماجیت رنتھنبور کے ضلع کا مالک ہوگیا۔

اس جھگڑے میں رانا رتن سنگھ اور بوندی کے راؤ سورج مل سے (جو بکرماجیت کے ماموں تھے) بگاڑ ہوگیا اور ایک نے دوسرے کو ۱۵۳۱ء میں بوندی کی سرحد پر جہاں رانا رتن سنگھ شکار کے بہانے سے سورج مل پر چڑھائی کر کے گئے تھے مار ڈالا۔ اس حادثہ کے بعد تمام سردار رنتھنبور گئے اور وہاں سے بکرماجیت کو لا کر گدی پر بٹھایا۔

(۲)

کرشن جی کی سچی بھگتی اور روحانی ترقی نے میرا بائی کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا اب وہ پہلی سی میرا بائی نہیں رہی۔ وہ راجہ کے محل میں ہے مگر دل فقیرانہ ہے۔ وہ دن دن بھر مندر میں

میٹھی گاتی اور عالم بیخودی میں رقص کرتی رہتی ہے۔ وہ ایک بیخود اور دیوانہ ہے جسکو نہ پرانی آن بان کی پروا نہ دنیا کی ہنسی کا خوف۔ مشک اور عشق چھپتے نہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اُسکی شہرت ہوگئی۔ دور دور سے ساد ھو سنت اُسکے درشن کو آنے لگے۔ میرا بائی اُنکی خاطر کرتی۔ اُنکے ساتھ بھجن گاتی اور عرفان کے مزے لوٹتی۔ ساد ھو سنتوں کی سنگت اُسکی روحانی خوشی کا سبب تھی۔ مگر چشم ظاہر بیں اُسکو بُرا اور کلنک کا ٹیکہ سمجھتی تھی۔

راناجی کو بھی ساد ھو سنتوں کی بھیڑ بھاڑ اور میرا بائی کی آؤ بھگت بُری معلوم ہوتی تھی۔ اس بات کی کوشش کی گئی کہ وہ اس حرکت سے باز آئے مگر کامیابی نہو سکی۔ پھر سختیاں شروع کی گئیں مگر اسپر بھی کچھ نہوا۔

جب راناجی نے دیکھا کہ سمجھانے بجھانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا تو اپنے مصاحبوں کی صلاح سے اُس پھول سے زیادہ نازک اور جان سے زیادہ قیمتی ہستی کے مٹانے کی تجاویز سوچنے لگے۔ پہلے تو پھولوں کی ڈالیوں میں سانپ چھپا چھپا کر بھیجے مگر جب اس سے بھی مطلب نہ حاصل ہوا تو ایک پیالہ زہر ہلاہل کا تیار کرکے بھیجا کہ یہ "چرنامرت" ہے۔ پی لو۔ چرنامرت کا نام سُنکر میرا بائی زہر کے پیالے کو امرت کی طرح پی گئی۔

اب مختلف روائتیں ہیں کوئی کہتا ہے کہ زہر نے کام تمام کر دیا اور کوئی کہتا ہے کہ اُسکا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اور وہ میڑتے میں اپنے چچا بیرم دیوجی کے پاس چلی آئی۔ میرا بائی میڑتے میں رہتی تھی۔ بیرم دیوجی اور اُنکے کنور جے مل جی اُسکی بڑی خاطر کرتے تھے۔

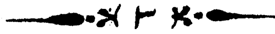
وہ جس محل میں کرشن جی کی مورت کی پوجا کرتی تھی وہ چیتر بھج جی کے مندر میں شامل ہے اور گردھر لال جی کی وہ مورت بھی اسی مندر میں موجود ہے۔

میرا بائی کے پاس ساد ھو سنتوں کے آنے جانے کی دیکھ بھال میڑتے میں بھی ویسی ہی ہوتی رہی جیسی چتور میں ہوتی تھی۔ اور یہ میرا بائی کو سخت ناگوار تھا۔ جب وہاں کی تکلیفیں بھی حد سے زیادہ گذر گئیں تو میرا بائی درشن کے بہانے سے دوارکا چلی آئی اور پھر وہاں سے واپس نہوئی۔

واپس بُلانے کے لئے بہت سی تدبیریں کی گئیں مگر بے سود۔ آخر تھوڑے سے برہمن بھیجے گئے جنھوں نے جاکر کہا کہ اگر آپ نہیں چلیں گی تو ہم لوگ بھی فاقہ کرکے مرجائیں گے۔ اُنکا جواب ان لفظوں میں

"میرا کے پربھو گردھر ناگرمل بچھڑن مت کیجو جی"

اور کرشن جی کی مورتی میں سماگئی۔ اس واقعہ کو ۱۵۴۶ء کا بتلاتے ہیں۔ اسی سے چلتا ہے کہ میرابائی کی وفات دوارکا میں ہوئی۔ غرض ایک عاشق صادق کا جو انجام ہونا تھا ہوا۔ اب ہم مختصراً نمونہ کلام پیش کرکے ناظرین سے رخصت ہوتے ہیں۔



جس طرح میرابائی کا مفصل اور صحیح صحیح حال ملنا ناممکن ہورہا ہے۔ اسی طرح اسکا کلام بھی سادھو سنتوں کے کلام میں ایسا گڈمڈ ہوگیا ہے کہ اسکا الگ کرنا دشوار ہے۔ بہت سی بھجنیں ایسی ہیں جو دوسرے سادھو سنتوں کی کہی ہیں جس میں انھوں نے میرابائی کا تخلص ڈالدیا ہے۔ مگر پھر بھی اہلِ ذوق دونوں میں کافی امتیاز کرسکتے ہیں۔ میرابائی کی بھجنیں سری کرشن جی کے عشق میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور انمیں ایک خاص جذب وکشش موجود ہے۔ مثلاً

واہاں نہ بھاوے، نیند نہ آوے، برہ ستاوے موہے
گھائل سی گھومت پھروں میرا درد نہ جانے کوے

یعنی فراقِ دوست میں مجھکو سامان عیش سے نفرت ہوگئی ہے، نہ غذا مرغوب ہے، نہ نیند آتی ہے۔ کسی کو میرے درد کی خبر نہیں اور حال یہ ہے کہ مجھے دردِ عشق نے بسمل بنادیا ہے۔ چلتی پھرتی ہوں مگر اس طرح جیسے کوئی چوٹ کھایا ہوا شکار مضطرب الحال ہو۔

یہ ہیں عاشقانہ جذبات اور اظہار بیتابئ عشق، جسپر ہندی شاعری بجا طور پر فخر کرسکتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ میرابائی کا عشق کیسا عشق تھا، اسکے دل میں درد، درد میں اضطراب اور اضطراب میں وہ لذت تھی جو عشق صادق کے لئے مخصوص ہے۔

خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے عشق کی چھ علامتیں لکھی ہیں، انمیں سے تین نشانیاں یہ ہیں، کم خورو کم گفتن، وخفتن حرام، اس معیار پر میرابائی کے جذبات کو پرکھو تو معلوم ہوگا کہ اسکی روحانی بیتابیاں عشق کے کس درجہ پر تھیں۔

قیس عامری نے ایک شعر میں اپنی دل بیتابیوں اور رسوائیوں کا نہایت دردناک طریقہ سے اظہار کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ "ملامت کرنیوالیاں مجھے ملامت کرتی ہیں درآں حالیکہ وہ رات بھر

سوتی ہیں اور مجھے نیند نہیں آتی۔

حقیقتاً نیند نہ آنا عاشقی کی شان ہے، جن آنکھوں میں خیالِ دوست ہو اسمیں نیند کی گنجایش کہاں، کسی ہندی شاعر نے کیا خوب کہا ہے: جن نینن میں پیا بسنت ہوں دوجا کون سمائے۔ میرا بائی کا یہ دوہا بھی آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

جو میں جانتی لے سکھی کہ پیت کئے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پھیرتی کہ پیت کرو مت کوئے

کیا عشق کی ناکامیوں اور مجبوریوں کی اس سے بہتر تصویر کھینچی جا سکتی ہے وہ کہتی ہے کہ اے سکھی اگر مجھے انجامِ محبت کی خبر ہوتی اور یہ معلوم ہوتا کہ اسمیں دُکھ ہوتے ہیں تو میں ملک میں منادی کرا دیتی کہ کوئی محبت نہ کرے۔

شانِ عاشقی کو تو ملاحظہ فرمائیے، دوسروں کو ہدایت ہوتی ہے کہ عشق نہ کرنا، مجھے دیکھو کس طرح دُکھ پہ دُکھ سہہ رہی ہوں، ہائے کون جانتا ہے کہ ان دُکھوں میں کتنی راحتیں نہاں ہیں۔ ایک فارسی شاعر بھی اسی مفہوم کو نہایت کامیابی سے ادا کر گیا ہے۔

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را
نمی کردم بہ دل روشن چراغِ آشنائی را

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ بھی نہایت لطیف پیرایہ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

مگر سچ تو یہ ہے کہ میرا بائی کے دوہے میں جو لطافت ہے وہ ان فارسی کے شعروں میں نہیں، خواہ اسکا یہ سبب ہو کہ ہندی زبان ہی عاشقانہ جذبات کے اظہار کے لئے خصوصیت سے موزوں ہے، یا یہ کہ ہندی شاعری میں عموماً صنفِ نازک کی طرف سے عشق اور جذباتِ عشق کا اظہار کیا جاتا ہے، چونکہ عورت کا دل عشق و محبت کا خزانہ ہے اسلئے اُسکے جذباتِ عاشقانہ بھی دلکش ہوتے ہیں۔ اُردو زبان میں بھی اس قسم کے شعر ملتے ہیں مگر کسی قدیم شاعر کا یہ شعر مشہور ہے۔

نہ تھا معلوم اُلفت میں کہ غم کھانا بھی ہوتا ہے تڑپنا، تلملانا، دل کا گھبرانا بھی ہوتا ہے

اِس شعر میں صرف تصویر کا ایک رُخ نظر آتا ہے) ایک جذبہ ہے مگر نامکمل، ایک درد ہے، مگر بے اثر۔ اسمیں صرف اپنی بپتا بیوں کا اظہار ہے۔ برخلاف اسکے ہندی دوہے میں اپنے مصائب کو پیش کرکے دوسروں کو سبق دیا گیا ہے۔

اِسی مضمون کو ہمارے دوست جنابِ اثر لکھنوی نے کچھ ایسے دلکش انداز میں بیان کیا ہے، کہ میرابائی کے دوہے کا لطف آجاتا ہے، زبان کی صفائی، بندش کی چستی قابلِ داد ہے۔

روگ ہیں جان کو دنیا بھر کے ہم تو پچھتائے محبّت کرکے

میرابائی کا کلام فراق کی بیچینیوں، وصال کی تمناؤں، عاقبت کے خوف، نفس کی سرکشی، کرشن جی کی تعریف کا بے نظیر مرقع ہے۔ سادہ اور دلکش لفظوں میں جذبات دلی اور واردات قلبی کا اظہار جس خوبی سے کیا گیا ہے یہ اُنھیں کے کلام کا حصّہ ہے۔

ہم ذیل میں اُسکے کلام کا تھوڑا سا انتخاب ناظرین زمانہ کی تفریح طبع کے لئے پیش کرتے ہیں۔

(۱)

رام نام رس پیجے منوا رام نام رس پیجے
تج کو سنگ ست سنگ بیٹھ نت ہری چرچا سُن لیجے
کام کرودھ مدلوبھ موہ کو چیت سے بہائی دیجے
میرا کے پربھو گردھر ناگر تاہی کے رنگ بھیجے

(۲)

گھڑی اک ناہیں آورے تم درسن بن موہے
تم ہو میرے پران جی کاسوں جیوں ہوئے
دھان نہ بھائے نیند نہ آوے برہ ستاوے موہے
گھائل سی گھومت پھروں میرا درد نہ جانے کوئے
دیوس تو کھائے گنوائے رے رین گنوائے روئے
پران گنوائے جھورتان رے نین گنوائے روئے

۱ غصّہ ۲ گھمنڈ ۳ لالچ ۴ محبت ۵ چھوڑ دینا ۶ کھانا ۷ جدائی ۸ دن ۹ گردش

جو میں ایسا جانتی رے — پیت کئے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پھیرتی رے — پریت کرو مت کوئے
پنتھ نہاروں ڈگر بہوروں — اُڈبی مارگ جوئے
میرا کے پربھو کب رے ملوگے — تم ملیاں سکھ ہوئے

۳

پیا اتنی بنتی سُن موری — کوئی کہو رے جائے
اورن سنگ رس بتیاں کرت ہو — ہم سے رہت چیت چور
میں سُرنا گت تور — تم بن مورا اور نہ کوئی
آون کہہ گئے اجہوں نہ آئے — دیوس رہے اب تھور
میرا کے پربھو کب رے ملوگے — عرج کروں کر جوڑ

۴

میرا بیڑا لگا دیجے پار — پربھوجی عرج کروں چھوں
یا جگ میں مین بہت دکھ پایو — سنشے شوک نوار
اشٹ کرم کی طلب لگی ہے — دور کرو دکھ پار
یو سنسار سب بہو جات ہے — لکھ چوراسی دھار
میرا کے پربھو گردھر ناگر — آوا گون نوار

۵

مہارُوں جنم مرن کو ساتھی — تھاں نے ناہیں بسروں دن راتی
تم دیکھیاں بن کل نہ پڑت ہے — جانت میری چھاتی
اونچے چڑھ چڑھ پنتھ نہاروں — روئے روئے انکھیاں راتی
یو سنسار سکل جگ جھوٹا — جھوٹا کل رُنا تی
دوؤ کر جوڑیاں عرج کرت ہوں — بشن لیجو میری باتی

گہبائی ۔ بناہ ۔ کرنا ۔ دنیا ۔ شبہ ۔ آٹھ ضروریات رکھنا ۔ پنیا ۔ سونا ۔ جاگنا ۔ اولاد پیدا کرنا ۔ دشمن سے بچنا ۔ پیدا ہونا ۔ مرنا ۔ ہمارا

یو من میرا بڑو حرامی — جیوں مدماتیو ہاتھی
ست گرو دست دھرن یو سراوپر — انکس دے سمجھائی
میرا کے پربھو گردھر ناگر — ہری چرنا چیت رائی
پل پل تیرا روپ نہاروں — نرکھ نرکھ سکھ پائی



سوامی سب سنسار کے ہو — سانچے شری بھگوان
استھاور جنگم پاوک پانی — دھرتی بیچ سمان
سو داما کے دارد دکھ کھوئے — بارے سکے پہچان
دو مٹھی تنڈول کے چابھے — دینی درب مہان
بھارت میں ارجن کے آگے — آپ بھئے رتھوان
اُن نے اپنے کل کو دیکھا — چھوٹ گئے تیر کمان
نا کوئی مارے نا کوئی مرتا — تیرا یہ اگیان
چیتن جیو تو اُجر امر ہے — یہ گیتا کو گان
مجھ پہ تو پربھو کرپا کیجے — بندی اپنی جان

میرا گردھر سرن تمھاری
لگے چرن میں دھیان

---

۱ ہاتھ ۲ لگائی ۳ غیر ذی روح ۴ ذی روح ۵ آتش ۶ چاول ۷ ضعیف نہیں ہونے والا ۸ غیر فانی

منظور الحق کلیم اعظم گڈھ

عقل کے اجزا

ہم مان لیتے ہیں کہ ہر انسان علیٰ قدر مراتب عقل رکھتا ہے۔ یا یہ کہ کوئی انسان ودیعت عقل سے خالی نہیں۔ عقل کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ ایک ایسا جوہر ہے جو ادراک حقائق میں لگا رہتا ہے اور اسمیں بھی بحث ہے کہ عقل جوہر ہے یا عرض۔ بعض کہتے ہیں کہ عقل جوہر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عقل عرض ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ عقل مادی ہے یا مادی اجزا کے امتزاج اور تحلیل سے وجود پذیر ہوتی ہے تو ماننا پڑیگا کہ عقل عرض ہے۔ اور اگر مادیت یا مادیت کے اجزا سے وہ کوئی واسطہ نہیں رکھتی تو یہ کہنا پڑیگا کہ وہ ایک جوہر ہے اور ایسا جوہر جو حادث ہے۔

جوہر قائم بالذات ہے اور عرض قائم بالغیر، جیسے کپڑا اور رنگ، کپڑا جوہر ہے اور رنگ عرض۔ کپڑے اور رنگ میں تمیز بسہولت ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر ہم عقل کی بحث میں ایسی تمیز چاہیں تو نہیں ہوسکتی۔ یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ جب جسم عنصری نہیں رہتا تو عقل بھی نہیں رہتی۔ یا جب جسم عنصری اور حواس باطنی ماؤف ہوتے ہیں تو عقل بھی ماؤف ہوجاتی ہے، کیا یہ حالات ہمیں اس مرحلہ پر نہیں لیجا سکتے کہ عقل ایک زاید قوت کا نام ہے۔

اگر ہم گلاب کو دور ہی سے دیکھیں اور سونگھیں نہیں تو ہم خوشبو اور بدبو کا احساس نہیں کرسکتے۔ رنگت تو ہمارے احساس میں آسکتی ہے قطع وضع کا تو ہم احساس اور ادراک کرسکتے ہیں۔ لیکن خوشبو یا بدبو کا احساس نہیں کرسکتے۔ اگرچہ خوشبو یا بدبو پھول کی پنکھڑیوں اور رگ و ریشہ میں بھی سمائی ہوتی ہے مگر سوائے قوت شامہ کے اسکا احساس مشکل ہے۔ کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسی طرح عقل بھی سارے جسم اور ساری قوتوں اور جذبات میں بسی ہوئی ہے۔ اور جبتک عملی رنگ میں اسکا اظہار ہو یا اس سے ہم کام نہیں تب تک ہم اس سے مستفید نہیں ہوسکتے۔ اگر یہ یعنی مادیت ہی کا عقل حی ظہور ہے اور کوئی جداگانہ قوت نہیں ہے تو سمایہ مادیت کے

ابق ہی اسکا احساس اور ادراک بھی ہوگا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسکا پیمانہ اور اسکی رفتار کچھ ایسی
نع ہوئی ہے کہ ہم ٹھیک طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مادیت سے اُسکا کہاں تک واسطہ اور کیسی
بستگی ہے ۔

حافظہ اور ادراک بھی دو قوتیں ہیں اُنکی ہستی بھی ایسی ہی درخشاں اور ثابت ہے جیسی
ں کی۔ لیکن اب تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا کہ حافظہ اور ادراک کیا ہے ۔ اور ان دونوں کا
ی مقام اور مستقر انسانی جسم میں کہاں ہے ۔ اسی طرح ارادہ بھی ایک بڑی طاقت ہے جو عقل
ی غالب ہے ۔ اُسکی نسبت بھی ابتک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ کس مقام اور کس مستقر سے ظہور پذیر
نا اور اپنے زبردست تصرفات اور تاثیرات سے عقل اور جذبات کو متاثر اور مرعوب کرتا ہے
سفروں کی بڑی بڑی اور مضبوط کوششیں اور روشن تر معقولات بھی ان مشکلات پر روشنی
ہں ڈال سکے ۔ ہمارے پاس ایسی مدتوں کی تحقیق اور تدقیق کے واسطے خود ہمارے وہی فعال
ر تصرفات و تاثرات ہیں جو شب و روز ان قوتوں کے تحت میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔
ر ہم اُنکا نام حافظہ۔ ادراک عقل اور ارادہ رکھتے ہیں ۔

اِن سب قوتوں کی رفتار جب کبھی متوازی یا متوالی ہوتی ہے تو بعض وقت ایک مشکل
ہ ساتھ ہمیں یہ پتہ بھی لگتا ہے کہ انکا آپس میں کیا اور کیسا واسطہ ہے اور ایک کا اثر دوسرے پر
کچھ پڑتا ہے اور ان کے افعال ایک ہی وقت میں شروع ہوتے ہیں یا اُنمیں کچھ وقفہ بھی ہوتا
ہے یا سب کام ایک ہی قوت کرتی ہے ۔ اور ایک ہی قوت کی مختلف صورتوں اور متوالی
ال کا نام ہی مختلف قوتوں کے اختلاف اور مختلف اسمار کی وجہ ہے ۔ اِن سب قوتوں کے
ال اور تاثیرات یا تصرفات ایک ہی قسم کی کیفیات ہوتی ہیں۔ بعض وقت اُن میں ا
و سے تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ انکا باہمی افعالی اور تصرفاتی پہلو سے کیا کچھ تعلق اور واسطہ
۔ بیشک چند قرائن سے ہم یہ تمیز تو کرسکتے ہیں یا ایسی تمیز کرنے کے مدعی تو ہوتے ہیں لیکن
ا اوقات ایسے قرائن ہمیں کسی یقینی مرحلہ پر پہونچانے کے واسطے کافی نہیں تھے تو ہم بعض اوقات
ی قوت اور ایک خصوصیت کے ساتھ عقل سے کام لیتے ہیں ۔ لیکن وہی عقل کبھی ہمیں
رفتہ دوسری طرف لیجانے کی کوشش میں بھی لگ جاتی ہے او ارادہ ...

بھی ایسا مزاحم ہوتا ہے کہ عقل اپنی جگہ چھوڑ کر الگ ہو جاتی ہے وہ قوتِ ادراک جس پر ہمیں بہت کچھ فخر ہے خاموشی سے عقل کی بے بسی اور ارادہ کی سینہ سوزی دیکھ کر بھی قدم نہیں اُٹھاتی یہ کوائف اور یہ حالات سوچنے والے کے واسطے بہت کچھ حیرت کا موجب ہوتے ہیں اور تعجب یہ ہے کہ اگر ان سب سپاہ کی پشت پناہ تخیّل نہ ہو تو انہیں سے کوئی قوت بھی پیش قدمی نہیں کر سکتی تخیل کی چھاؤنی میں ہی انھیں جگہ اور پناہ ملتی ہے اور اُسی میگزین سے انھیں ہر ایک قسم کا ابتدائی سامان بھی بہم پہونچایا جاتا ہے۔

جب یہ قوتیں تخیل کی ہوانگی لیکر میدانِ عمل میں آتی ہیں تو تہیۂ اسباب کی مشکلات سے ایک اور مقابلہ ہوتا ہے۔ بعض وقت اسباب کا تہیّہ یہاں تک دشوار اور مشکل ہو جاتا ہے کہ اس ساری سپاہ کو ناچار مایوس ہو کر یا ہزیمت اُٹھا کر تخیل کے حضور میں حاضر ہو کر اپنی مجبوریوں کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ اس مرحلہ پر پہونچ کر عقل کو اپنی رسائی اپنی قوّت ادراک کو اپنی ذہانت اور ارادہ کو اپنے عزم اور اپنی استقامت کا زور اور نرخ معلوم ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہر شئے بغیر کسی ارادہ کے خود بخود ہی ضرورت کے وقت وجود میں آجاتی ہے۔ اگر ان قولوں کے شاندار کیمپ میں جا کر دیکھا جائے تو پتہ لگ سکتا ہے۔ کہ یہاں ارادے اور ضرورت کے ہوتے پر بھی بعض اوقات اشیاءِ مطلوبہ کا تہیّہ نہیں ہو سکتا عقل اور ارادہ متفق ہو کر جو مہم اختیار کرتے اور جس غرض سے یورش کرتے ہیں۔ بعض وقت تہیّہ اسباب پر بھی اُنکی تکمیل نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے نزدیک جب مادّہ خود وقت اور ضرورت پر ایسا تہیّہ اور ایسا سامان کر دیتا ہے اور مادّہ کو ساتھ ہی بے شعور اور بے عقل بھی تسلیم کرتے ہیں تو جب خود عقل اور ارادہ ہی قاصر رہتا ہے تو یہ بے عقل عنصر کیونکر یہ مہم سر کر سکتا ہے بعض کا قول ہے کہ حیات اور عقل مادّہ کے متحرک اجزا اور اُسکے عناصر ممتزجہ کے تاثرات او تصرفات کا نام ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر عقل کی ہزیمت مشکوک ہے۔ کیونکہ جب مادّہ کے محرکات کا ہی یہ اثر ہے تو اُسکی کامیابی کو کون روک سکتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسپر بھی عقل محدود ہے۔ بیرونی حملہ تو جدا رہا ارادہ کے مقابلہ میں بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ یہ تعجب ہے کہ مادّہ خود تو بے شعور اور بے عقل ہو اور اُسکی تحریکات سے حیات اور عقل ایسی زندہ اور

عقیل ہستیاں پیدا ہوسکیں

عقل ارادہ کے مقابلہ میں ہی شکست نہیں کھاتی بلکہ اکثر اوقات ذوق کے مقابلہ میں بھی کم ٹھہر سکتی ہے گو ذوق بھی ایک قسم کا ارادہ ہی ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اُسکی رفتار اور اُسکے عزم ارادہ سے بھی زیادہ تر بلند اور پختہ ہوتا ہے۔ جسقدر تیزی سے ذوق کی رفتار ہوتی ہے عقل بھی اُسکی ریس کرتی اور اُسی کے نقش قدم پر چلتی ہے۔

وہ باتیں اور وہ تعبیرات مان کر بھی جو عقل کے متعلق کیجاتی ہیں ہمیں یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ وہ باوجود اس وجاہت اور عظمت اور اس شان کے بھی محدود ہے اور اُسکی رفتار تیز ہوکر بھی مدھم پڑجاتی ہے۔ وہ باوجود صدہا دعاوی کے بھی بعض اوقات شکست کھاجاتی ہے وہ تیز بھی ہے اور سُبک رفتار بھی مگر اُسکی دوڑ محدود ہے اور اُسکی رسائی بعض وقت کُند بھی پڑجاتی ہے۔

بعض کے خیال میں عقل کے اجزا نہیں ہیں اور بعض کے خیال میں دو اجزا ہیں

(الف) فطری جو وجود کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔

(ب) کسبی جو کسب سے حاصل ہوتی ہے۔

ہم اس سے تو انکار نہیں کرسکتے کہ بچّہ کی عقل ترقی کرتے کرتے بڑھتی اور بہت کچھ نشو ونما بھی پاتی ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ ہر بچّہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی عقل بھی ساتھ ہی لاتا ہے بچوں کی زندگی اور افعالِ زندگی اسقدر مبہم اور بے سروپا نہیں ہوتے کہ اُن سے اس بات کا فیصلہ نہ ہوسکے کہ عقل اُنکے ساتھ ہی آتی ہے یا کسب سے ملتی ہے۔ یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نشو ونما پاکر بچوں کے تجربوں اور مشاہدات میں ترقی ہوتی ہے۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک جداگانہ عقل بھی حاصل کرتے ہیں۔ بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو اُنکے بدن میں خون بھی ہوتا ہے۔ یا یہ کہ مواد خون بچے ساتھ ہی لاتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے خون بھی بڑھتا جاتا ہے یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ مختلف اغذیہ سے حفظ خون میں ترقی بھی ہوتی ہے اور کمی بھی لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ خون پیدائش کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

خون تو ایک خلطی عنصر ہے۔ عقل کو چاہیے جوہر کہو اور چاہیے عرض۔ وہ خون کیطرح

اغذیہ اور اکل و شرب کے تابع نہیں ہوتی - ہاں مشاہدات اور تجربوں کی اغذیہ سے ترقی پاتی ہے - بجائے اسکے کہ ہم یہ کہتے کہ ایک کسبی عقل بھی ہے - اگر یوں لکھتے کہ عقل مشاہدات ما بعدی اور تجارب آیندہ سے ترقی کرتی اور نشوونما پاتی ہے تو زیادہ موزوں ہوتا - اگر آتش ہر جسم میں پائی جاتی ہے اور کرۂ ناری کام میں لانے سے ترقی پذیر ہوتا ہے تو ہمیں اس بات کے کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ عقل پیدایشی اور فطری ہوکر انسانی بلوغ اور انسانی تجارب اور مشاہدات کے ساتھ ساتھ ہی ترقی پذیر ہوتی ہے گو انسانی جسم کی طرح ہر تیسرے یا ہر ساتویں سال اُسکی کایا پلٹ ہوتی رہے - لیکن ترقی اُسی مواد میں ہوتی ہے جو شروع سے انسان کو ودیعت کیا گیا ہے اور جو محض فطری ہی ہو سکتا ہے - اکتساب یا کسب سے عقل ترقی پذیر تو ہوتی ہے یا یوں کہو کہ وہ ترقی تو پاتی ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی عقل کسبی بھی ہوتی ہے - ہاں یوں کہو کہ کسب سے عقل میں ترقی ہوتی ہے اور اکتساب سے اُسمیں وسعت پیدا ہو جاتی ہے - مگر اُسی مواد میں ترقی اور کشادگی ہوتی ہے جو فطرتاً ودیعت شدہ ہے -

کسبی جُز اس جہت سے تو کسبی کہا جائیگا کہ بذریعہ اکتساب بعض امور میں عقل مدرک اور ماہر ہوتی ہے نہ اس جہت سے کہ وہ عقل ہی فطری عقل سے منفرد اور جدا گانہ ہے اور دونوں عقلوں میں توافق اور تطابق نہیں ہے - بصارت وہی ہے جو آنکھوں میں ہوتی ہے لیکن دونوں آنکھیں مختلف مناظر اور منتشر مظاہر سے جو کچھ دیکھتی اور اخذ کرتی ہیں اُنمیں گونہ اختلاف ہوتا ہے - ہر شعاع اور ہر نور خارجی اُسی بصارت فطری میں منتقل اور مرتسم ہوتا ہے جو پہلے سے حاصل اور ودیعت شدہ ہے - یہی کیفیت نور عقل کی بھی ہے، قوت احساس بچوں میں کچھ اور رنگ رکھتی ہے اور طفولیت سے گزر کر کچھ اور کیفیت، ترقی پذیر بھی ہوتی ہے اور تنزل پذیر بھی، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خاصۂ فطری کچھ اور ہوتا ہے اور خاصۂ کسبی کچھ اور۔

چونکہ عقل درجہ بدرجہ ودیعت ہوتی ہے اس واسطے درجہ وار ہی اُس سے کام بھی لیا جا سکتا ہے بچوں میں بھی درجہ وار عقل ہوتی ہے اگرچہ بہت سے بچے عقل میں یکسانیت

بھی رکھتے ہیں مگر پھر بھی تفاوت ہوتا ہے۔ بچوں کی زندگی بعض وقت جوانوں اور بوڑھوں کی زندگی سے بھی زیادہ تر سبق آموز ہوتی ہے۔ بچوں کے بعض افعال اور بعض حرکات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اُنسے پتا لگتا ہے کہ قدرت نے کس وسعت اور کس خوبی سے بچوں کو بھی زیورِ عقل سے آراستہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

دیکھو بچے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنی مختلف حرکات اور افعال سے خواہ وہ اختیاری ہوں خواہ اضطراری، کیا۔ کیوں اور کس طرح کی فلاسفی کے متفنن اور متحقق ہوتے ہیں۔ ایک بچہ جب رات کو لیمپ اور چراغ اور صحن خانہ میں ماہتاب کی سہانی چاندنی اور چاندکو اور دن کو آفتاب کی روشنی دیکھکر منھ میں ننھی سی اُنگلی ڈال کر خوبصورت آنکھوں سے دیکھتا اور بار بار اپنے رنگ میں اشارے کرتا ہے تو ہر دیکھنے والا بشرطیکہ غور سے کام لے' بھانپ جاتا یا بھانپ سکتا ہے کہ یہ ننھی سی مخلوق اور نووارد مسافر یہ دریافت کرنے کی کوشش میں ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ کیا ہے۔ کیوں ہے اور کس طرح ہے گو وہ زبانِ قال سے یہ سوالات نہیں کر سکتا۔ اور نہ اِنپر روشنی ڈال سکتا ہے لیکن اُسکے دل و دماغ میں وہی سوالات متموج ہوتے ہیں جو ایک بالغ اور تجربہ کار انسان ہی کبھی کبھی کیا کرتا ہے۔ کیا ان حرکات اور ان اشارات سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قدرت نے وجدانی طور پر اس بچے کی فطرت میں بھی وہی مواد بھرا ہے جو بڑوں بڑوں میں پایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ فلسفہ کا شروع حیرت اور تعجب سے ہوا کرتا ہے کیا بچوں کا یہ تعجب دیکھنے والوں کو خاموشی سے بچوں کی زبانِ حال سے یہ پیغام نہیں دیتا بچے بھی وہی بات اور وہی جذبہ رکھتے ہیں جو بڑے بڑے رکھتے ہیں۔ بچوں کے دل و دماغ میں بھی وہی ولولہ اور وہی ذوق ہے جو ارسطو اور بقراط کے دل و دماغ میں بعہد طفولیت متموج اور جوش زن تھا مانا کہ ان حکیموں کا پیمانۂ دماغ اور وسعت دل کچھ اور ہو گی لیکن اس سے تو ہم انکار نہیں کر سکتے کہ بمصداق۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم اسکا کاریگر وہی تھا جس نے ارسطو اور بقراط کے دل و دماغ کو بنایا تھا۔ ہاں بفحوائے فضلنا بعضھم علی بعض تفاوت بھی ضرور ہوتا ہے آنکھیں جنھیں دی گئی ہیں اُنھیں نورِ بصارت بھی دیا گیا ہے۔ نظر کا تفاوت ضرور ہوتا ہے۔

اگر بچوں میں بھی اسی قسم کے جذبات اور قوتیں ہیں تو کیوں نہ کہا جائے کہ وہی جذبات اور وہی قوتیں رفتہ رفتہ نشو و نما پاکر ترقی پذیر ہوتی ہیں جس طرح ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ عقل فطری ہی ہوتی ہے چاہے کسی سن و سال میں ہو اور چاہے اسکے معلومات اور مدرکات کیسے ہی وسیع کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح ہم اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ عقل مختلف طریقوں اور مختلف پیرایوں سے ترقی پذیر ہوتی یا جدید معلومات حاصل کرکے اپنی وسعت کا ثبوت دیتی ہے۔ عقل تو وہی ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ ترقی پاتی جاتی ہے۔ کبھی اندرونی رنگ میں متموّج ہوتی ہے اور کبھی بیرونی اور کسی طور پر زید، اگر ایک طرف ریاضی میں مشق کرتا ہے تو دوسری جانب فلسفہ اور منطق میں بھی مہارت پیدا کرتا ہے۔ صرفی بھی ہوتا ہے اور نحوی بھی، مورخ بھی اور سائینس داں بھی، ہر حالت میں گو زید کے معلومات اور اکتسابات جداگانہ ہوتے ہیں لیکن ان سے زید کی شخصیت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ اگرچہ عالم طفولیت میں زید صرف کہانیاں ہی سُننے کا شوق و ذوق رکھتا تھا تاہم دوسرے دور میں وہ منطقی اور فلاسفر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ترقی علوم و فنون اُسکی شخصیت میں کوئی فرق نہیں لا سکتی۔

ع ہماں کاسہ ہماں آش

روشنی چاہے جس آئینہ اور جس ظرف اور جس مقام میں پڑے اور منتقل ہو روشنی ہی اسکو کہیں گے۔ ہاں مقام انعکاس اور مواقع انجلا جداگانہ ہونگے سکان کی تبدیلی سے مکین کی مقامی اور معلوماتی تبدیلی تو ہوتی ہے ذاتی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مختلف شیشوں میں دیکھنے سے (بشرطیکہ چہرہ اور بشرہ بدل نہ گیا ہو) چہرہ بدل نہیں سکتا وہی رہیگا چاہے آئینہ جیسی ہو چاہے ہندی۔ جس طرح سب رنگ روشنی کے جاذب ہوتے ہیں اُسی طرح ہر ملکہ اور ہر قوت ہر رنگ میں عمل پذیر ہو سکتی ہے بشرطیکہ کوئی مزاحم اور در انداز نہو۔

چونکہ عقل کی اصلیت واحد ہے اگرچہ اسپر بھی وہ مدارج اور مراتب رکھتی ہے کسی میں کم ہوتی ہے اور کسی میں زیادہ اسواسطے وہ ہر رنگ کے کمالات اور معلومات میں ایک ہی عقل اور ایک ہی ملکہ شمار ہوگی۔

سُلطان احمد

فرانس کی ایک ملکۂ حسن

"ایک خوبصورت چینی کا برتن" یہ تعریف تھی جو لوئی پانزدہم بادشاہ فرانس کی معشوقہ میڈیم ڈی پمپاڈور کے نسبت کیجاتی تھی - اسکی پتلی کمر پر ایک نفیس اور خوشنما لیس لگی ہوئی تھی جسپر آسمانی فیتہ کی گرہ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی اور یہی خاص چیز تھی جو اسکے نام کے ساتھ منسوب کیجاتی تھی اور اسی کی وجہ سے وہ "پمپاڈور" کہلائی جاتی تھی - بوٹا سا قد - گورا رنگ مگر دلفریب گلاب کی ہلکی سی رنگینی لئے ہوئے - اسکے ہاتھ خوش وضع اور بازو سڈول تھے - چہرہ کی ساخت دلربایانہ انداز رکھتی تھی - وہ اور حسن کی دیویوں کی طرح عالی خاندان نہ تھی - جین انٹوانٹ پائیسن کی اصلیت کا بہت کم لوگوں کو علم ہے - ہم اتنا جانتے ہیں کہ بچپن میں اسکی تعلیم و تربیت "میسو لی نارمنڈ" کے سپرد تھی - گو جین کے مسیحی نام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ پائیسن کی لڑکی تھی - مگر بہت ممکن ہی کہ وہ بھی اسکے والدین نہ ہوں - بہر حال اسکی تعلیم اچھی ہوئی - اسنے علم موسیقی میں اچھی مہارت حاصل کی - ایک عمدہ مصوّر بھی تھی حقیقت میں اسکو آرٹ سے دلچسپی تھی اور آئندہ زندگی یعنی زمانہ اقبالمندی میں اسنے آرٹ (آرٹسٹ) کے ساتھ بیحد ہمدردی ظاہر کی اور انکی ترقی کے لئے بہت کوشاں رہی - آرٹ کی ترقی کے لئے بہت سے انعامات مقرر کئے - یہی وہ عورت تھی جسنے بمقام لور نمائش مصوری کا سلسلہ قائم کیا - اگرچہ یہ بات تعجب خیز نظر آتی ہے اسلئے کہ اسکے نام کے ساتھ لفظ بیوقوف لگا رہتا ہے مگر اس بات کے ماننے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میڈیم ڈی پمپاڈور فن مصوری میں مستند مانی جاتی تھی اور اسکے پاس اس فن کے متعلق تین ہزار سے زیادہ کتابوں کی لائبریری تھی۔

جب جین نے انیسویں سال میں قدم رکھا تو اسکی شادی مسیو لی نارمنڈ کے بھتیجے لی نارمنڈ کے ساتھ ہوگئی وہ اسے بیحد چاہتا تھا - ہر وہ چیز جو روپیہ سے مہیا کیجا سکتی تھی اسکے مہیا کرنے میں کبھی لی نارمنڈ نے کوتاہی نہیں کی -

ایک عمدہ مکان تھا۔ بہت نوکر تھے۔ جواہرات اور قیمتی لباس بھی موجود تھے۔ خرچ کرنیکے لئے کافی دولت موجود تھی۔ رفتہ رفتہ جین کو بھی شوہر سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے معصوم لڑکی کی پرورش کرتی تھی۔ یہ ایک تعجب خیز بات ہے جسکا اثر جین کی آئندہ زندگی پر پڑا۔ فی الحقیقت یہ اُس پیشینگوئی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جین کے لڑکپن کے زمانہ مین کی گئی تھی کہ جین بادشاہ کی معشوقہ بن کر سلطنت کرے گی۔

لوئی پانزدہم بادشاہ فرانس ہی ایک بادشاہ تھا جس سے وہ کچھ توقع کر سکتی تھی مگر بہت پیشتر جبکہ جین کی عمر صرف چار سال کی تھی اسکی شادی ہو گئی تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ لوئی بدچلن اور عیاش تھا اسکی زندگی ایک فسانۂ غم اور عجیب عبرتناک زندگی ہے۔

اسے میری کے ساتھ بے انتہا محبت تھی۔ آخرکار اسنے میری کے ساتھ شادی کی حالانکہ میری عمر مین اس سے ۷ سال بڑی تھی۔ میری جلد ضعیف ہو گئی اور لوئی کی نگاہین اب بدلنے لگین۔ بظاہر وہ میری کا بہت پاس خاطر ملحوظ رکھتا تھا اسلئے کہ وہ نہین چاہتا تھا کہ اسکے اصلی اندرون اور منتشر خیالات سے کوئی اور آگاہ ہو۔ جین کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہین۔ کہا جاتا ہے کہ اسکی مستقل مزاجی تھی جسنے بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسنے ہر شکار کی پارٹی مین شرکت کی وہ یا تو گلابی یا آسمانی لباس جسپر ایک عاشق حقیقی کے آسمانی پھول لگے ہوتے پہنکر جاتی تھی۔ لوئی پانزدہم کو اس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی مگر میڈیم ڈی میلی (موجودہ منظور نظر) میڈیم ڈی ایٹائل کے طرز انداز کو سمجھ کر وہ تاڑ گئی اور اسنے شکار کی پارٹیون مین شرکت کرنے سے اسکو روک دیا۔

میڈیم ڈی میلی کے مرنے کے بعد اسکی جانشین ایک اور میڈیم ہوئی۔ اسکی جانشین ایک اور ہوئی۔ مگر جین نے صبر کی باگ ہاتھ سے نہ چھوڑی وہ جانتی تھی کہ اسکی بھی باری آنیوالی ہے۔

تیئیس سال کی عمر مین جین نے ایک ناچ کی محفل مین شرکت کی جو ڈی ول ہوٹل مین منعقد ہوئی تھی۔ وہان لوئی بھی موجود تھا۔ لوئی اسوقت اکیلا تھا۔ اسکے ساتھ کوئی معشوقہ نہ تھی۔ اسکی آخری معشوقہ میڈیم ڈی شیاٹرو کو انتقال کئے ہوئے تین مہینے ہو چکے تھے۔ تین مہینے تک اسنے سوگ کیا اور اسکے رنج و غم مین مبتلا رہا۔ اس دفعہ جین پر نظر پڑتے ہی وہ گرویدہ ہو گیا اسکی ساحرانہ نظرون نے اسے مسخر کر لیا۔ ظریفانہ طبیعت اور انداز خاص نے اسے فریفتہ بنا لیا۔ اسنے اس جدید معشوقہ کا

نام معلوم کرنے کی کوشش کی مگر جین ناکام رہا۔ جب وہ آسمانی گون والی ناچ گھر سے جانے کے لئے مڑی تو قصداً ہاتھ سے رومال گرا دیا۔ بادشاہ نے اُسے اُٹھا لیا۔ مصاحب محو حیرت ہو گئے جب اسکا مطلب سمجھ مین آیا تو انھون نے خوشی کے نعرے لگائے اور اُنھین اس نئی محبوبہ کا نام معلوم کرنے کی تشویش پیدا ہوئی۔

والیان ملک اپنی خواہشات پورا کرنے کے طریقے خوب جانتے ہین۔ چند دن کے بعد لوگون پر ظاہر ہو گیا کہ کوئی جوش و خروش کے ساتھ جین کی محبت کا دم بھر رہا ہے۔ لوئی کے طرز عمل سے یہ بات صاف عیان تھی کہ وہ ایک دوشیزہ سے محبت کر رہا ہے۔ جین بھی اسکا مطلب سمجھتی تھی اور دل ہی دل مین وہ اسے مسخر کرنے کے طریقے سوچ رہی تھی۔ گو بظاہر اسکے تبسم سے اسکی خوشی کا پتہ چلتا تھا مگر وہ بادشاہ کی ہر حرکت سے اُسکی طبیعت کا اندازہ کر رہی تھی تاکہ وہ آسانی کے ساتھ بادشاہ کو زیر کر لے۔ لوئی فریفتہ ہو گیا مگر اس سے جین کی جستجو مین کسی قسم کی کمی نہین ہوئی وہ اپنی طرز گفتگو سے اسے خوش اور محظوظ کرتی مگر پھر یکایک بے پروائی ظاہر کرتی۔ ابتک لوئی کے ساتھ کسی نے اس قسم کا برتاؤ نہین کیا تھا۔ اسکی دل زدگی اور وارفتگی حد سے تجاوز کر گئی تھی۔ اسکے خواب و خیال مین بھی نہین گذرتا تھا کہ وہی جین جو ایک خوشنما اور دلفریب گلاب کا پھول ہے خار دار بھی ہے۔

جین اُس باریک بینی و دقیقہ سنجی سے اسکے طرز عمل کو معلوم کرنا چاہتی تھی جسکی ایک سائنس دان کو ضرورت ہوتی ہے۔ جب وہ خورد بین سے مینڈک کا معائنہ کرتا ہے۔

اسنے بادشاہ کی دعوتین کین محفل رقص منعقد کی۔ بہر حال ہر طرح سے بادشاہ کو اپنا فریفتہ بنا لیا۔ میڈیم کی فضول خرچی نے عوام الناس کو بہت برافروختہ کیا۔ اسلئے کہ وہ خراج ادا کرتے کرتے بالکل غریب ہو گئے تھے۔ اور رؤسا دربار بھی جین کے عالی خاندان نہونے کی وجہ سے بہت مخالف تھے۔ جو جو اسکے بہی خواہ بنے ہوئے تھے وہ سب بڑے بڑے عہدون کے جویا تھے اور یہ ایک عام بات ہے کہ لوئی کے دربار مین جو لوگ بڑے بڑے عہدون پر مامور کئے گئے تھے وہ خود غرضی مطلبی اور بے اصول تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو زوال شروع ہو گیا۔

میڈیم ڈی پمپاڈور نے بہبودی حکومت کے لئے چند اچھے کام کئے۔ اسے پیرس سے خاص الفت تھی اسکو ترقی دینے اور سجانے کے لئے بہتیری کوششین کین مختلف جگہ پر خوشنما

چھوٹے چھوٹے باغ بنوائے محکمہ حفظ صحت کو ایک عمدہ پیمانہ پر قائم کیا۔ بے روزگار فردوروں کی روزی کا بندوبست کیا۔ بہرحال وہ شہر پیرس کے لئے بہت مفید تھی۔ اور فرانس کے لئے ایک بدترین فرمان روا۔ ایک حدتک لوئی کو بہ نسبت کسی او محبوبہ کے میڈیم پر زیادہ اعتماد تھا۔ یہ اعتماد محبت کی وجہ سے نہین تھا بلکہ وہ اسکی قوت استقلالی سے ڈرتا تھا۔

آخری عمر مین ان مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے پر اثر اور دردانگیز الفاظ مین وہ اعتراف کرتی ہے کہ اسکی تمام زندگی عجیب کشمکش اور خانہ جنگی مین گذری۔ اور یہ بات قابل یقین ہے اسلئے کہ اسکو اپنی حالت اور رتبہ کو برقرار رکھنے کے لئے نہ صرف بادشاہ بلکہ تمام اہل دربار سے لڑنا پڑتا تھا۔

بیالیس سال کی عمر مین اُسکا انتقال ہوا اور بہت بہادری سے موت کا مقابلہ کیا۔ مرنے کے وقت اسکی عجیب حالت تھی۔ بہت خوشنما ریشمی گوان پہنے ہوئے تھی۔ عمدگی کے ساتھ بالون کا سنگھار کیا تھا۔ بھاری قیمتی جواہر پہنے ہوئے تھی جس طرح کسی عاشق زار کے استقبال کو بن سنور کر جانیوالی ہے۔ ۲۰ دن کی علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے اس دنیا سے روانہ ہوئی۔ مگر اسوقت بھی اپنے بشرہ سے کسی قسم کی پریشانی کی علامت ظاہر نہ ہونے دی جس طرح زندگی خوشی کے ساتھ بسر کی تھی اسی طرح اس دنیا سے گذر گئی۔ اُسکی ہر ادا سے مصوری نمایان اور وہ خود گویا ایک متحرک تصویر تھی۔

میڈیم کو مرے ہوئے تین دن ہوگئے۔ لوئی ایک کھڑکی مین کھڑا ہوا میڈیم کی لاش کو گذرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ مگر اس سخت دل اور نفس پرست کو اسکا کچھ بھی خیال نہین ہے۔ ساتھ ہی وہ ایک محبوبہ کے خیال مین غرق ہے۔ اسے صرف یہ تشویش ہے کہ کہین بارش مین میڈیم للارکوش (محبوبہ جدید) بھیگ نہ جائے۔ آہ زمانہ اس سے بڑھکر اور کسی نفس پرست۔ احسان فراموش سنگدل کی مثال نہین پیش کرسکتا۔ کل جسے میڈیم کا خیال سوہان روح تھا وہ آج اس طرح بیفکر اور انجان کھڑا ہوا ہے۔

میڈیم لباس نو کی موجد ہے۔ تمام لوگ اس لباس کو پسند کرتے ہین مگر بہت کم ہین جو اس موجد کے نام سے واقف ہین اور اسکا نام معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہین۔

(ترجمہ) منعم (علیگ)

انصاف یا ظلم

لوگ مجھے شریمتی ساوتری دیوی کہتے ہین دنیا مجھے چاہے جو کچھ کہے لیکن مین تو نہ شریمتی ہون اور نہ دیوی۔ کیونکہ عصمت مآب ساوتری جان شوہر تھی اور مین شوہر کے محبت کی محتاج ہون مین اِس سے نفرت کرتی ہون ایسی حالت مین اپنا حال غم مین کیا لکھون۔

مین ہندی مڈل پاس ہون اور آٹھوین درجہ تک انگریزی بھی پڑھی ہون۔ کچھ کچھ سنسکرت اور اردو بھی جانتی ہون۔ مین نے ہندو دھرم کے مطابق اپنے شوہر کی خدمت کی ہے، مین انجان نہین ہون، میری عقل مین فتور نہین، میری عمر اسوقت سترہ برس کی ہے۔ مین بخوبی جانتی ہون کہ میرے کیا فرائض ہین، مین نے پڑھا ہے' اور مین خوب سمجھتی ہون کہ کاہل اور بدکار شوہر کی بھی خاطر عورت کو کرنی چاہیے لیکن آج مین اپنے شوہر کی برائی کر رہی ہون۔

اے پرماتما! یہ کیسا برا وقت آگیا ہے نہین معلوم میرا کیا حشر ہوگا، زمین پھٹ جائے اور مین اُسمین سما جاؤن تو بہتر ہے۔ آسمان سے بجلی گرے اور میرے خرمن ہستی کو جلا کر خاک کردے تو اچھا ہے۔

اپنے مزاج کے موافق اگر کسی عورت کو خاوند ملجائے اور پھر وہ قدرت ایزدی سے لنگڑا لولا اور ظالم ہوجائے تو عورت اس سے نفرت نہ کریگی، وہ اسکو اپنا جیون ادھار سمجھیگی وہ اسکو دیوتا سمجھکر اسکی پوجا کرے گی، لیکن ظالم مان باپ اگر جان بوجھکر کسی لالچ مین ایک لائق کم سن لڑکی کا بیاہ کسی جاہل سن رسیدہ مرد سے کردین تو لڑکی کے دل مین اسکا ہمیشہ قلق رہیگا چاہے وہ زبان پر نہ لائے لیکن جب وہ جوان اور سمجھدار ہوجائیگی تو وہ اس برے رسم کی ضرور برائی کرے گی جسکی وجہ سے سکا ہمیشہ کے لیئے آرام گیا اور اپنے زندگی کے ایام خون جگر پی پی کر کاٹے گی۔ لوگ اسے بیجا طرح سے سمجھ لین کہ ظلم۔ دباؤ اور جھوٹی ٹنکا دلون سے

کوئی عورت اپنے شوہر پر فریفتہ ہوکر دل سے محبت نہین کر سکتی جب تک دو دل ایک نہون اس وقت تک الفت کے راگ نہین گائے جا سکتے یون کہنے کو ہر عورت جس پر رات دن شوہر کے ظلم وستم ہوتے ہین اپنے کو جان شوہر کہتی ہے۔ لیکن مین یقین کے ساتھ کہتی ہون کہ زمین وآسمان ایک ہوجائین مگر کوئی عورت ظالم، بدکار اور خودغرض شوہر کو دل سے پیار نہین کر سکتی، جس عورت کی شادی کم سنی مین اپنی مرضی کے خلاف کسی سن رسیدہ مرد سے مال کے لالچ سے کر دی گئی ہے وہ اپنے شوہر پر جان نہین دے سکتی وہ پیار کرنا تو درکنار اسکی صورت سے بھی بیزار رہے گی، جو عورت میرے اس دعوی کے خلاف رائے رکھتی ہے اسکے دماغ مین ضرور خلل ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ میرے معزز بھائی اور بہنین میری سوانح عمری کو پڑھکر بُرا نہ مانینگے بلکہ انصاف کرکے خدا لگتی کہین گے کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے یا نہین۔ اسی سلسلہ مین اتنا اور عرض کردینا ضروری سمجھتی ہون کہ بہنین میرے لایق شوہر کی باتون کو سُنکر مضحکہ اُڑائین گی بلکہ اس سے نصیحت حاصل کرین گی۔

میرا گھر لکھنؤ مین ہے اور سُسرال بمبئی مین۔ آجکل مین اپنے سسرال مین ہون اور اپنی بند کوٹھری یعنی قیدخانہ مین بیٹھی ہوئی یہ داستانِ غم لکھ رہی ہون۔ میرے ماں باپ زندہ ہین۔ میرے والد ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن اب پنشن پاتے ہین۔ مین انکی اکیلی لاڈلی لڑکی ہون، میرے والد نے مجھے بڑی محنت سے پڑھایا تھا۔ اسکول کی بڑی اُستانی جی کو میرے ساتھ اسقدر الفت تھی کہ اب بھی اُنکے محبّت سے بھرے ہوئے نصیحت آموز خطوط میرے پاس آتے ہین۔ اُستانی جی اکثر فخریہ کہا کرتی تھین کہ ساوتری بہت ذہین اور سلیقہ شعار ہے۔ مین اپنا سبق بہت جلد یاد کرلیتی تھی۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے ہر امتحان مین میرا نمبر اول ہی رہا۔ میری سُریلی اور دلآویز آواز کی بھی اُستانی جی بہت تعریف کرتی تھین۔ جسوقت مین ہارمونیم پر گاتی تھی اُسوقت سب لڑکیان اور اُستانی جی ٹکٹکی باندھ کر حسرت سے میری صورت کو دیکھا کرتی تھین۔ ایک سمان بندھ جاتا تھا یہانتک کہ مین خود بھی بیخود ہوکر جھومنے لگتی تھی۔ مجھے دو بار نظر لگی اور مین تین بار بیمار ہوئی لیکن لعنت ہو

اس زندگی پر کہ مری ایک مرتبہ بھی نہین - مجھے بیل بوٹون کے کاڑھنے اور سینے پرونے مین کئی مرتبہ انعام ملے تھے - دنیا مین بہت کم کسی کی امید برآتی ہے - جب کوئی ہنسا ساتھ ہی آنسو نکل آئے - مین نے پندرھوین سال ہی مین قدم رکھا تھا کہ میرا بیاہ ہوگیا -

میرے والد کو میرے لئے شوہر تلاش کرنے مین دو مصیبتون کا سامنا ہوا - پہلی مصیبت تو یہ تھی کہ بہت زیادہ جہیز نہ دے سکتے تھے لیکن یہ مشکل کچھ زیادہ تکلیف دہ نہ تھی کیونکہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ میری خوبصورتی، قابلیت، گانے اور سینے پرونے پر بہت سے سند یافتہ امیرزادے فریفتہ تھے - ان مین سے بہت سے ایسے بھی تھے جنکو اپنے مان باپ کی دلشکنی منظور تھی لیکن جہیز لینے کے لئے وہ تیار نہ تھے - الہ آباد یونیورسٹی کے ایک ایم - اے پاس رئیس زادے نے میرے والد کو اس مضمون کا خط لکھا تھا -

اگر آپ مجھکو اپنا داماد بنالین تو مین اپنا گھر بار اور مان باپ کو بھی چھوڑ سکتا ہون لیکن اسکو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نے میری درخواست منظور نہ کی تو مین ریل کے پل پر سے گنگا جی مین کود کر اپنی جان دیدونگا اور اسکا عذاب آپ کی گردن پر ہوگا وغیرہ وغیرہ -

معلوم نہین آپ نے اپنا عہد پورا کیا یا نہین کیونکہ مین نے اخبارون اور رسالون مین اپنی شادی کے بعد آپ کے ڈوبنے کی خبر کہین نہین پڑھی -

بہر حال جہیز کا سوال تو معمولی تھا - لیکن دوسری مشکل ایسی تھی جس نے میری زندگی تباہ کردی اور مجھے زندہ در گور کردیا - میرے والد کو سرکار انگلشیہ نے "رائے صاحب" خطاب دیا تھا - ہائے بس اسی خطاب یا "رائے صاحب" نے میرے حسرت و ارمان کا خون کردیا اور میری خوشیون کو ہمیشہ کے لئے خاک مین ملادیا - والد صاحب کی خواہش تھی کہ زیادہ جہیز بھی نہ دینا پڑے اور شوہر کا خاندان بھی خطاب یافتہ ہو - تلاش کرتے کرتے بمبئی مین ایک رائے صاحب والد کے حسب منشا مل گئے - چونکہ رائے صاحب کی تیسری شادی تھی - میرے کنجوس والد کو زیادہ جہیز بھی نہ دینا پڑا - خیر کچھ بھی ہو اصل مین یہ "رائے صاحب" کا خطاب جو گورنمنٹ نے اپنی مہربانی یا مذاق سے دے دیا ہوگا - مجھے اپنے شفیق مان باپ سے جدا کرکے بمبئی مین لے آیا - مین گورنمنٹ کو دعا دیتی ہون اور اپنے کفایت شعار خطاب کے بھوکے والد صاحب سے

عرض کرتی ہون کہ آپ کو اور آپ کے داماد کو "رائے صاحب" کے خطاب سے کیا حاصل ہوا اور آپ نے یا آپ کے داماد نے کونسل مین بیٹھکر یا اور کسی طریقہ سے دنیا کو کیا فائدہ پہونچایا۔ اگرچہ آپ اور آپ کی طرح خوشامدی ہستیان خطابون کو شکر کی طرح میٹھا سمجھین مگر مین تو انھین زہر ہلاہل سمجھتی ہون - یہ میری ذاتی رائے ہے -

مجھے یاد [illegible] تا ہے کہ جس وقت میرا بیاہ ہو رہا تھا اُسوقت میری پیاری ماں، اُستانی جی اور میری سہیلیان میری طرف دیکھ دیکھکر رو رہی تھین - مین اسوقت تو اس بھید کو نہ سمجھی لیکن سسرال آنے کے تیسرے دن جب مین نے اپنے شوہر کے درشن کیے تب مجھے معلوم ہوا کہ میری سہیلیان وغیرہ کیون روتی تھین -

دنیا مجھے قابل الزام نہ سمجھے - قابل مضمون نگار جو عورتون کی برائیون اور مردون کی تعریفون مین صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتے ہین مجھے معاف فرمائین تو مین رائے صاحب کا کچھ حال بیان کرون -

مین چند خاص وجوہات سے آپ کے نام کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہون - میرے مہربان [illegible] خود کوئی فرضی نام رکھ لین - آپ کی عمر قریبًا ۴۵ سال کی ہے میرے اعضا جسقدر خوبصورت اور سڈول ہین - آپ کے اُتنے ہی بھدے اور بے ڈول ہین - مین جتنی نازک بدن اور دبلی پتلی ہون - آپ اُتنے ہی عظیم الجثہ اور ڈبل ہین - مین جتنی گوری اور ہنس مکھ ہون - آپ اُتنے ہی کالے اور ترش رو ہین - میری آنکھین جتنی بڑی اور رسیلی ہین آپ کی آنکھین اتنی ہی ہاتھی کی طرح چھوٹی اور شوخ ہین - اور چہرے پر چیچک کے داغون نے آپ کے حُسن کو اور بھی بڑھا دیا ہے - اس پر بھی آپ پیلا کوٹ پہنا کرتے ہین اور کبھی کبھی ہیٹ بھی لگاتے ہین - سیٹی بجانے کا بھی آپ کو بہت شوق ہے - تھوڑی سی اُردو بھی جانتے ہین لیکن سب زبانون مین آجکل کے شعرا کی طرح اُستاد بنتے ہین - خصوصًا ہندی - گجراتی - مرہٹی زبانون مین زیادہ قابلیت بگھارتے ہین - انگریزی کے بازاری الفاظ بھی اکثر بولا کرتے ہین آپکو ناٹک اور نوٹنکی سے عشق ہے - سویرے نو بجے سو کر اُٹھتے ہین - سب سے پہلے سگار کو منھ مین لگاتے ہین - جب وہ ختم ہوتا ہے تب ناشتہ کرتے ہین اور دس بجے کے قریب حوائج ضروری سے

فراغت پاتے ہین - آپ پان ہر وقت کھاتے رہتے ہین اور جہان جی چاہتا ہے تھوک دیتے ہین شراب ارغوانی پی کر خوب تماشے کرتے ہین - مین نے آپ کا نام "دیو" رکھا ہے - میرا دیو مجھے بہت پیار کرتا ہے - وہ میرے لئے طرح طرح کے خوشبودار تیل و عطر لایا کرتا ہے - آپکو تاش کا کھیل بھی بہت پسند ہے دن بھر آوارہ لوگون مین تاش کھیلا کرتے ہین - انکے خوشامدی دوست انھین خواجہ تاش گان کہتے ہین - آپ نے کہین سے تاش کے دو چار کرتب سیکھ لئے ہین جب مزے مین آتے ہین تو مجھ بدنصیب کو بھی وہ کرتب دکھا کر بہت خوش ہوتے ہین - کبھی بیگم کو بادشاہ اور بادشاہ کو بیگم بناتے ہین - لیکن وہ جتنا مجھے دیکھکر خوش ہوتے ہین مین اتنا ہی انھین دیکھکر نفرت کرتی ہون - یہ کیون ؟ میرا حالِ غم پڑھنے والے خود ہی سمجھ لین -

ایک دن کی بات ہے - رات کے نو بجے تھے ساون کا مہینا تھا - آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے پانی برسنے والا تھا - میری طبیعت گھبرا رہی تھی - مین چپ چاپ ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھی تھی - کوئل کی کوک نے میرے دل مین آگ لگا دی - مین کرسی سے اٹھکر کمرے مین ٹہلنے لگی - مین نے اپنی حالت پر غور کیا تو آنسو نکل آئے جس سے کچھ کچھ دل کا بخار نکل گیا اور مین نے اپنی بدقسمتی کا راگ ہارمونیم پر چھیڑ دیا - مین نیچے سُر مین گا ہی رہی تھی کہ وہ دس بجے جھومتے ہوئے میرے کمرے مین آئے اور ایک کرسی کھینچکر دھم سے گر پڑے - تھوڑی دیر تک تو اپنی مہیب شکل کو دونون ہاتھون سے چھپائے خدا جانے کیا سوچتے رہے - اسکے بعد آپ یکبارگی اچھل پڑے - گویا آپ کو کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی اور سیٹی نکال کر بجانے لگے - مین حیران تھی - ڈر - نفرت اور گھبراہٹ سے مین کانپ رہی تھی - یکبارگی میرے کان مین آپکی گرجتی ہوئی اور بھدی آواز آئی - آپ نے فرمایا "مین نے سُنا ہے کہ آپ خوب گاتی ہین بڑا مہربانی اگر کرم ہو جائے تو بہتر ہے" مجھے سکتہ ہو گیا میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا کچھ دیر کے بعد آپ نے پھر کہا "اجی حضرت آپ سنتی نہین ایک آدھ کوئی چیز" مین سوچ رہی تھی کہ کوئی ایسی بات یاد آجائے کہ جس سے انکو گانے کی بات بھول جائے اور مین اسوقت کوٹا ل جاؤن - مگر آپ نے پھر دوبارہ وہی سوال کیا - اب مین کیا کرون گانے کے لئے تو مین گا سکتی ہون لیکن ایک مدہوش شخص کے سامنے کیا گاؤن اور کیسے گاؤن -

"آخاہ! اس ناز و نخرے کی کوئی وجہ۔ عرض کرتا ہون سُنا دو گی تو کیا ہو گا صاحب"
اب مین پھر سوچنے لگی "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" بہزار دقت مین نے اپنے کو سنبھالا اور اپنے مدہوش پتی سے دریافت کیا "کیا گاؤن" آپ نے فرمایا "جو آپ کا جی چاہے صاحب" مین نے پھر کہا "آپ ہی بتائیے کہ کیا گاؤن"۔ اب آپ نے فوراً جواب دیا "کوئی دادرا۔ کوئی قوالی۔ کوئی تلانہ۔ راگ سندھ طرز ٹھیٹر" مین آپ کے راگ اور راگنیون کے نام سُنکر سہم گئی۔ وہ مجھے چپ دیکھکر بولے "میری جان مین تم پر قربان۔ چاہے کچھ سناؤ۔ کوئی معرفت کوئی اندر سبھا امانت کی غزل۔ کوئی استاد اندر من کا چوبولا۔ زہر عشق کی مثنوی۔ کوئی بانکے میان یالال صاحب کی لاوُنی۔ کوئی بھائی نظیر کی قوالی۔ ہان ہان ہونے دو"

میری قابل قدر استانی جی گو مسلمان تھین مگر اُنھون نے مجھے جو گیت سکھائے تھے اُنین بھجن۔ مالتی گیت بطرز رامائن وغیرہ تو ضرور تھے لیکن انمین دادرا۔ تلانہ۔ راگ سندھ طرز ٹھیٹر نہ تھے۔ مین نے سورداس۔ تلسی داس کبیر اور شنکر کے کبت تو ضرور یاد کیے تھے لیکن مین نے بانکے میان یالال صاحب کا کبھی نام تک نہ سُنا تھا اور مجھے اسوقت تک یقین نہین ہے کہ ہندی یا اُردو مین ان نامون کے کوئی کبیشر ہوئے ہین۔ اُستانی جی! آؤ۔ میری پیاری مان اپنی اس لاڈلی لڑکی کی جسے پڑھایا لکھایا تھا حالت دیکھ جاؤ۔ افسوس مین نے تعلیم کیون پائی۔ ہائے مین نے گانا بجانا کسلئے سیکھا۔ رنج و غم کے مارے میری چھاتی پھٹی جاتی ہے۔ اور جدھر نظر اٹھاتی ہون لوگون کو اپنی بربادی پر ہنستے ہوئے ہی دیکھتی ہون گویا تمام دنیا میری اس خستہ حالی پر مذاق اُڑا رہی ہے اور صرف مین ہی رو رہی ہون اسی واسطے مین اپنے تعلیم یافتہ بھائی اور بہنون سے دریافت کرتی ہون کہ میرے ساتھ انصاف کیا گیا یا ظلم۔

مین یہ سوچ رہی تھی اور وہ مجھے گھور رہے تھے۔ مجھے اسوقت اپنی سدھ بدھ نہ تھی آپ یکبارگی اُچھل پڑے اور بولے "اللہ رے تغافل! اس معشوقانہ ادا کی کوئی حد بھی ہے" وہ کچھ اور واہیات بکنا چاہتے تھے۔ مین نے روک کر کہا ٹھہرے مین گاتی ہون۔ مین نے آنسو پوچھ ڈالے اور رنج و غم مین ڈوبی ہوئی دردناک آواز مین گانے لگی۔ گویا گانے کا اب ضروری وقت آگیا تھا۔ مین نے رامائن کے دو چار دوہے گائے۔ جب مین ایک دوہے پر

پہونچی جس کا مطلب یہ تھا ۔

"بن مین جہان کانٹے اور ببول کے سوا کچھ نہین ہے اور اس سنسان جنگل مین جہان
کوئی ہمدرد نہین دکھائی دیتا ہے کس کا سہارا لیا جاوے"

تو آپ اُٹھکر کمرے مین ٹہلنے لگے انکے مرضی کے خلاف جانکر مین نے گانا بجانا بند کردیا آپ فرمانے لگے "خوب ہوا - کمال ہوگیا - بڑی سُریلی آواز پائی ہے - مگر یہ بلی کی طرح میون میون میری سمجھ مین نہین آتا - مجھے ہندی کے گانے اچھے نہین معلوم ہوتے - مین آپ کو اچھے اچھے راگ اور راگنیان یاد کرا دونگا - ہان خوب یاد آیا ایک یہی ہے اور اپنی توند کو پھڑکاتے ہوئے ناچ ناچ کر بتانے لگے ۔

"کیسا کھلا گل لالہ چمن مین - ہان کیسا کھلا - اجی کیسا کھلا - واہ کیسا کھلا - دیکھو کیسا کھلا گل لالہ چمن مین" باقی کل یاد کرا دونگا - آپ نے ملاحظہ فرمایا کیسی پھڑکتی ہوئی چیز ہے آپ تھوڑے ہی دن مین خوب گانے لگین گی - اسکے بعد آپ سونے کے لئے اپنے کمرے مین چلے گئے اور تھوڑی ہی دیر مین خراٹے لینے لگے اور مین تنہا رہ گئی - مین نے ٹھنڈی سانس بھر کر دیکھا کہ چارون طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور میرے دل کے مندر مین بھی خوفناک تاریکی چھائی ہوئی ہے ۔

(ماخوذ از ہندی)　　اعظم کُریوی ایڈیٹر طوفان

"مقالات ٹالسٹائی"

جو عورت ظاہری نمائش اور حُسن سے مرد کے دل پر قابو پانا چاہتی ہے وہ کبھی مرد کے اثر قبضہ نہین کرسکتی بلکہ مرد کا اثر خود قبول کرچکی ہے اور اُس ذلیل معیار پر پہونچ چکی ہے جس پر مرد ہین ۔

مرد کے فرائض زیادہ وسیع اور مختلف النوع ہوتے ہین، اور عورت کے فرائض سیدھے سادے اور محدود ہوتے ہین، لیکن وہ اہم ہین اور اُنکی ذمہ داری زیادہ ہے ۔

خدا اور بنی نوع انسان کی خدمت کرنے مین مرد اور عورت دونونکا برابر حصہ ہے ۔

"عالی لکھنوی"

انجیل کی اشاعت

یورپین قوم جس امر کو تشہیر اور ترویج دینا چاہتی ہے اُنہیں کمال کرتے ہیں۔ تمثیلاً ہم صرف انجیل کے ترجموں اور شمار فروخت کا ذکر کرتے ہیں:۔

انجیل (یا اُسکے حصص) ۸۰۰ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں اسی لاکھ ۸۰۰۰۰۰۰ کاپیاں امریکہ اور یورپ کے بیبل سوسائٹیوں نے فروخت کیں۔ یہ تعداد معمولی کتب فروشوں کی فروخت کے علاوہ ہے۔ جسکی نسبت اندازہ کیا جاتا ہے کہ چالیس لاکھ فروخت ہوئی ہونگی۔

شمار اور تعداد کے اندازوں سے ڈاکٹر فاخور کی رائے ہے کہ مختلف زبانوں میں ایک کروڑ بیس لاکھ انجیل کی جلدیں سالانہ فروخت ہوتی ہیں۔

نہ معلوم سنہ ۱۹۰۸ء کے بعد کوئی BLUE BOOK بلو بک مشن کی جانب سے شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ میرے پاس سنہ ۱۹۰۸ء کی ایک کاپی ہے۔

اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں مشن پھیلے ہوئے ہیں۔ شاید دنیا کا کوئی حصہ ہوگا جہاں عیسائی مذہب کی تبلیغ نہ ہوتی ہو۔ ہندوستان میں ۷۵ سوسائٹیاں سنہ ۱۹۰۸ء میں کام کر رہی تھیں بعد کے ۱۷ یا ۱۸ سال میں ممکن ہے سوسائٹیوں کی تعداد اور زیادہ ہوگئی ہو۔ اِن سوسائٹیوں نے یہاں بہت سے عیسائی کر لئے اور انہیں سے بعض پادری کا درجہ حاصل کر کے اشاعت عیسائیت میں سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔ اُنکے ماتحت بہت سے کیٹی کسٹ بھی ہیں جو مواضعات اور شہروں کے گلی کوچوں میں وعظ کرتے ہیں۔ ہزارہا یتیم اور قحط زدہ لاوارث ہندوستانی اور کثرت سے ایسے اشخاص جنکو ہندو منزلت مناسب نہیں دیتے ترقی حیثیت کے لئے عیسائی ہو رہے ہیں۔ دیسی عیسائی رفتہ رفتہ آبادی ہند کا ایک معتدبہ جزو بنتے جاتے

ہیں - حامیان عیسائیت کا یہ جوش وخروش (جو اپنے مذہب کی ترویج وتبلیغ میں کرتے ہیں) قابل ستائش ہے - جس مذہب کے لوگ مذہبی حیثیت سے اتنے سرگرم کار ہوں پھر وہ کیوں نہ کامیاب ہوں - اُسکے مقابلہ میں ہندوؤں کو خواب خرگوش سے جگانے والا بھی کوئی نہیں نہ انکی ہمیت متقاضی ہے کہ وہ اس جانب توجہ کریں - بدھی مذہب کے لوگ ہندوستان میں موجود ہی نہیں - البتہ وہ اپنے اپنے ملکوں میں کچھ نہ کچھ سعی کر رہے ہیں لیکن بمقابلہ عیسائیوں کے انکی کوشش عشر عشیر بھی نہیں - اہل اسلام غافل نہیں ہیں وہ بھی حتی الامکان تبلیغ اسلام میں مصروف ہیں لیکن عیسائیوں کے مقابلہ میں اُنکی کوششیں بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتیں تاہم مسلمان بہت کم دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں اور اُنکے شمار میں سے کم از کم کمی نہیں ہوتی - لطف تو جب ہے کہ ہر مذہب میدان میں آجائے اور اُسکے حامیوں کی کوششیں بھی قریب قریب مساوی ہوں پھر دیکھنا چاہیئے کہ کونسا مذہب پسند عام ہوتا ہے - کیا ہمکو امید کرنی چاہیئے کہ آیندہ کبھی ایسا موقعہ آجاویگا - کہ ہر ایک مذہب کے وکلا اور حامی برابر کی لیاقتیں بھی رکھتے ہوں گے - اور ایک میدان میں کام کرتے ہونگے

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کا زور جہاں تک اعتقاد سے تعلق ہے کمی پر ہے باہمی جنگ وجدل کے لئے یا بعض حقوق کے بچانے کے لئے اس سے مدد لیجاتی ہے - مذہب فی نفسہ تو جغرافیہ قومیت پولیٹکل طاقت سے بالاتر ہونا چاہیئے - اُنکی اصل شکل تو روحانی ہے اور وہ عقبیٰ سے زیادہ واسطہ رکھتا ہے - لیکن اب تو شاید اگر گستاخی نہ سمجھی جاوے ایک فیشن سا ہو گیا ہے - یا آپس میں لڑنے کا بہانہ ہوتا جاتا ہے - ہر ایک مذہب اپنے پیروؤں کی تعداد میں افزونی چاہتا ہے - خواہ اُسکے لئے وسائل صالح ہوں یا مذموم ہوں - اُنکا مذہبی بربحث بن آئی ہے جو ساکن اور بے حرکت ہو گئے ہیں - اُنکے لئے گو یہ مشکل ہے ورنہ گو کم مشکل دیکھتے جائیے ع بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے -

تمت

مکلی کی پہاڑیان

ٹاٹا نامی ایک جھیل ہے جہان بہت سی مرغابیان رہتی ہین - اور اکثر انگریز صاحبان شکار کی غرض سے تشریف لیجاتے ہین - بنگلے کے قریب بہت سی پرانی قبرین ہین - یہ قبرین مکلی پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہین - اسکی وجہ تسمیہ کی نسبت دو باتین بیان کیجاتی ہین - بعض کا خیال ہے کہ کوئی مکلی دیوی یہان رہتی تھین - انھین کے نام پر یہ پہاڑ اس نام سے منسوب کیا گیا - بعض لوگ کہتے ہین کہ یہ نام ایک مسلمان پیغمبر نے مکے کا دروازہ سمجھکر رکھا تھا - اِسکے نیچے سید علی شیرازی کی قبر واقع ہے - مشہور ہے کہ جب شہنشاہ ہمایون شیر شاہ سے شکست کھاکر سندھ کی طرف بھاگا اور جیسلمیر ہوتا ہوا امرکوٹ کی طرف روانہ ہوا تو راستے مین اُسکے بہت سے ساتھی پیاس سے تڑپ کر مر گئے - سواری کے لئے صرف ایک گھوڑا باقی بچا جسپر اکبر کی والدہ سوار کردی گئین - امرکوٹ پہونچتے پہونچتے اُسکے ساتھ مین صرف سات آدمی رہ گئے وہین ۱۴ اکتوبر ۱۵۴۲ء کو اکبر کی پیدائش ہوئی - اِن دنون ہمایون غربت اور افلاس سے تنگ تھا - اُسکے پاس نہ تو ہمراہیون مین تقسیم کرنے کے لئے روپیہ تھا اور نہ بچے کو پہنانے کے لئے کپڑا - اُسکے پاس ایک مُشک نافہ تھا اُسی کو چیر کر اُسنے اپنے آدمیون مین تقسیم کردیا - اور اعلان کیا کہ اُسکے لڑکے کی شہرت چاردانگ عالم مین ایک روز مُشک کی خوشبو کی طرح پھیلیگی - اسی سید علی شیرازی کے زربفتی کوٹ سے (جو اہالیان ٹاٹا کی طرف سے نذر لیکر آیا تھا) اکبر کی عید ابتی پوشاک تیار ہوئی -

مکلی دیوی کی قبر سید علی شیرازی کے مقبرے کے جنوب مین واقع ہے - چونکہ اس قبر پر کوئی چھت نہین اور پتھر بھی ہندو مندر سے لئے ہوئے معلوم ہوتے ہین - اِس لئے

پہچاننا نہایت آسان ہے
جم نظام الدین 'ٹاٹا' کے بانی تھے۔ سندھ کی تاریخ کا ابتدائی حصّہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جب علاؤالدین خلجی نے سندھ کو فتح کیا اُسوقت وہان سمرس نامی ایک اچھوت فرقہ حکومت کرتا تھا۔ اُنھون نے یہان سنہ ۱۳۵۰ء سے سنہ ۱۵۲۱ء تک حکومت کی۔ لیکن جم نندو کے وقت تک وہ ٹاٹا مین آباد نہ ہوئے۔ وہ اسکے شمال مغربی حصّے مین جو سموئی کے نام سے مشہور ہے رہتے تھے۔ جب جم نندو نے اپنے آپ کو ہرطرح طاقتور بنا کر ڈاکوؤن سے ملک کو پاک وصاف کرا لیا تو ایک نیا شہر جہان کہ دائمی خوشحالی نصیب ہو سکے بسانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ براہمنون کی صلاح اور مشورے کے مطابق ایک دن مقرر کر کے اُسنے اِس شہر کی بنیاد رکھی اور ۵۰ سال تک نہایت شان وشوکت سے حکومت کرتا رہا۔ اِسے بھی مکلی پہاڑ مین دفن کیا گیا۔ جم طماچی کا بھی جو کہ نوری نامی مچھلی گیر کی لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔ اسکے پاس ہی مقبرہ بنا ہوا ہے۔

اسکے بعد جم فرزند پسر جم نندو تخت نشین ہوا۔ وہ رقّاصہ لڑکیون کا دلدادہ اور مذاق کا شیدائی تھا۔ سلطنت کے کامون کی اُسے زیادہ پروا نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۵۲۱ء مین شاہ بیگ ارغون (جسکو کہ بابر نے قندھار سے نکالدیا تھا) حملہ آور ہوا اور اسکو تخت سے علیحدہ کر دیا۔ سنہ ۱۵۳۶ء مین شاہ حسین ارغون اپنے والد کے تخت پر قابض ہو گیا۔ اور جس زمانے مین ہمایون صحرا نوردی کرتا ہوا یہان آیا۔ یہی راج کرتا تھا۔ اُسنے سنہ ۱۵۵۴ء مین وفات پائی اور مرزا اِستعار خان بانیٔ خاندانِ ترکھان ٹاٹا کا مالک بن بیٹھا۔

عیسیٰ خان کی قبر ایک پرانی مسجد کے سامنے واقع ہے۔ اسکی ساخت نہایت اعلیٰ ہے۔ مرزا عیسیٰ کے زمانے مین پرتگال والون نے ٹاٹا پر حملہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۵۵۵ء مین مرزا عیسیٰ خان سلطان محمود بکّھر جسکی مدد سے وہ سندھ کا بادشاہ بنا تھا لڑا۔
عیسیٰ خان نے پرتگال والون سے مدد طلب کرنے کے لئے اپنا آدمی گوآ روانہ کیا۔ اُس زمانے مین اُن لوگون کی بہت شہرت تھی۔ چند سال پہلے شاہ گجرات انھین کی مدد سے ہمایون کو اپنے ملک سے نکالنے مین کامیاب ہوا تھا۔ اور بدلے مین بسین اور سالسٹ

کا علاقہ بطور انعام اُنکے حوالے کر چکا تھا۔ عیسیٰ خان کو کامل یقین تھا کہ اُنکی مدد سے وہ سلطان محمود کو زک دے سکیگا۔ اور دوسری جانب پرتگال والے دریائے سندھ سے سیراب شدہ علاقہ بدلے مین حاصل کرنے کی خواب دیکھ رہے تھے۔ پرتگالی گورنر نے ۲۸ جہاز اور ۷۰۰ آدمی پیڈرو بہادر کی زیر کمان عیسیٰ خان کی مدد کے لئے روانہ کئے۔ پیڈرو کے سندھ پار ہو پہنچتے ہو پہنچتے عیسیٰ خان نے سلطان محمود کے یہ بات دلنشین کر دی کہ اسکے لئے فتح پانا ناممکنات سے ہے اور سمجھوتہ کرنے مین ہی بہتری کی صورت ہوسکتی ہے۔ عیسیٰ خان نے کہلا بھیجا کہ اب اُسے پرتگال والون کی مدد کی ضرورت نہین ہے۔ پیڈرو بہادر نے اسپر تمام اخراجات جو کہ اُسے اس سفر کے دوران مین برداشت کرنے پڑے تھے طلب کئے۔ لیکن مرزا عیسیٰ نے صاف جواب دے دیا۔ پیڈرو غصے مین آگیا اور ٹاٹا پر حملہ آور ہوا۔ ۸۰۰ آدمی قتل ہوئے۔ اُسنے شہر مین آگ لگا دی اور بہت سا روپیہ لوٹ کر واپس چلا گیا۔

عیسیٰ خان نے پھر شہر بسایا لیکن پرتگال والون سے کوئی واسطہ نہ رکھا۔ ۱۵۷۲ء تک نہایت شان وشوکت سے حکومت کی، مرنے کے بعد مکلی پہاڑ مین دفن کر دیا گیا۔

عیسیٰ خان کی وفات پر اُسکا لڑکا محمد باقی تخت نشین ہوا۔ اسکی قبر طغرل بیگ کی قبر کے شمال مشرق مین ٹوٹی پھوٹی اینٹون کی بنی ہوئی ہے۔ محمد باقی رعیت سے ناک کان کٹوانا اور داڑھی مونچھون کی صفائی کروانا تفریح طبع سمجھتا تھا۔ اور اُنکو پھانسی دینا اور ہاتھی کے پانوٴن سے کچلوانا کھیل جانتا تھا۔ ۱۵۸۴ء مین اسنے خودکشی کر کے اپنی جان دی۔

اسکے بعد جانی بیگ جسکی قبر جنوب ترین حصے مین واقع ہے تخت نشین ہوا۔ اِس کے تخت نشین ہونے سے پہلے اکبر بہت شہرت حاصل کر چکا تھا۔ سلطان محمود والئے بکر نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن جانی بیگ دریائے مٹو کے پیچھے سُرنگون سے شاہی فوج کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر صلح کرنی پڑی۔ اور شہنشاہ نے اُسے ٹاٹا کا گورنر مقرر کر دیا اُسنے ۱۵۹۹ء مین وفات پائی اور شہنشاہ نے اُسکے بیٹے بخاری بیگ کو گورنر مقرر کیا جو ۱۶۱۲ء مین قتل

کر دیا گیا- وہ جانی بیگ کے مقبرے مین دفن کیا گیا- اس قبر کو زیارت گاہ سمجھکر ہر سال بہت سے آدمی آتے ہین- بہت سی عورتین بچے مانگنے کی غرض سے وہان جاتی ہین- لیکن بخاری بیگ کے خود کوئی اولاد نہین تھی اور اُسکی موت پر اُس خاندان کا خاتمہ ہو گیا-

اسکے بعد سندھ کا گورنر شہنشاہ دہلی کی طرف سے مقرر ہوتا رہا- دیوان شرفاخان وزیر گورنر امیر خان سے بھی زیادہ محفوظ ہے- یہ دو منزلہ ہے- اسکے مشرق مین شاہی بیگمات کی قبرین ہین- مرزا طغرل بیگ کو لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُسکو جیتے جی اپنی قبر آپ ہی تعمیر کرانی پڑی- اُس کو ڈکاری کا خطاب ملا- اور لوگ اتنا حقیر سمجھتے تھے کہ چلتے چلتے قبر پر پتھر پھینکدینا ثواب کا کام سمجھتے تھے- وہان پتھرون کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا تھا- لیکن جب سے محکمہ تعمیرات نے قبر کا انتظام اپنے ہاتھ مین لیا ہے پتھر اُٹھوا دیئے گئے ہین-

رام سروپ شرما لاہور

"نغمۂ محبت"

پیارے! کل جہان سوسن کی سرخ سرخ کلیان کھلی ہوئی تھین آج وہان سفید برف شدت سے گر رہی ہے، اور باغ کی اُن روشون پر جہان مین تمھارے ساتھ ٹہلا کرتی تھی اب سرد ہوائین چل رہی ہین اور تمام فضا خنکی مین ڈوبی ہوئی ہے-

اس شاہ بلوط کے نیچے کوئل ہمارے ہی محبت کے روح افزا ترانے گایا کرتی تھی، اب کیون خاموش ہے، ہان ہان مجھے بتاؤ کہ وہ اب کہان ہے؟ کیا پہاڑون اور باغون مین بہار کا موسم ہے؟ مگر اے میرے دوست ہمارے لئے تو یہی سرد اور غمناک مہینا ہے جسمین سوائے وحشت آفرین مناظر کے میری منتظر آنکھون کو اور کچھ نہین دکھائی دیتا- شاید میری ہمراز محبت کوئل میری محروم تمناؤن سے عاجز آکر سرسبز وادیون مین چلی گئی اور اس فردوس محبت کو ہمیشہ کے لئے ویران و تنہا چھوڑ گئی-

برف رات کی منجمد خاموشی مین گر رہی ہے اور گرجا کے اسطرف گھنٹے کی آواز اب نہین سنائی دیتی، آؤ، اب ہم اور تم ایک ساتھ مل کر گائین اور اپنے دل کی دبی ہوئی چنگاریون سے فضائے محبت کو روشن کر دین-

"میرے لئے تم ہو اور تمھارے لئے مین ہون" بس یہی ایک نغمہ ہو جسکی صدائے بازگشت سے ہم دونون محو حیرت ہو جائین،

(ترجمہ) شیام کشور

تنقید کتب

تخمیس

تخمیس کے نام سے جناب احسن مارہروی کی دو تخمیسین مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے کتابی صورت مین شائع ہوئی ہین، پہلی تخمیس جناب محسن کاکوروی مرحوم کی مشہور نعتیہ قصیدہ سے متعلق ہے، اور دوسری مولانا حالی مرحوم کے مشہور و معروف نظم عرض حال سے۔

جناب احسن مارہروی کی قادر الکلامی اور استادی مین کوئی کلام نہین۔ آپ کے کلام مین پختگی اور پختگی کے ساتھ دلکشی بلاکی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان تخمیسون مین جناب احسن نے اپنی استادی اور قادر الکلامی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کے شروع مین ۴۴ صفحہ کا مقدمہ ہے اور اسکے بعد ۴۰ صفحہ پر دونون تخمیسین ہین،

آجکل عموماً طولانی مقدمے پسند کئے جاتے ہین۔ اور ستم یہ ہے کہ مقدمے کے زور پر نفس مضمون کی خوبی کا دارومدار سمجھا جاتا ہے، حالانکہ دونون الگ چیزین ہین۔ ایک کو دوسرے سے علاقہ ضرور ہے، لیکن یہ مناسب نہین ہے کہ ساری کتاب تمہید ہی مین ختم ہو جائے اور نفس مضمون ضمیمۂ تمہید بن جائے۔

مولانا حالی نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھکر ہندوستان کے شعرا کو یہ راستہ دکھادیا ہے یعنی اب ایک مختصر دیوان کے لئے بھی ایک طولانی دیباچے اور مقدمے کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ مولانا حالی کا مقدمہ بجائے خود ایک مستقل تصنیف ہے، وہ مولانا حالی کے وسعت نظر اور معلومات شعری کا آئینہ ہے، پھر پڑھنے والون کے لئے بھی ایک معلم ادب ہے۔

جناب احسن کا مقدمہ بھی پر زور ہے اور آپ نے بھی اسے ہر حیثیت سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اکثر آپ نے مولانا حالی مرحوم کا اتباع کیا ہے۔ اور مذاق شاعری مین ضروری اصلاح و ترمیم پیش کی ہے۔ لیکن مولانا حالی نے جو کچھ لکھا ہے عملاً اُسکا ثبوت

بھی دیا ہے۔ اور اپنے کلام کو اپنے قول کے تائید مین پیش کیا ہے، مگر آپ جو کچھ فرماتے ہین اُسپر
خود آپ کا عمل نہین، پھر اثر کیونکر ہو۔ مثلاً ایک جگہ تحریر فرماتے ہین "اگر ہمارے نکتہ سنج
چھوڑی ہوئی ہڈیون پر قناعت نہ کرتے اور اپنی ملکی خصوصیتون کو پیش نظر رکھکر شعر کہتے تو وہ
سخنوری کے آسمان پر آفتاب بنکر چمکتے" بلا شبہہ آپ صحیح فرماتے ہین۔ لیکن یہ تو فرمایئے
آپ سخن سنج بھی ہین، اور ناصح مشفق بھی، پتے کی باتین بھی جانتے ہین، آخر آپ نے
اپنے قول پر کیون نہ عمل کیا۔ آپ کے یہان بھی وہی گل وبلبل، وہی شب فرقت کی درازی، وہی
رقیب روسیہ کی فرضی داستان، پھر ملکی خصوصیتون کو پیش نظر رکھکر شعر کہنے کا ادعا، معاف
کیجیے گا۔ آپ کے خیالات کا آپ کے عملیات پر سایہ بھی نہین پڑا۔ ٹائیٹل پر آپ کے اسم گرامی کے
ساتھ قافیہ پیمائی کی ایسی بہتر تصویر نمایان ہے جس سے اسلاف کے رنگ کی یاد تازہ ہوجاتی
ہے، یعنی، "از فکر رواروی، علی احسن صاحب احسن مارہروی" یہ فکر رواروی، کیا بلا ہے،
یہ بے ضرورت قافیہ پیمائی کیا معنی رکھتی ہے۔ آپ فرماتے ہین، عشق وعاشقی کے جذبات کا اظہار
کیا جائے تو محسن سرے سے شاعر ہی نہین، مین کہتا ہون، عشق کے جذبات نہون تو کوئی شعر ہی
نہین کہہ سکتا، کیا عشق اللہ، عشق رسول کو آپ عشق نہین سمجھتے، اسکے علاوہ محسن نے وہ عاشقانہ
شاعری بھی کی ہے جسکی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہین، بہرحال آپ یہ نہین کہہ سکتے کہ محسن شاعر
نہ تھے، یا جذبات عشقیہ نہ رکھتے تھے، یہ بھی صحیح نہین کہ جناب محسن یا جناب انیس پر نعت یا مرثیہ گوئی
ختم ہوگئی۔ ہر اچھی چیز کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ اسکے بعد دوسری چیز ممکن نہوگی، لیکن زمانہ اس سے
بہتر چیز کو اُسکی جانشینی کے لیے منتخب کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لفظی رعایتون کے ساتھ ساتھ جناب
محسن نے نفس مضمون کو مغلق نہین ہونے دیا، لیکن اکثر شعرون مین رعایت لفظی کے وہی کرشمے
جناب محسن کے یہان بھی موجود ہین۔ جیسے دوسرے شعراء کے یہان، قلم آپ کے ہاتھ مین ہے
جسکو چاہیے آسمان پر پہونچا دیجیے، جسکو چاہیے گا زمین کے سموون مین پامال کر دیجیے، لیکن
حقیقت صرف اتنی ہے کہ جناب محسن تشبیہات اور استعارات کے گرویدہ تھے، زبان پر قدرت
رکھتے تھے اور اشعار مین اپنی طبیعت کا پورا زور دکھا دیتے تھے۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے
کہ نعت اکثر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے، لیکن اس سے بھی انکار نہین ہوسکتا کہ کبھی کبھی لفظی

رعایتون کی وجہ سے جناب محسن کا شعر بھی دوسرون کی طرح صرف الفاظ کا گورکھ دھندا رہجاتا تھا اُنکے مشہور قصیدے کا یہ شعر ہے۔ ؎

چمن حسن سے لال اُڑ گئے بنکر ہریل — سبزۂ خط سے ہوا ہونے لگی سرخیٔ لب

بلند پروازی اور معنی آفرینی کا کیا کہنا۔ لیکن غور فرمایئے، سبزۂ خط اور سرخیٔ لب کی تشبیہ لال اور ہریل سے دی گئی ہے۔ اسکے علاوہ شعر مین کیا ہے۔ یا بقول آپ کے دوسرا مصرعہ ملکی خصوصیات مین داخل بھی ہوجاے تو حاصل کیا ہے۔ ہونٹ پر تو بال نکلے نہین۔ پھر سبزۂ خط سے سرخی لب کیونکر مٹیگی، بفرض محال یہ بھی سہی کہ سبزۂ خط سے سرخی لب زائل ہوگئی لیکن لال کا ہریل بننا کہان ثابت ہوا، یہ البتہ ہوا کہ لال کی جگہ ہریل آگیا۔

اس تنقید سے میرا یہ مدعا نہین کہ جناب محسن مرحوم نے اپنی تشبیہ کو پایۂ ثبوت تک نہین پہونچایا بلکہ غرض یہ ہے کہ جس زمانہ مین مولانائے مرحوم کی نشو و نما ہوئی تھی اُس زمانہ مین عموماً تشبیہ و استعارے کی خصوصیت سے قدر کیجاتی تھی، اور یہی رنگ کم و بیش اُس زمانہ کے تمام شعراء پر چڑھا ہوا تھا۔ عموماً تشبیہ و استعارے کے مقابلے مین سیدھے سادے مضمون پر بہت کم التفات کیا جاتا تھا۔ حتی کہ بعض وقت تشبیہ و استعارے کی وجہ سے نفس مضمون پر بھی حرف آجاتا تھا۔

بہرصورت جناب احسن صاحب مارہروی نے مقدمہ بہت زوردار لکھا ہے اور شعرائے عرب کی مثالون سے اُسے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ بعض بعض جگہ طرز خطاب ویسا ہی تحکمانہ اختیار کیا ہے جو بعض خود دلپذیر ادیبون کا ہو۔ یعنی "یاد رکھو" "دیکھو" "بیہودہ بکنے کے سوا کچھ نہ پاؤگے۔" اس سے ذرا پڑھنے والے پر ایک خاص اثر پڑتا ہے، مقدمہ کے آخر مین مولانا محسن مرحوم کی سوانح عمری لکھی ہے جس سے دلچسپی مین ایک خاص اضافہ ہوگیا ہے۔ مقدمہ کے آخری صفحہ پر تحریر ہے "ایک مرتبہ گاڑی پر سوار تھے گھوڑے نے شرارت کی، گاڑی سے کود پڑے، دست راست کی ہڈی اُکھڑ گئی"، "دست راست کی ہڈی" کے بجائے اگر داہنے ہاتھ کی ہڈی لکھا جاتا تو غالباً اُردو صاف ہوجاتی، ہان صرف فارسیت پر حرف آجاتا۔

آخر مین لکھا ہے، "مرحوم کے اعقاب گرامی، دو فرزندان نامی" مقفٰے فقرے کے علاوہ اعقاب

گرامی کی ترکیب اعماقِ روح سے کم دلچسپ نہین۔

اِس ۱۴۴ صفحے کے مقدمے کے بعد صفحہ ۱ سے تخمیس شروع ہوتی ہے۔

تضمین کی خوبی یہ ہے کہ اصل مصرع یا شعر اُسمین پیوند ہوجائے، یہ نہ معلوم ہو کہ زبردستی مصرعے جوڑ دیئے گئے ہین، جب اس معیار پر ہم جناب احسن مارہروی کی تضمینون کو پرکھتے ہین تو بیساختہ جناب ممدوح کو داد دینے کا جی چاہتا ہے۔ بندش کی چستی، اور خیالات کی پاکیزگی بھی قابلِ تحسین ہے۔

مطلع اول کی تخمیس ملاحظہ ہو۔

ضیائے حق سے عبداللہ کے رو ئے منور مین — وہ طلعت تھی نہین جسکا نشان خورشید خاور مین

سبب اسکا یہ فرماتے تھے وہ ہر بزم اطہر مین — ہی منزل اک مہ کنعان کی قلب ِ اُردو مضطر مین

یہ مہمان عزیز اُترا ہے کس اُجڑے ہوئے گھر مین

اسی مطلع کی دوسری تخمیس ملاحظہ ہو،

نہ گھر کی طرح گھر ہے اور نہ کچھ سامان گھر بھر مین — نہ اتنی استطاعت جتنی ہوتی ہی تو انگر مین

نہ کیون پھر آب خجلت جوش زن ہو دیدۂ تر مین — ہی منزل اک مہ کنعان کی قلبِ اُردو مضطر مین

یہ مہمانِ عزیز اُترا ہے کس اُجڑے ہوئے گھر مین

سبحان اللہ جناب احسن نے تخمیس کے دو پہلو اختیار کیے ہین اور حق یہ ہے کہ دونون مین نہایت خوش اسلوبی سے کامیاب ہوئے ہین، داد نہ دینا ظلم ہے، مطلع کی دوسری تخمیس مین ہمین بندش اور زبان کے لحاظ سے صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر " نہ کچھ سامان گھر بھر مین" کے بجائے " نہ کچھ سامان ہے گھر مین" ہوتا، تو بندش بھی چست ہوجاتی اور "ہے" کی ضرورت بھی پوری ہوجاتی۔

صفحہ ۵ پر یہ بند تحریر ہے،

یہ حصہ ہو چکا ہے طبع گوہر بار محسن کا — کہ نقطہ نقطہ موتی بن گیا اشعار محسن کا

بہت بیجا ہے احسن رشک یہ اغیار محسن کا — حسد کیون لامکان پروازیٔ افکار محسن کا

کسی دن معرکہ ہوگا عطارد مین سخنور مین

تضمین کی خوبی مین تو کلام نہین، لیکن اغیار کے قافیہ مین ضرور کلام ہے، خدا جانے آپ نے "اغیار محسن" کے کیا معنی لئے ہین۔ اگر شعراء کے اصطلاحی معنی لئے جائین (یعنی رقیب) تو تاویل کی ضرورت پڑیگی، اور پھر ایک معشوق خیالی تلاش کرنا پڑیگا، جسکی جھلک ان مصرعون مین موجود نہین، اور اگر اغیار کے اصلی معنی لئے جائین (یعنی غیر کی جمع) تو ردیف مین 'لفظ' محسن حشو ہوا جاتا ہے، یعنی، صرف اتنے ہی سے مفہوم ادا ہو جاتا ہے، بہت بیجا ہے احسن رشک یہ اغیار کا، مگر ایسی صورت مین نہ ردیف پوری ہوتی ہے نہ وزن، بہرحال کوئی اور قافیہ ہوتا تو مناسب تھا۔ یہ تیسرے مطلع کی تضمین ملاحظہ ہو۔

جو کی آب وہوائے عطر بیزی بحر و بر مین بنایا پھول آتش کو بسائی خاک عنبر مین
عناصر کی جو خوشبوئین یہ پھیلین جسم اطہر مین ہوا عالم معطر صبح میلاد پیمبر مین
بسا ہے نالۂ جان سوز بلبل تک گل تر مین

سبحان اللہ جس زور کا شعر تھا اُسی زور کی تخمیس بھی ہوئی، خصوصاً تیسرا مصرع جناب احسن نے اس قوت سے لگایا ہے، کہ داد نہین دی جا سکتی، ساتھ ہی ساتھ ایک سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ردیف (مین) بیکار ہوئی جاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ جب عناصر کی خوشبوئین جسم اطہر سے پھیلین، تو صبح میلاد پیمبر مین عالم معطر ہو گیا۔ اگر ردیف کو قائم رکھا جائے تو مفہوم ادا نہین ہوتا، عالم تو اُسیوقت معطر ہو سکتا ہے جب خوشبو عالم مین پھیلے، لیکن تیسرا مصرع یہ بتاتا ہے کہ "خوشبوئین جسم اطہر مین پھیلین" آپ نے خوشبو کو محدود کر دیا۔ خوشبو جب تک نافے کے اندر پھیلی ہے، اُسوقت کسی کے دماغ کو معطر نہین کر سکتی، جب نافے سے نکلے گی تو دماغون پر اُسکا اثر ہوگا۔

صفحہ ۱۸ پر یہ مصرعہ تحریر ہے۔ "بچے گا بے گئے کل کوئی کب سرکار عالی مین" مفہوم تو ضرور ادا ہو گیا لیکن "بچیگا بے گئے کل" کیوجہ سے فصاحت کا خون ہو گیا۔

صفحہ ۲۵ سے عرض حال کی تضمین شروع ہوئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ احسن صاحب نے خوب ہی تضمین کی ہے،

چند بند ملاحظہ ہون۔

جس دین کے تابع تھے کبھی قیصر و خاقان جس دین سے دنیا پہ کھلا جوہر ایمان
جو دین کہ تھا امن کا اک قلعۂ ذیشان جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہبان

اب اُسکا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جو خانہ بدوشوں کو بتاتا تھا ٹھکانے آباد کئے وحشیوں نے جسنے گھرانے
جو اُنس و محبت کے سناتا تھا فسانے جو تفرقۂ اقوام کے آیا تھا مٹانے

اِس دین میں اب تفرقہ خود آکے پڑا ہے

جس دین کا پابند تھا سلطان بھی گدا بھی جس ملت محمود کا اچھا تھا برا بھی
جس دین میں تھی صبر کی دولت بھی سخا بھی جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی

اُس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے

اِن تین بندوں کو پڑھئے اور تخمیس ملاحظہ کیجئے، معلوم ہوتا ہے کہ کل مصرعے ایک ساتھ لکھے گئے ہیں، اور پانچواں مصرع ہر مصرع سے متعلق ہے، اور یہی خوبی تخمیس ہے

صفحہ ۱۳ پر یہ مصرع تحریر ہے۔ "جیتوں میں مسلمان ہیں شامل نہ مردوں میں"

لفظ مردوں کی سند چاہیئے۔

احسن صاحب نے جا بجا حاشیئے بھی لکھے ہیں۔ جس سے تخمیس کی خوبی بڑھ گئی ہے تلمیحات کی تفصیل نے اشعار کو زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، بہرحال یہ کتاب قابل قدر ہے، اور جناب احسن مارہروی کی شاعرانہ قابلیت کی شاہد عادل،

کاغذ عمدہ۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، قیمت غیر مجلد ۱۲ ار مجلد ایک روپیہ عہ،
ملنے کا پتہ۔ مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علیگڈھ

مجموعہ کلام جوہر

مجموعۂ کلام جوہر، پاکٹ سائز کے ۴۵ صفحے پر مطبع یلیہ علیگڈھ سے شایع ہوا ہے، شروع میں مولانا محمد علی صاحب جوہر کا فوٹو ہے، اسکے بعد موصوف کے مختصر حالات درج ہیں، پھر غزلیں ہیں، ابتدا میں وہ غزلیں ہیں جو آپ نے پہلے لکھی تھیں اور آخر میں کلام جدید کے عنوان سے وہ غزلیں درج ہیں جو آپ نے بیجاپور جیل میں کہی ہیں۔

اُردو شاعری کے لئے جیل خانہ بھی عجیب جولانگاہ ہے، شاید وہان پہونچکر دماغ انسانی مین شعریت کا عنصر غالب ہوجاتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے وہین بیٹھے بیٹھے اپنے کئی دیوان مرتب کرلئے، اس عام دار و گیر کے زمانہ مین بھی جیلخانو نسے برابر مشاعرون کی آوازین آئی رہین، ممکن ہے کہ خیالات کی دنیا احاطۂ زندان مین پہونچکر کچھ اور وسیع ہوجاتی ہو۔

مولانا محمد علی صاحب کے خیالات پہلے بھی اگرچہ شاعرانہ ہی تھے لیکن اس ادب نواز آب و ہوا مین داخل ہوتے ہی آپ کی شاعری کچھ سے کچھ ہوگئی، پہلے کم فرماتے تھے، لیکن اب اکثر فرماتے رہتے ہین، پہلے شعرون مین یہ جوش و اثر نہ تھا، لیکن اب اس غضب کی دلکشی ہے کہ ہر شعر دل مین چٹکیان لینے لگتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ آپ جو کچھ نظم فرماتے ہین جذبات حقیقی اور واردات قلبی کا پرتو ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام سوز و گداز کا آئینہ اور راز و نیاز کا مرقع ہوتا ہے۔

اس مختصر سے مجموعہ مین مذہبی، ملّی، سیاسی، ہر قسم کا کلام شامل ہے، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے ایک خاص رنگ مین فرمایا ہے اور کوئی نہ کوئی ایسی بات کہی ہے جس سے طبیعت پھڑک جاتی ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی آپ کا درجہ کم نہین، جو کچھ فرماتے ہین اسقدر صاف فرماتے ہین کہ نفس مطلب پر آسانی سے عبور حاصل ہوجاتا ہے۔

مذہبی رنگ مین امید کا فلسفہ ملاحظہ کیجئے، فرماتے ہین۔

قتل حسینؑ اصل مین مرگ یزید ہے ۔۔۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کتنا حوصلہ افزا شعر کہا ہے جسے پڑھکر افسردہ طبیعتون مین بھی کامیابی کا ایک جوش پیدا ہوجاتا ہے، تلمیح کا نفس مضمون سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ جزو مضمون بن گئی ہے۔

مسلمانون کی تباہی و بربادی کی ان لفظون مین تصویر کھینچتے ہین، اور بتاتے ہین کہ ان کی ذلت و خواری مومن ہونے کی دلیل ہے، زور بیان ملاحظہ کیجئے۔

اس شان امتیاز کو دیکھو کہ اہل کفر ۔۔۔ مومن سمجھ رہے ہین ہمین خوار دیکھکر

سیاسی رنگ ملاحظہ ہو۔

صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور ۔۔۔ گر بوئے گل نہین نہ سہی یاد گل تو ہے

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ　　بال و پر نکلے قفس کے در کھُلے

پہلے شعر مین یہ دکھاتے ہین کہ صیاد ہمکو اسیر کر کے ہمارے خیالات پر قابو نہین پا سکتا، اور دوسرے شعر مین فرماتے ہین کہ اسی اسیری کی سختیون نے ہم مین طاقتِ پرواز بڑھا دی ہے اور ہمارے لئے مخلصی کے راستے کھول دیئے ہین، ان حقائق سے کسکو انکار ہو سکتا ہے۔

ایک غزل کے چند مسلسل شعر ملاحظہ فرمائیے، جسمین ادبی رنگ کے ساتھ ساتھ ناصحانہ اور عاشقانہ رنگ بھی موجود ہے

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہی یہی　　ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

قیدِ گیسو سے بھلا کون رہیگا آزاد　　تیری زلفون کا جو شانون پہ بکھرنا ہے یہی

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا　　اب بھی احساس ہو اُسکا تو اُبھرنا ہی یہی

ہو نہ مایوس کہ ہے فتح کی تقریب شکست　　قلب مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی

نقد جان نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر　　کام کرنے کا یہی ہے تمھین کرنا ہے یہی

پہلے شعر مین زیست و مرگ کا ایسا دلکش اور ناصحانہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ تعریف نہین ہو سکتی، دوسرا شعر اگرچہ بظاہر عاشقانہ شعر ہے لیکن حقیقت شناس نظرین پہچانتی ہین کہ الفاظ کے پردے مین معنی کی کیسی دلکش تصویر پنہان ہے۔ تیسرا شعر قطعی غیر فانی اور تعریف سے مستغنی ہے، قوم کی غفلت شعاری کی کتنی دلکش تصویر کھینچی ہے، اور پھر کس دلکش انداز مین اُبھرنے کی ہمت دلائی ہے۔

تنقید کا ایک رُخ آپ ملاحظہ فرما چکے، اب صرف دوسرا رُخ باقی ہے، اسکے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ مولانا میدان سیاست کے مرد میدان ہین، میدان شاعری کے نہین، ممکن ہے کہ زبان و بیان کے لحاظ سے آپ کے کلام مین غلطیان ہون، اور ممکن ہے کہ بعض اشعار ایسے بھی ہون جنمین خامیان موجود ہون۔ لیکن ہمارے خیال مین مولانا کا قومی اور مذہبی جوش ان سب کا پردہ پوش ہے۔ کیونکہ آپ جو کچھ فرماتے ہین قومی و مذہبی جذبات سے متاثر ہو کر کہتے ہین حتی کہ بعض وقت یہ بھی خیال نہین ہوتا کہ جو شعر یا جو مصرعہ موزون ہوا ہے وہ اس سے پہلے بھی کہا یا لکھا جا چکا ہے۔ چنانچہ آپ کی غزلون مین چند مصرعے ایسے بھی نظر آتے ہین جو دوسرے شعراء کی غزلون مین معمولی تغیر کے ساتھ موجود ہین۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہو اس قسم کا خیال

خود مولانا کے دل مین پیدا ہوا ہو،

آپ نے ایک مطلع فرمایا ہے۔

صبا تو جاکے یہ کہیو مرے سلام کے بعد کہ تیرے نام کی رٹ ہی خدا کے نام کے بعد

یہ مطلع مولانا آسی رحمۃ اللہ علیہ کے مطلع سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ مولانا آسی کا مطلع یہ ہے

صبا پہنچ کے یہ کہنا وہان سلام کے بعد کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا کے دماغ مین اس قسم کے خیالات کا آنا ممکن ہے، خصوصاً جیل خانہ مین جبکہ عزیزون اور دوستون سے جدا ہوکر اس قسم کے جذبات وخیالات کا پیدا ہونا لازمی و فطری ہے۔

بہرحال یہ مجموعہ ہر حیثیت سے قابل قدر ہے۔ کاغذ نفیس، کتابت جلی، طباعت دیدہ زیب، قیمت مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے معلوم ہوسکتی ہے۔

وطن پرست

یہ کتاب "ریجنس ڈاٹر" مصنفہ الگزینڈر ڈوماس کا ترجمہ ہے۔ منشی تیرتھ رام صاحب فیروزپوری اسکے مترجم ہین، ترجمہ سلیس اور با محاورہ ہے، صرف کہین کہین پنجابی محاورے نظر آجاتے ہین۔ بہرحال مترجم کی کوشش قابل داد ہے۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب حجم ۳۹۹ صفحہ۔ ملنے کا پتہ۔ لال برادرس۔ پارسنز نولکھا لاہور

"اعظمی"

الفلاح

الفلاح، انجمن اشاعت اسلام جالندھر کی طرف سے ہر مہینے کی پہلی اور پندرھوین تاریخ کو شائع ہوتا ہے اسکے ایڈیٹر غازی رحمت اللہ صاحب ہین۔ مضامین عموماً مذہبی ہوتے ہین۔ ۱۵ اپریل کے پرچے مین اسلام اور مسلم کے عنوان سے ایک قابل قدر مضمون شائع ہوا ہے۔ مذہبی مباحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس رسالے کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ تقطیع ۲۲×۱۸ حجم ۱۶ صفحہ قیمت سالانہ للعہ ششماہی ۱۲؍

شائقین اس پتے پر درخواست خریداری ارسال فرمائین۔ دفتر انجمن اشاعت اسلام جالندھر

داستان نیاز

(از محمد مبین نازش بدایونی)

ازل سے دیرِ مغاں میں ہے جو دُرِ خوانِ نیاز
دیا ہے کوئے ملامت میں امتحانِ نیاز

چراغِ مردہ کی بو کیوں ہے خانۂ دل میں
مزارِ کشتۂ حسرت ہے یا نشانِ نیاز

رُخِ صنم کی زیارت سے دل کو شاد کیا
اڑائی نالۂ ناقوس سے زبانِ نیاز

ادا فریب تھے شاہد پرستیوں کے مزے
کسی کے ناز اٹھا کر جتائی شانِ نیاز

لقائے دخترِ رز اور خندۂ مستاں
ثنائے پیرِ خرابات پھر زبانِ نیاز

حیا کا پاس نہ کچھ دل میں خوفِ رسوائی
سنائی جلوہ فروشوں کو داستانِ نیاز

خیالِ یار کی وہ بے رُخی وہ غمزۂ شوخ
بتا بگڑ کے وہ کچھ طعنہ فغانِ نیاز

اُدھر غرور کا اظہار اور شوقِ جفا
اِدھر سے عجز کا انداز ہم عنانِ نیاز

اُدھر یہ فکر کہ دل توڑنا ثواب ہی آج
اِدھر یہ عرض کہ جائی رہیگی شانِ نیاز

اُدھر یہ طنز جنوں کے ہیں ولولے گستاخ
اِدھر یہ عذر کہ ہے اضطرابِ جانِ نیاز

اِدھر یہ دل کی تمنا کہ پائے بوس ہوں میں
اُدھر یہ شرم کہ ہی ہی تمھیں گمانِ نیاز

ہزار حیف کہ اِک عمر تک کئے سجدے
بتوں میں کوئی بھی نکلا نہ قدردانِ نیاز

کلیجہ تھام کے رہ جائیں مہ رُخانِ جہاں
سنائے قصۂ رفتہ اگر زبانِ نیاز

ابھی ہے جلوہ پرستی کا ذوق لے اے صبح
نہ چھیڑ دیکھ خبردار داستانِ نیاز

تصورات کو غیرت ہے دنگ عقلِ بشر
امورِ کلیہ کیونکر ہوں رازدانِ نیاز

اُڑی ہی اسکی طرف بو جھکی ہے سجدہ میں شاخ
مجھے ہے جنبش و تحریک پر گمانِ نیاز

نظامِ عالمِ ہستی کا مدعا ہے یہی
نفس نفس کے لئے شرطِ امتحانِ نیاز

کبھی شمار میں اجزائے کائنات نہوں
نفوس مدرکہ پر تنگ ہو جہانِ نیاز

دلیلِ عشق ہے حکمت ہو شیخ کی معدوم
وہ بے نیاز دکھائے جو اپنی شانِ نیاز

یہ زہد میں ہے کوئی زہد ہم نہیں قائل
کہ دل میں کفر جبیں پر رہے نشانِ نیاز

اسطرح جو رہی اِتقا کی پابندی
تو ایک روز اُجڑ جائیگا جہانِ نیاز

خونِ آرزو

اب تو امید سے بھی ہوں محروم
میری تقدیر یا مرا مقسوم

تیری ہستی حُسن "معنی خیز"
میرا عشق "ایک لفظِ بے مفہوم"

کھول دے پردۂ حقیقتِ راز
عقل کی ہرزہ کاریاں معلوم

توڑ دے خود طلسم ہستی کا
کیوں ہے سرگشتۂ قیود و رسوم

عشق کی بخت کاریاں! توبہ
دل سے شوقِ طلب بھی ہے معدوم

نالۂ نیم شب، خروشِ سحر
ہیں اب اور ایک خاطرِ مغموم

رنگ لائیگا یہ تغافلِ حُسن
جان دیدے گا عاشقِ مظلوم

ایک جان اور غموں کا یہ انبوہ
ایک دل اور یہ حسرتوں کا ہجوم

اُس کے مٹتے ہی مٹ گئی دنیا
ہائے اِک چیز تھا دلِ مرحوم

شوق افسردہ، جوش پژمردہ
ہو گئی دہر کی ہوا مسموم

میکدے میں نہ ولولے ہیں نہ کیف
نہ حریفاں نہ بادہ نوش کی دھوم

یادگارِ زمانۂ ماضی
ایک اُمید ہے سو وہ موہوم

ہو چکا خونِ آرزو فہمی
مِل گئی دادِ حسرتِ معصوم

فہمی بدایونی

آئینۂ حال

کیا خوب جہان کی بستی ہے، مظلوم کوئی جلّاد کوئی
کرتا ہے کوئی دادِ طلب، اور کرتا ہے بیداد کوئی

ہے کام کسیکا رحم و کرم، کرتا ہی ستم ایجاد کوئی
حاتم کا مقلد ہے کوئی، ہے معتقدِ شداد کوئی

تعمیر کہین پر جاری ہے، گھر بسنے کی تیاری ہے
آباد کوئی گھر ہوتا ہے، اور ہوتا ہے برباد کوئی

ہوتا ہے کہین ناچ اور گانا، گھر کوئی بنا ماتم خانہ
مسرور کوئی رنجور کوئی، غمگین کوئی دلشاد کوئی

نادار کوئی، زردار کوئی، مجبور کوئی مختار کوئی
ماتحت کوئی سردار کوئی، پابند کوئی آزاد کوئی

حاکم ہی کوئی محکوم کوئی، خادم ہی کوئی مخدوم کوئی
شادان ہے کوئی مغموم کوئی، ہی صید کوئی صیاد کوئی

مفلس ہی کوئی، امیر کوئی، محتاج کوئی ہی فقیر کوئی
ہے شاہ کوئی، ہی وزیر کوئی، اور مانگتا ہی امداد کوئی

جینے سے پریشان ہی کوئی، ہستی پہ نازان ہی کوئی
ماتم مین گریان ہی کوئی، گاتا ہے مبارکباد کوئی

غالب ہی کوئی، مغلوب کوئی، طالب ہے کوئی مطلوب کوئی
عاشق ہی کوئی محبوب کوئی، شیرین ہی کوئی فرہاد کوئی

واصل ہی کوئی مہجور کوئی، ہی کوئی قرین اور دور کوئی
ہے یادِ وصل سے چور کوئی، اور ہجر سے ہی ناشاد کوئی

ہر نوع کے شاعر بھی ہین یہان، بزمی ہی کوئی احسن کوئی
نومشق کوئی نقاد کوئی، شاگرد کوئی استاد کوئی

عبدالصمد بزمی (ڈبائی)



لطفِ سخن

(جناب ندرت میرٹھی)

کچھ بھی نہ تھا نکلتے ہی پیکانِ آرزو — تھی دل کی جان کاوشِ پنہانِ آرزو
پہلے تو دل کو پھونک دیا ضبطِ آہ سے — اب دم بخود ہین سوختہ سامانِ آرزو
دنیا مین کیا پڑھے گا کوئی میری سرگذشت — لکھا ہے دل کے خون سے عنوانِ آرزو
مین اُنکی آرزو کو سمجھتا ہون جانِ دل — وہ میرے دل کو جانتے ہین جانِ آرزو
ہم سے رُکے گا گریۂ بے اختیار کیا — پوشیدہ ہے ہر اشک مین طوفانِ آرزو
الزام سر پہ حُسن کی رسوائیوں کا ہے — ہے ابتدا سے عشق پشیمانِ آرزو
آئی دمِ اخیر صدائے شکستِ دل — ٹوٹا ہے آج کیا درِ زندانِ آرزو
رگ رگ مین دل کی جال ہے امید و بیم کا — اب کشمکش سے چھوٹ چکی جانِ آرزو
اے آسمان! کچھ تجھے خوفِ خدا بھی ہے — یہ دل یہ بحرِ عشق، یہ طوفانِ آرزو
ہے دل مین خارِ غم تو نکلنے کی کیا امید — اُلجھا رہے گا گوشۂ دامانِ آرزو

ندرت سے کہہ رہی ہین اُمنگین شباب کی
کیا اب کچھ اور چاہیے سامانِ آرزو

ابوالمعانی جناب مرزا یاس لکھنوی

قفس کو جانتے ہین یاس آشیان اپنا — مکان اپنا زمین اپنی آسمان اپنا
ہوائے تند مین ٹھہرا نہ آشیان اپنا — چراغ جل نہ سکا زیرِ آسمان اپنا
بس ایک سایۂ دیوارِ یار کیا کم ہے — اُٹھا لے سر سے مرے سایہ آسمان اپنا
ہمارے قتل کا وعدہ ہے غیر کے ہاتھون — عجیب شرط پہ ٹھہرا ہے امتحان اپنا
مزے کے ساتھ ہون اندوہ و غم تو کیا کہنا — یقین نہو تو کرے کوئی امتحان اپنا
شریک حال ہوا ہے جو فقر و فاقہ مین — گڑ لگا ساتھ ہی کیا اپنے میہمان اپنا
سُنا ہے رنگ زمانہ کا اعتبار نہین — بدل نہ جائے یقین سے کہین گمان اپنا

عجیب بھول بھلیاں ہے منزل ہستی
بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کاروان اپنا

کدھر سے آتی ہے یوسف کی بوئے مستانہ
خراب پھرتا ہے جنگل مین کاروان اپنا

جرس نے مژدۂ منزل سُنا کے چونکایا
نکل چلا تھا دبے پاؤن کاروان اپنا

خدا کسی کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا ہے آشیان اپنا

ہمارا رنگ سخن پاس کوئی کیا جانے
سوائے آتش سے کون ہمزبان اپنا

جناب مرزا جعفر علیخان صاحب اثر لکھنوی

میری بیربطی فریاد پہ مسرور رہو
غمزدے کیا کرین جب ضبط کا مقدور رہو

پھر وہ اُلفت ہوئی بلکہ ہوسنائی ہے
ذرّہ ذرّہ جو مری خاک کا منصور ہو

امتیاز من و تو سہل نہین ہے کہ مٹے
دل سے گرم فنا تو ابھی مسرور ہو

ایک چشمک مین تسلی نہین ہوتی دل کی
تم جلا دو مجھے لیکن بشرطیکہ ہو

واہ کس لطف سے اٹھا ہے دوئی کا پردہ
حسن خود بین نے کہا عشق کا مذکور ہو

وصل مین ہجر ہو اور ہجر مین ہو لذت وصل
مین طلبگار ہون اُس دل کا جو مجبور ہو

تو نے اے عشق زلیخا جسے یون جذب کیا
دیدۂ حضرت یعقوب کا وہ نور ہو

اب نظر آتے ہین دل مین جو مٹے سے کچھ نقش
ایک بھی اُنمین نہ ایسا تھا جو مستور ہو

قابل رشک ہے وہ دل کہ محبت مین جسے
ہجر کی تاب ہو وصل کا مقدور ہو

ہین خلوت کدۂ ناز مین رکھتے ہین قدم
خیر تو جلوہ نما او بت مغرور ہو

اشک خون بنکے ٹھہر جا سر مژگان ایدل
دار موجود ہے صد حیف جو منصور ہو

دیکھنے کے لئے کچھ فاصلہ لازم ہے کلیم
جو رگ جان سے قریب اتنا ہو کیون دور ہو

بدنما داغ ہے اک دامن ہستی پہ اثر
دل اُسے کیون کہین جلوون سے جو معمور ہو

جناب حکیم جگر صدیقی بسوانی

ہم اُس بزم مین مہمان جا رہے ہین
بلایا ہے کس نے کہان جا رہے ہین

اُٹھے ہین جو خوش خوش کوئی اُنسے پوچھے
وہ دفنا کے ہمکو کہان جائے ہین

مرے بعد اتنا خیال اُن کو آیا
مٹا نے لحد کا نشان جا رہے ہین

عدم جانے والے عدم کو سدھارتے کسی نے نہ پوچھا کہاں جا رہے ہین
خدا ہی جو پہونچائے اُن کو تو پہونچین عدم کو ترے ناتوان جا رہے ہین
مجھے در سے اُٹھوا کے کہتے ہین ہنسکر کوئی اِسلئے پوچھے کہان جا رہے ہین
بڑے لُطف سے ہم چلے ہین قفس کو لیئے دوش پر آشیان جا رہے ہین
کسی نے نہ لے موت ہمکو بتایا کہان سے ہم آئے کہان جا رہے ہین
خجل ہو گئے میخانے مین شیخ صاحب مِرے ساتھ حضرت کہان جا رہے ہین

جگر ہمکو بہکا کے دل لیچلا ہے
ہمین کیا بتائین کہان جا رہے ہین

جناب احسن سنبھلی ناظم حلقہ ادبیہ کانپور

سرِ محفل کہیں چھن جائے نہ حاصل میرا نگہِ ناز کو دعویٰ ہے کہ ہے دل میرا
حسن والوں کو بنا دیتا ہے قاتل میرا یہ مری جان کا دشمن ہے کہ ہے دل میرا
دیکھ لیں وہ بھی تڑپنا سرِ محفل میرا پھر بُرا حال بنا دے طپشِ دل میرا
ہائے بے ہائے ترے دستِ تسلی کے مزے کاش پہلو میں تڑپتا ہی رہے دل میرا
داغِ ناکامی و مایوسی ارمان و امید ایک دُنیا لئے دنیا سے چلا دل میرا
وہی وحشت وہی صورت وہی ہُو کا عالم کوئی ویرانہ ہے پہلو میں کہ ہے دل میرا
بیخودی میں مجھے احساسِ الم تک نہ رہا اب خدا جانے کہ یہ درد ہے یا دل میرا
دامنِ یار پہ گر گر کے پھسلنا دیکھو قطرہ قطرہ مرے آنسو کا بنا دل میرا
اُف رے محفل میں تری شوخ نگاہی ظالم آج پہلو میں ہر اک شخص کے ہے دل میرا
پھر اُنھیں دیکھ کے کیا جانئے کیا یاد آیا حشر میں حشر اُٹھائے نہ کہیں دل میرا
یوں سمجھ لیجئے افسانۂ طور و موسیٰ آپ کی جلوہ گہِ ناز تھی اور دل میرا
نگہِ مست ذرا دل پہ سنبھل کر گرنا ٹوٹ جائے نہ کوئی آبلۂ دل میرا
عالمِ بیخودیِ عشق بھی کیا عالم ہے نہیں معلوم کہاں میں ہوں کہاں دل میرا

شغلِ مے فرقتِ ساقی میں نہ چھوٹا احسن
بادہ ہے خونِ جگر ساغرِ مے دل میرا

علمی نوٹ اور خبرین

منشی نوبت راے نظر مرحوم

ادبی دنیا مین یہ خبر نہایت اندوہ وغم کے ساتھ سُنی جائیگی کہ ۱۰-اپریل کو لکھنؤ کے سرآمد شعراے حال اور اُردو کے نامور انشاپرداز منشی نوبت راے صاحب نظر کا انتقال پُرملال ہوگیا - مرحوم کچھ عرصہ سے مرض ضیق النفس مین مبتلا تھے، مگر اسطرف صحت یاب ہو رہے تھے اور کسی کو خبر نہ تھی کہ موت اسقدر جلد اُنکو ہم سے جدا کرنیوالی ہے، گذشتہ فروری مین اُنھون نے رسالہ زمانہ کے خاطر اکبر مرحوم کے خطوط کی تنقید لکھنا شروع کی، اسکا ایک حصہ جسمین مخدومی مولینا حسن نظامی صاحب کے نام خطوط پر ریویو ہے زمانہ کے پچھلے نمبر مین شایع ہو چکا ہے، دوسرا حصہ مکرمی عزیز صاحب کے نام خطوط کے متعلق ایک علیحدہ مضمون کی حیثیت سے لکھا جانیوالا تھا، مگر مشیت [illegible] کچھ اور تھی، اور قبل اسکے کہ یہ مضمون ختم ہو سکتا سفر آخرت درپیش ہوگیا - اُردو ادب کے لئے یہ وفات حسرت آیات ایک صدمہ عظیم ہے جسکی تلافی ناممکن ہے جس یکسوئی اور یکدلی سے مرحوم نے اپنی زندگی اردو ادب کی توسیع و ترقی کے لئے وقف کر رکھی تھی اُسکی صرف چند ہی مثالین ملک مین ہونگی، اوائل زندگی سے آخر عمر تک مرحوم ملک کے بہترین ادبی خدمت مین مشغول و مصروف رہے - پہلے اُنھون نے خود ایک رسالہ خدنگ نظر جاری کیا، جب ملک اسکے بار کا متحمل نہ ہوسکا تو وہ سنہ ۱۹۰۴ء مین رسالہ زمانہ کے اسٹاف مین شامل ہوگئے، اور یہان کئی سال تک برابر کام کرتے رہے - دفتر کے معمولی کامون کے علاوہ اُنھون نے رسالہ ہذا کی بہترین تنقیدین لکھین جنکا مطالعہ آج بھی اہل ذوق کے لئے مفید اور سبق آموز ہوسکتا ہے، حصہ نظم کی ترتیب و تدوین بھی آپ کے ذمہ تھی کئی سال تک کام کرنے کے بعد آپ انڈین پریس الہ آباد مین چلے گئے جہان سے آپ کی ایڈیٹری مین اُردو کا مشہور و معروف رسالہ ادیب جاری ہوا - دو سال کے بعد بعض وجوہ سے آپ کا اس سے قطع تعلق ہوگیا اور پھر اپنے وطن مین آکر جاگزین ہوئے لیکن سنہ ۱۹۱۲ء مین ایڈیٹر زمانہ کی محبت آپ کو پھر کانپور کھینچ لائی - یہان اگراس دفعہ آپ نے اخبار آزاد مین بھی ایڈیٹر زمانہ کا ہاتھ بٹایا - بعد چندے کچھ دنون کیلئے آزاد روزانہ شایع ہوا اور اس سلسلے مین آپ کو بھی اخبار نویسی کا کام کرنا پڑا جس سے اس مد مین بھی آپ کو مشق اور تجربہ حاصل کرنے کا پورا موقعہ مل گیا - چنانچہ تھوڑے ہی دنون مین آپ نے پولٹیکل اخبارون کے

اڈیٹری کی قابلیت بھی حاصل کرلی۔ مسٹر حامد علیخانصاحب مرحوم کے توسط سے آپ کو مطبع منشی نولکشور نے اپنے یہان بُلا لیا، یہان پہلے تو تفریح کی اڈیٹری اور بعدہ اودھ اخبار کا قلمدان ادارت آپ کے سپرد کیا گیا آپ کے وقت مین اودھ اخبار کی بالکل کایا پلٹ ہوگئی اور یہ قدیم اخبار بھی متانت اور اعتدال کو مد نظر رکھتے ہوئے رفتار زمانہ سے متاثر ہونے لگا، مگر روزانہ اخبار کی ذمہ داری آپ کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئی اور اس سلسلے مین جو محنت شاقہ کرنا پڑی اُس سے آپ کی تندرستی خراب ہوگئی، سوء اتفاق سے پیہم خانگی صدمات نے طبیعت کو اور بھی نڈھال کردیا، پہلے آپ کا نواسہ جسکو آپ بہت چاہتے تھے داغ مفارقت دے گیا، پھر مادر مہربان کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، اور بھی کئی خاندانی صدمات پہونچے۔ آخر مین آپ کی اکلوتی بیٹی بھی داغ مفارقت دے گئی۔ غرض پے درپے حادثات نے مرحوم کو بہت دل برداشتہ کردیا، اِدھر تندرستی نے جواب دیدیا تھا، اُدھر اودھ اخبار سے قطع تعلق ہوگیا، اور اسکے ساتھ ہی اطمینان قلب بھی رخصت ہوگیا۔ چنانچہ ان حادثات اور تفکرات کا عکس آپکے آخر زمانہ کے اشعار مین موجود ہے، اس طرف دو تین سال سے جب آپ اپنی زندگی و تندرستی کا ذکر کرتے تو اس طرح باتین کرتے تھے، گویا زندگی سے سیر اور دنیا سے بالکل مایوس ہوگئے ہین، کلام مین بھی اکثر اشعار اس طرز کے نظم ہوتے تھے جنسے معلوم ہوتا تھا کہ مرحوم کا دنیا سے جی بھر گیا ہے اور موت کا شوق سے انتظار کررہے ہین اور اسکو دنیوی کشمکش کا خاتمہ اور مصائب زندگی کا علاج سمجھتے ہین، آپ کے لفظ لفظ سے بیدلی اور مایوسی مترشح ہوتی تھی، مثال کے طور پر آخر زمانہ کے چند اشعار ملاحظہ ہون۔

نظر اب چلکے کرنا چاہیے آباد مرقد کو بہت ہی منتظر اپنی زمین گور غریبان کی

موت سے کیا سازکر رکھا ہی اُسنے اے نظر مدتین گذرین سبب کھلتا نہین تاخیر کا

زندگی کی کشمکش سے مرکے پائی کچھ نجات اس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی

بار الم نہ اُٹھ سکا، کثرت اضطرار مین مرکے سبک ہوا ہون مین دیدۂ اعتبار مین

اِس سلسلے مین فروری کی غزل کے دو ایک شعر خاص طور پر قابل ملاحظہ ہین۔

مدت سے ڈھونڈتا ہون ملتا مگر نہین ہے وہ یک سکون خاطر جو بیشتر نہین ہے

دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی　　زندہ ہون اب کہ مردہ مجھکو خبر نہین ہے
آہین بھرین بہت کچھ دم توڑنا ہے باقی　　اِس آہ مین بھی دیکھون ہے یا اثر نہین ہے
تاریک ہوگئی ہو دنیا ہی جب نظر مین　　پھر کوئی امتیاز شام و سحر نہین ہے
دنیا سے جا رہے ہو کیا لیکے اے نظرؔ تم
زادِ سفر نہین ہے رختِ سفر نہین ہے

طولِ غم سے مختصر غم کی کہانی ہوگئی　　جب بھری اک آہ دل کی نوحہ خوانی ہوگئی
ختم وہ بیچی تری اے دایہ فسانی ہوگئی　　ہم بھی زندہ تھے کبھی وہ ہمزندگانی ہوگئی
ہر قدم پر ایک نالہ ہر نفس پر ایک آہ　　زندگی کیا ایک شرحِ سخت جانی ہوگئی
ہجر مین آنکھون سے جاری ہے برابر سیلِ اشک　　بند دو کوزون مین دریا کی روانی ہوگئی
مے کو دنیا آتشِ سیال کہتی ہے نظرؔ
لیکن اپنے جام مین آتے ہی پانی ہوگئی

دنیوی نقطۂ خیال سے نظرؔ صاحب کی زندگی ایک ناکامیاب زندگی تھی مگر اردو زبان کے بہترین انشاپردازون کے لئے ابھی تک دنیا مین فراغت کی زندگی بسر کرنے کا کوئی سامان نہین ہے، نظرؔ صاحب کو ابتداے زندگی ہی سے علم و ادب سے دلچسپی ہوگئی تھی، یہ دلچسپی آخر عمر تک اُنھون نے اِس طرح قائم رکھی کہ زندگی بھر اُنھون نے کوئی اور شغلہ اختیار ہی نہین کیا۔

فطرت سے اُنھون نے علم ادب کے لئے نہایت موزون طبیعت پائی تھی۔ قدرت نے انھین نہایت شستہ و سلیم ذوقِ سخن عطا کیا تھا۔ بچپن مین انکو بہت اچھی صحبت ملی تھی، جس سے طبیعت مین رفعت، مزاج مین تہذیب متانت و سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی، انکا ذہن بھی بلا کا تھا کہ جس بات کو اور لوگ مہینون مین حاصل کرتے اُسپر وہ چند دنون کی محنت مین حاوی ہوجاتے تھے۔ انکا معیارِ خیال بہت اونچا، ان کا مطمحِ نظر بلند اور رفیع تھا، انکی پسند مشکل ہوتی تھی، خیالات وسیع، اور نظر غائر، اور نکتہ رس رکھتے تھے، طبیعت دردرس اور دماغ نکتہ سنج پایا تھا، ہر اعتبار سے آپ کا کلام اُردو کے بہترین شعرا کی صف مین جگہ پانے کا مستحق ہے، انکی زبان صاف اور پاکیزہ، انکی بندشین چست اور طرزِ بیان ہمیشہ بے عیب ہوتا تھا۔ ہمیشہ لطیف اور نفیس خیالات ہی کو نظم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بہتات کی انھون نے کبھی پرواہ نہ کی۔ اپنے اشعار مین بلحاظ فن وہ ہر دم تکمیل کا درجہ حاصل کرنے کے درپے رہتے تھے جبتک

کوئی خاص نکتہ اُنکے ذہن مین نہ آتا کبھی نظم ونثر کی طرف رجوع نہ ہوتے تھے - مگر جدت کی تلاش مین وہ دوراز کار استعارات ، مبہم اور مغلق ترکیبون اور بے معنی بندشون سے ہمیشہ بہت سختی سے بچتے بحیثیت نقاد سخن انکا درجہ دور جدید کے تنقید نگارون مین بہت اونچا تھا - انکی بعض تنقیدین جو زمانہ مین چھپ چکی ہین اپنے قسم کی بہترین تنقیدین ہین ، اور ہم سمجھتے ہین کہ دنیاے اردو مین ان مباحث موضوع پر اسوقت بھی ان سے بہتر تنقید لکھنے والا موجود نہین ہے - اردو زبان کو انکی بے وقت وفات سے جو نقصان پہونچا ہے اسکا اندازہ ناممکن ہے - رسالہ زمانہ کے لئے تو یا یک ناقابل تلافی حادثہ ہے ایڈیٹر کی ذات کے بعد صرف دو ہی چار نام زمانہ کے خاص کارکنان مین شامل کئے جا سکتے ہین - نظر - سرور - اور پریم چند نے اس رسالہ کی ترقی مین جو حصہ لیا ہے اسکے لئے یہ رسالہ ہمیشہ انکا ممنون رہے گا - سُرور کی جدائی کا غم ابھی تک تازہ ہے - افسوس نظر بھی اب اس دنیا مین ہمارا ساتھ دینے کو موجود نہین رہے - افسوس وہ دل و دماغ جسکے نور باطن سے زمانہ کے صفحات اکثر منور ہوا کرتے تھے آج بے حس وحرکت ہوگیا ہے - آہ انسانی زندگی کیسی بے اعتبار و بے اختیار ہے - کل جسکو اپنا سمجھتے تھے - آج وہ بیگانہ ہوگیا - مگر دنیا کا یہی لیکھا ہے کہ بہت آگے گئے باقی جو ہین تیار بیٹھے ہین ، خداوند تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت مین جگہ دے ، اور پسماندگان کو اس حادثۂ عظیم کے برداشت کی طاقت عطا فرمائے -

---

ایک خادم علم کی وفات افسوس کہ منشی عبداللہ خانصاحب مرحوم نے ۱۶ اپریل کو اس دار فانی سے رحلت فرمائی آپ مشہور و معروف پبلیشر کتب تھے بعض کتابون کے مصنف بھی تھے ، جیدہ اور منتخب کتابون کی تجارت کرتے تھے ، ۲۷ برس تک کتبخانہ آصفیہ مین رہے ، آخر عمر مین آنکھون سے معذور ہوگئے تھے ، او رمین حیات تک ۵۰ ماہوار سرکار آصفیہ سے وظیفہ پاتے رہے -

تاریخ دکن سینٹ نہال سنگھ صاحب انگریزی مین دکن کی تاریخ لکھ رہے ہین ، اس سے پہلے آپ کو سرکار سے ۱۵ ہزار روپیہ اس کام کے لئے عنایت ہوچکا ہے ، حال مین پانچہزار کی رقم اور بھی عطا کی گئی ہے -

انسائیکلو پیڈیا امریکہ کی ایک سوسائٹی انسائیکلو پیڈیا کا ایک خاص اڈیشن شائع کرنا چاہتی ہے جسکا حجم کم سے کم اور معلومات زیادہ سے زیادہ ہونگی ، کاغذ باریک اور اعلیٰ قسم کا ہوگا ، ضخامت صرف اتنی ہوگی کہ یہ آسانی ہینڈ بیگ مین بند ہوسکے ، اور سفر مین کام دے سکے -

زمانہ

جلد ۴۰   جون سنہ ۱۹۲۳ء   نمبر ۶

جاپان

برّاعظم ایشیا کے مشرقی طرف جزیروں کا ایک مجموعہ واقعہ ہے۔ جسکا نام جاپان ہے۔ برّاعظم ایشیا کا وہ حصّہ جو جاپان سے نزدیک ہے۔ جزیرہ نما سے کوریا کے نام سے مشہور ہے۔ جو بحیرۂ زرد کو بحیرۂ جاپان سے جدا کرتا ہے۔ کوریا جو "سرزمین سکوتِ صبح" کے نام سے مشہور ہے بہت پُرانا ملک ہے۔ وہ منظر کتنا خوشنما ہوتا ہے جب کرۂ آتشیں سمندر سے نہا کر نکلتا ہے۔ اسکی سنہری کرنیں لہروں پر رقص کرتی ہیں اور اُسکی روشنی سے آسمان پر ہلکے اور خوشنما رنگوں کے تار بندھ جاتے ہیں۔ چینی لوگ قدیم الایام سے اس شاندار مشرقی منظر کو دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اور اُنکے اسلاف اپنی کتابوں میں اس شاندار مشرقی سمندر کے جزیرہ میں رہنے والے خیالی دیوتاؤں کے متعلق عجیب و غریب کہانیاں لکھ گئے ہیں۔ اس طرح جاپان "طلوعِ آفتاب کا ملک" ایک پاک اور پُراسرار سرزمین گنا جانے لگا۔ جسکے باشندے جائز فخر سے اپنے آپ کو دیوتاؤں کی اولاد بتلاتے ہیں۔ کچھ مدت کے بعد ملک میں دیوتاؤں۔ اوتاروں اور روحوں کی پرستش شروع ہو گئی۔ جسکا اثر اب تک جاپانیوں پر باقی ہے۔ اس مذہب کو شنتو اِزم یعنی "دیوتاؤں کا طریق" کہا جاتا ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ غاروں میں رہنے والے انسانوں کے بعد جاپان میں

اینو AINU قوم کے لوگ سائبریا سے آکر آباد ہوئے۔ ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سائبریا جیسے یخ بستہ ملک کے مقابلہ میں انھوں نے ان جنوبی زرخیز اور خوبصورت جزیروں کو جنکی آب و ہوا نہایت معتدل اور فرحت بخش ہے۔ کسقدر پسند کیا ہوگا۔ اینو قوم کو ہر دفعہ مہذب حملہ آوروں کے سامنے پسپا ہونا پڑا۔ ان حملہ آوروں میں سے بعض تو چینیوں کے مشابہ منگولین قوم سے تھے۔ جو بجیرۂ جاپان کو طے کرکے کوریا۔ منچوریا سے آئے تھے۔ اور بعض ملائے MALAY قوم سے تھے جو جنوبی ایشیا سے آئے تھے۔ اگرچہ موجودہ جاپانی انھیں دونوں بڑی قوموں کی اولاد ہیں۔ تاہم اینو قوم کے لوگ کامل طور پر جاپان سے خارج نہیں ہو سکے۔ اب بھی شمالی جاپان میں ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ وہ جاپانی قوموں سے علیحدہ رہتے ہیں اور انکے جسم پر بہت زیادہ بال ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ عام طور پر امن پسند ہیں۔ اور انمیں بعض اچھی صفات بھی پائی جاتی ہیں تاہم انکو اپنی ترقی کا کچھ خیال نہیں۔ اور انکا گزارہ صرف مچھلی اور جنگلی جانوروں کے شکار پر ہے۔

جاپانیوں کے کئی تیوہار ہیں جنمیں سے دو زیادہ مشہور ہیں جو ۱۱ فروری اور ۳ اپریل کو منائے جاتے ہیں۔ انمیں سے اول الذکر تاریخ ان کے سب سے پہلے شہنشاہ کی تخت نشینی کی یادگار ہے۔ اور دوسری اسکی وفات کی۔ اسکا نام جمو JIMMU تھا جو آج سے ۲۵۰۰ سال پہلے گزرا ہے۔ جاپانی کہتے ہیں کہ اسکی اولاد اسوقت سے لیکر آج تک ان پر حکمراں رہی ہے۔ لیکن اس طویل عرصہ کی ابتدائی تاریخ کچھ زیادہ معتبر نہیں۔

کوریا کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔ مسیح سے قریباً ہزار سال پہلے پرانے مہذب چینی اس کوہستانی جزیرہ نما میں آئے۔ انھوں نے پرانے غاروں کے رہنے والوں کو ملک سے باہر نکال دیا۔ اور خود مختار ریاستیں قائم کرلیں جو بعد میں ایک ہی بادشاہ کی ماتحت ہوگئیں مسیح سے قبل اور بعد کے زمانہ میں چینی اور کورین لوگ جاپان میں بکثرت پھیل گئے۔

یہ پرانی داستانیں درست ہوں یا نہوں لیکن اسمیں شبہ نہیں کہ جاپان اور کوریا کے لوگوں میں ان دنوں بہت آمد و رفت تھی۔ جاپانی چینیوں کی طرح شروع سے نہروں کے کاٹنے دھان کے کھیتوں میں پانی لانے اور تجارت اور مصنوعات کی ترقی کی طرف بہت متوجہ تھے

وہ زمانہ قدیم ہی سے اپنے اباؤ اجداد کی عزت کرنے کے خوگر تھے - چنانچہ بادشاہ میکاڈو MIKADO بھی قابل پرستش مان لیا گیا جسکے پاس تک عام آدمیوں کی رسائی ناممکن تھی -

چھٹی صدی میں جب اینگلو سیکسن قوم انگلستان میں آباد ہو رہی تھی اُسوقت بودھ مذہب چین اور کوریا کے ذریعہ جاپان میں پھیلنا شروع ہوا - کچھ عرصہ کے بعد اسے اتنی اہمیت حاصل ہوگئی کہ پُرانے مذہب شنٹوازم کے برابر مقدس سمجھ لیا گیا -

امیروں کے کئی طبقے تھے - ہر طبقہ دوسرے سے بازی لیجانے کے لئے برسرِ پیکار رہتا تھا - جوں جوں مکاڈو کی زندگی پس پردہ گزرنے لگی امیروں اور سرداروں کا اقتدار بڑھتا گیا - اصلی حکمراں طاقت کا سردار شوگن SHOGUN کہلاتا تھا - یوری ٹومو YORITOMO جو ایک قابل جرنیل تھا سب سے پہلا شوگن تھا - آخری شوگن ۱۸۶۸ء میں سلطنت سے دستکش ہوگیا - شوگنوں کے عہد میں جاپان خانہ جنگیوں کا گھر بنا ہوا تھا بڑے بڑے خاندانوں کے جھگڑے لڑائیوں سے طے ہوتے تھے - سپاہی لوگ مضبوط قلعوں میں رہتے تھے - وہ ساموارائی کہلاتے تھے اور کسی غنیم کے حملہ آور ہونے کے وقت مالکان اراضی کا فرض تھا کہ وہ خطرہ کے انسداد کے لئے اُمرا کو مدد دیں -

جب چین کے منگول بادشاہ کبلا خاں KABLA KHAN نے آرین اور چینیوں کا ایک جرّار لشکر جاپان کی تسخیر کو بھیجا تو سارا جاپان اپنے پاک ملک کو غنیم سے بچانے کے لئے سر بکف تیار ہوگیا - حسن اتفاق سے ساحل جاپان کے قریب یہ عظیم بیڑہ طوفان سے تباہ ہوگیا - اور اُسدن سے آج تک کسی اور دشمن نے جاپان پر فوج کشی نہیں کی -

مارکو پولو MORCO POLO مشہور سیاح پہلا آدمی تھا جس نے جاپان کا تعارف مغربی دنیا سے کرایا - وہ اپنے سفرنامہ میں اس ملک کا نام سپنگو CIPANGO بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ سمندر کے وسط میں چین کے مشرق کی طرف ایک جزیرہ ہے - اسکے باشندے گوری رنگت کے ہیں اور اُنکا مذہب بت پرستی ہے وہ کسی کے دست نگر نہیں ہیں - کیونکہ سونا خود اُنکے ملک میں دستیاب ہوتا ہے

اُن دنوں جب مختلف قومیں نئے ملکوں کی تلاش میں مصروف تھیں۔ ہر جگہ بحری ڈاکو لوٹ مار کر رہے تھے۔ جاپان بھی اس دلیرانہ بیباکی میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ اور ان کے قزاقی جہاز۔ ہندوستان۔ سیام۔ اور اغلباً میکسکو تک دھاوا کرتے رہتے۔ کولمبس کی وفات سے تھوڑی مدت بعد پرتگالیوں نے ہندوستان کا وہ مشرقی راستہ دریافت کر لیا جسکے لئے کولمبس مغرب کی طرف بے سود کوشش کرتا رہا۔ وہ ہند سے چین اور آخرکار جاپان میں جا پہونچے۔ اسکے بعد جاپان مغربی ممالک کے واسطے کئی ایک دلچسپیوں کا مرکز بن گیا۔

گذشتہ صدی کے وسط میں جاپان میں ایک حیرت خیز انقلاب رونما ہوا۔ وہ جاپان جو اتبک دوسرے ممالک کی نظروں سے اوجھل اپنی زراعت و تجارت اور مصنوعات کی ترقی میں غرق تھا۔ اب بیرونی طاقتوں سے صلحنامے تحریر کر رہا تھا۔ یوکوہاما کا بندرگاہ تمام ممالک کی بحری تجارت کے واسطے کھول دیا گیا۔ شوگن کو معہ اپنے دقیانوسی خیالات کے رخصت ہونا پڑا۔ اور دوبارہ میکاڈو (جو ابھی تک زریں محلوں میں خواب ہستی کے مزے لوٹ رہا تھا) ملک کا حقیقی حکمراں اور بادشاہ مقرر ہوا۔

پچھلے ستر سال کی ترقی ایک محیر العقول سرگذشت ہے۔ مغرب سے ملتے ہی جاپان نے اپنا صدیوں کا پرانا دستور یک قلم موقوف کر دیا۔ ازمنہ وسطی کی جہالت کو چھوڑکر جونہی جاپان نے موجودہ تمدن و تہذیب کے میدان میں قدم رکھا۔ تو اُسکی معاشرتی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ تشنگان علم۔ امریکہ اور یورپ میں اپنی پیاس بجھانے کو دوڑے۔ سڑکیں اور پل بنائے گئے۔ ریل۔ تاربرقی۔ ٹیلیفون کا ملک میں جال بچھا دیا گیا۔ بنک۔ کارخانے۔ سوداگروں کی کوٹھیاں اور تجارت کی منڈیاں بیش از بیش ظہور میں آنے لگیں۔ قانونی عدالتیں قائم کی گئیں اور ۱۸۸۹ء میں ایک قانون کے رو سے مجلس نمایندگان ملک ظہور میں آئی۔ تعلیم جدید کا عام چرچا ہو گیا۔ آزادی نسواں کی لہر ملک بھر میں دوڑ گئی۔ مغربی عادات اور لباس نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ایک عظیم الشان بحری اور برّی طاقت نے ملک کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔

سنہ ۱۸۹۴ و ۱۸۹۵ء میں چینیوں کے ساتھ جو محاربہ ہوا۔ چھ ماہ جاری رہا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جزیرہ فارموسا چینیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اور دنیا کو پتہ لگ گیا کہ مشرق بعید میں ایک ایسی طاقت کا ظہور ہوا ہے جو اسکی آیندہ قسمت کی مالک ہوگی۔

یہ قیاس درست نکلا۔ کیونکہ جو شاندار کامیابی جاپان نے جنگ روس و جاپان میں حاصل کی اُسکی چمک نے یورپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ روس کو شکست فاش ہوئی۔ مکڈن MUKDEN اور پورٹ آرتھر PORT ARTHUR پر جاپانیوں نے عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ آخر کار پریزیڈنٹ روزولٹ ROSE VELT نے اگست سنہ ۱۹۰۵ء میں متخاصمین کے مابین صلح کرا دی۔ اس لڑائی سے کوریا جاپان کے قبضہ میں آ گیا۔ جہاں کی کل حکومت جاپانیوں نے اپنے ذمہ لے لی۔

اس لڑائی کے نتیجہ نے مغرب کی آنکھیں کھولدیں۔ جاپان کا چرچا گھر گھر ہونے لگا۔ اور ایک نیا خوف اُنکے دلوں کو مرعوب کرنے لگا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جاپان کو جسقدر ناز اپنی کامرانی پر ہو تھوڑا ہے۔ ہر جاپانی لڑکے کو شروع سے سکھایا جاتا ہے کہ اُسکی زندگی کا سب سے شاندار مقصد اپنے بادشاہ اور ملک کے لئے جان قربان کر دینا ہے اُسکا عزم راسخ ہوتا ہے اور اُسکا ارادہ مستحکم۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک جاپان نے کسی لڑائی میں پیٹھ نہیں دکھلائی۔

جاپان کا نیا مفتوح ملک کوریا بھی بہت عجیب اور پرانی سرزمین ہے۔ ناگاسکی NAGASKI سے جہاز میں بیٹھکر ہم بہ آسانی وہاں پہونچ سکتے ہیں اور اسکی خوشگوار بہار اور پر لطف خزاں کا مزہ اُٹھا سکتے ہیں۔ بندرگاہ چیمولیو CHIMULIO سے اسکے دارالخلافہ سیول SEUL تک ریل جاتی ہے جسکے چاروں طرف دیوار ہی جس میں آٹھ دروازے ہیں۔ کئی ایک خوشنما عمارتیں ہیں۔ سنگ مرمر کا ایک مندر ہے۔ معبد اور مقبرے بکثرت ہیں۔ سب سے زیادہ حسرتناک منظر شہزادی کا وسیع محل ہے۔ جو اب ویران پڑا ہے کیونکہ جنگ کے دوران میں شہزادی ماری گئی تھی۔ کوریا کے باشندے غریب اور بزدل ہیں اور بہت مدت تک اپنے طاقتور ہمسایوں کو خراج دیتے رہے ہیں تاکہ وہ انھیں تنگ

نہ کریں۔ کوریا میں زرخیز وادیاں ہیں اور ہر قسم کا غلہ پیدا ہوتا ہے۔ جنگلات بہت ہیں اور گمان غالب ہے کہ معدنیات کی بھی کمی نہیں۔ لیکن ملک کے ذرائع ترقی ابھی تک پستی کی حالت میں ہیں۔

جاپان والے اپنے ملک پر بجا طور پر نازاں ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے سمندر کے نظارے خوشنما جھیلیں۔ پاکیزہ اور سبز مرغزار۔ موسم بہار کے خنداں پھول صحت بخش آب وہوا۔ غرض اس خوش قسمت جزیرہ کو صانع ازل نے بہت سی خوبیوں سے مالامال کر رکھا ہے۔ تعطیل کے دنوں میں تمام لوگ باغات میں چلے جاتے ہیں۔ اور آڑو۔ سیب۔ آلوچہ اور خوبانی کے روح پرور نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پھولوں کی اس ملک میں وہ کثرت ہے کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔ جاپان کیا ہے۔ پرستان ہے۔ جسکی ادنیٰ سی جھلک ہمکو ان نازک چلمنوں کے دلآویز۔ ہلکی اور لطیف رنگ آمیزیوں میں نظر آتی ہے۔ جو جاپان سے تحفتہً ہمارے یہاں آتی ہیں۔ یا ان پنکھوں کی صناعی میں جو پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے نازک جاپانی ہاتھوں نے حسینوں کے شغل کے واسطے تیار کئے ہیں۔ اور یہ صناعی۔ یہ دلفریبی۔ یہ جدت آفرینی جاپانیوں کی انشا میں کیوں نہ ہو۔ جب وہ اپنے نقش و نگار اور بیل بوٹوں کو بناتے یا کاڑھتے وقت فطرت کی گلکاری پیش نظر رکھ کر اُس سے براہِ راست سبق لیتے ہیں۔

ممکن ہے کہ جاپان جیسے خوبصورت پہاڑ۔ سُریلی اور رقصاں آبشاریں۔ زرخیز وادیاں۔ انکیں جگر کاٹنے والے چمکتے ہوئے دریا۔ دامن کوہ کے دلفریب مناظر۔ ساحل رود بار کی پُر لطف کیفیتیں کسی اور جگہ بھی مل سکیں۔ لیکن وہاں متبرک فیوجی یاما FUJI YAMA کی پُر اسرار شان و شوکت نظر نہ آسکے گی۔ یہ ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جسے جاپانی نہایت عزت و حرمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور جسے وہاں کے صناعوں کی نازک خیالی نے بار ہا صفحہ کاغذ پر جلوہ گر کیا ہے۔ یہ پہاڑ دادی سے ۳ میل اونچا ہے۔ اور نہایت شوکت و جلال سے اپنا پُر غرور سر بلند کئے ہوئے ہے۔ اسکا پیندا قریب ستر میل کے ہے۔ یہ سمندر کے نزدیک اور دارالخلافہ سلطنت ٹوکیو سے تھوڑے فاصلہ پر ہے۔ نو وارد سیاح کی نظر میں۔

اسکی چوٹی خصوصاً جب وہ برف سے ڈھکی ہوتی ہے - جاپان کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے - یہ چوٹی دشوار گذار ہے اوپر چڑھتے چڑھتے آدمی تھک جاتا ہے - لیکن چوٹی پر پہونچ کر راستے کی سب کلفت دور ہوجاتی ہے - کیونکہ جو نظارہ اوپر سے دکھائی دیتا ہے وہ مست کردینے والا ہوتا ہے - پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں - شاداب وادیاں - اور نقرئی جھیلیں عجب بہار دکھاتی ہیں - جوں جوں اوپر چڑھتے جاتے ہیں درختوں اور مرغزاروں کی حالت تبدیل ہوتی جاتی ہے - پہاڑ کی چوٹی پر یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں - اس سے ذرا نیچے چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں - اس سے نیچے طبقہ میں چیل کے جنگل اپنے گھنے سایہ دار درختوں سے نظر کو لبھاتے ہیں اور دامن کوہسار کے قریب ہرے ہرے مخملی سبزے کے مرغزار اور لوبیا - مٹر - جو - چاول اور گندم کے کھیت اپنی اپنی بہاریں دکھاتے ہیں -

فیوجی یاما کی چوٹی سے ہمکو دوسرے آتش فشاں پہاڑ آساما یاما ASAMA YAMA کی چوٹی نظر آتی ہے - اگرچہ جاپان کے بہت سے آتش فشاں پہاڑ اب سرد ہوچکے ہیں تاہم ان دونوں پہاڑوں کے آتشیں دہانے سے اب بھی بھاپ کی ایک تیز رو نکلتی رہتی ہے جو اکثر اوقات زلزلوں کی صورت میں رونما ہوتی ہے اور جس سے بعض دفعہ بہت نقصان ہوتا ہے -

جاپان میں کئی بڑے بڑے شہر ہیں - ٹوکیو TOKYO دارالخلافہ سلطنت نپن NIPPON یا ہونشیو HONSHIO جزیرہ پر آباد ہے - اسمیں بیس لاکھ نفوس بستے ہیں شوگنوں کے محلات اس شہر میں جابجا نظر آتے ہیں - شاہی محلات بھی جنکو شیش محل کہنا زیادہ موزوں ہوگا یہیں واقع ہیں - نومبر میں ہزارہا لوگ گل داؤدی کی سالانہ نمائش کے موقع پر جمع ہوتے ہیں - یہ پھول بہ نسبت دیسی گل داؤدی کے بہت بڑے اور زیادہ خوشنما ہوتے ہیں - شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے رکشا گاڑی استعمال ہوتی ہے - جسکو قلی نہایت پھرتی سے دوڑاتے پھرتے ہیں - ہندوستان میں بھی شملہ وغیرہ میں رکشا کی سواری صنف نازک کی مرغوب خاطر ہے - ٹوکیو کا بندرگاہ یوکوہاما ہے - جہاں جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں - یہاں پہلے شوگن یوری ٹومو YORITOMO کا مقبرہ ہے

اور اس سے ذرا دور بودھ کا بت ہے جو پچاس فٹ اونچا ہے۔ اور جسکے اندر ایک نہایت خوبصورت اور مرصع مندر واقع ہے۔ جاپانی ضرب المثل ہے۔ "جسنے نکو NIKKO نہیں دیکھا وہ لفظ عظیم الشان کے معنی نہیں جانتا" نکو نہایت ہی خوشنما شہر ہے۔ نغمہ آبشار۔ سورج کی شعاعوں کا رقص۔ تختہ ہائے سبزہ زار۔ اور پہاڑی مناظر کے علاوہ بدھ کے حیرت انگیز مندر اور شوگن کے مقابر اس شہر کے زیورات ہیں۔ جزیرہ کیوشیو KIOSHU میں مشہور بندرگاہ ناگاساکی واقع ہے جسے جاپان اور مغربی تہذیب کے توصل کی باہمی کڑی سمجھنا چاہئے۔ یہی وہ جزیرہ ہے جہاں پہلے پہل پرتگالی اُترے تھے۔ جب سے غیر ممالک کے ساتھ تجارت شروع ہوئی ہے۔ کوبے KOBE نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ پہلے یہ ماہی گیروں کے جھونپڑوں کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اب سارے ملک کی اندرونی تجارت کی منڈی ہے۔ جہاں بیرونی طاقتوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ اوساکا OSAKA بھی کوبے کی طرح سمندر کے قریب واقع ہے۔ اور اسکے خوبصورت معبد اور بازار مشہور ہیں۔ اوساکا کے پاس سے ایک دریا گذرتا ہے جو جاپان کی سب سے بڑی جھیل بیوا BEWA میں جا گرتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں چاندنی رات کو لوگ دن بھر کے کاروبار سے فارغ ہوکر چھوٹے چھوٹے خوش شکل۔ عروس کی مانند آراستہ بجروں پر صاف سطح و شفاف آب پر لطف زندگی اُٹھاتے نظر آتے ہیں۔ یہ سماں بلا کا دلچسپ ہوتا ہے۔ کشتیوں کی لالٹینوں کی رنگین شعاعیں دریا کے نقرئی پانی پر رقص کرتی ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ موسیقی کے دلآویز نغمے۔ حسینان جاپان کے باریک۔ سُریلے اور لطیف قہقہے۔ ایک ہندوستانی کے دلمیں کشمیر کی مشہور جھیل ڈل کی روح پرور یاد تازہ کرتے ہیں۔ اوساکا سے ٹرین کیوٹو جاتی ہے جو جاپان کا صدر مقام تھا۔ اور جہاں کی پرانی عمارات اور مکاڈو کے وسیع محلات سیّاح کی دلچسپی کو جذب کر لیتی ہیں۔

اگرچہ جاپان کی شہری آبادی روز افزوں ترقی پر ہے تاہم ہندوستان کی طرح زیادہ لوگ کاشتکار اور زراعت پیشہ ہیں۔ کئی ہزار سمندروں۔ جھیلوں اور دریاؤں کے کنارے ماہی گیری کرکے اپنی اوقات خوشحالی سے بسر کرتے ہیں۔ اگرچہ تہذیب مغرب کے تحفے۔

مشینیں۔کلیں۔ملک میں عام ہوتی جاتی ہیں۔تاہم جاپان کی حقیقی شہرت اور عظمت کا راز
اُسکی دستکاریوں میں مضمر ہے جنھوں نے ممالک غیر کے لوگوں کو اپنا وارفتہ بنا لیا ہے
ہر جاپانی مرد اور عورت مادرزاد آرٹسٹ ہے۔چائے کی کاشت۔اور ریشم سازی بھی مدت سے
ملک میں رائج ہے۔چینی کے برتن۔جو کیولس مٹی سے بنائے جاتے ہیں۔
ساری دنیا میں مشہور ہیں۔قالین۔ٹوکریاں۔لکڑی کا جالی دار کام۔خوشنما پنکھے۔اور
دلآویز فانوس اور کھلونے اور ہزار ہا قسم کی مفید اور نظر نواز اشیا جاپانی صناع دنیا بھر میں
مقبول کرا چکے ہیں۔افسوس ہے کہ جو اشیا یا مصنوعات جاپان ہمارے ملک میں آکر بکتی ہیں
وہ یا تو خود ہندوستان ہی میں سستے داموں نقلی طور پر بنائی جاتی ہیں۔یا جاپان کی تجارت
کے ذلیل کرتے ہیں۔وہاں کی قیمتی اور اصلی اشیا نہ صرف خوبصورتی بلکہ پائداری میں بھی اپنا
ثانی نہیں رکھتیں۔

اگرچہ جاپانیوں کا لباس بڑی حد تک مغربی طرز کا ہو گیا ہے۔اور دربار محکمہ بحری۔
و فوج میں بالکل یورپی لباس مروج ہے تاہم ابھی تک ڈریسنگ گون
کی شکل کا خوبصورت مکونو MIKANO ملکی لباس شمار کیا جاتا ہے۔جو امرا کے لئے تو
ساٹن یا زردوز کپڑوں سے تیار کیا جاتا ہے۔اور غربا کے لئے گاڑھے گزی سے۔

جاپانی پاپوش دنیا سے نرالی ہے۔ایک موٹی سفید جراب جوتے کے ساتھ پہنی جاتی ہے
جوتہ مکان میں داخل ہوتے وقت اُتار لیا جاتا ہے تاکہ چٹائیوں کو (جو کرسیوں کا کام دیتی ہیں)
میلا نہ کرے۔عام مکانات کا فرنیچر بہت سادہ ہوتا ہے۔یا بالکل نہیں ہوتا۔اکثر اوقات
مکان کا زیادہ حصہ سخت کاغذ یا لکڑی کا بنا ہوتا ہے۔بعض اوقات کاغذ کے چھاتے
اور برساتی کوٹ بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔جاپان میں چارپائی نہیں ہوتی۔ایک
موٹی توشک فرش پر بچھائی جاتی ہے جس پر لکڑی کے تکئے ہوتے ہیں۔صبح کے وقت یہ تہ کر کے
علیحدہ رکھدی جاتی ہے۔جاپانی ہر چیز کو نہایت مصفا طور پر سلیقے سے سجا کر رکھتے ہیں اور
صفائی کے دلدادہ ہیں۔

جاپانی بچے غالباً تمام دنیا میں سب سے زیادہ خوش طبع ہوتے ہیں۔اُنکے والدین اُنسے

بہت محبت کرتے ہیں۔ اور اوائل عمر سے اُنکو خوش اخلاقی حب وطن اور حفظ نفس کی تعلیم دیجاتی ہے۔ کُند ذہن۔ کاہل الوجود۔ یا چڑچڑے بچے شاذ و نادر ہی جاپان میں آپ کو نظر آئیں گے۔ اُنکی پڑھائی اور کھیل کے اوقات مقرر ہیں۔ اُنکے کھلونے بالکل وہاں کے باشندوں کا نقشہ ہیں۔ لڑکیوں کے واسطے گُڑیوں کے میلے رچائے جاتے ہیں۔ اور لڑکوں کے لئے خاص تیوہار منائے جاتے ہیں۔ آغاز بہار میں "یاد رفتگان" کی تقریب تمام ملک میں منائی جاتی ہے (جاپانی لوگ مُردوں کا خاص احترام کرتے ہیں) اس میلہ کا عجیب و غریب اختتام ناگاساکی پر ہوتا ہے جو خالی از دلچسپی نہیں۔ نصف شب کے بعد ہزارہا تنکوں کے جہاز جن میں پھل اور نقدی کے چڑھاوے ہوتے ہیں اور جن میں چھوٹے چھوٹے رنگین فانوس رکھے ہوتے ہیں۔ خلیج کی سطح پر چھوڑے جاتے ہیں۔ جب ہوا کے جھونکوں سے جہاز کو آگ لگتی ہے تو جاپانی عقیدہ کے مطابق روح انسانی پھر عدم آباد میں داخل ہو جاتی ہے۔

جاپانیوں کے معبد اور مندر بہت بارونق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دیوتاؤں کی پرستش کے اتنے شائق ہیں کہ زیارات کے لئے دور دراز سفر اختیار کرتے ہیں۔ فیوجی یاما کے متبرک پہاڑ کے یاتریوں کا امتیازی لباس سفید کمونو اور بڑے تنکے کی ٹوپی ہے۔

سیّاحوں کی رائے ہے کہ جاپان دنیا پر فردوس کا نقشہ ہے۔ اس خوبصورت اور دلآویز ملک نے (جہاں سوائے شعریت۔ داستانہائے حسن و عشق کے اور کچھ نہ ہونا چاہیئے) تھوڑے عرصہ میں وہ معاشرتی۔ تمدّنی اور سیاسی ترقی کی ہے کہ ایک دنیا جاپان کا نام عزّت سے لیتی ہے۔ اور جاپانی آج متمدن اقوام کی صف اولیں میں جگہ پاتے ہیں۔

نذیر احمد خاں

بی۔ اس، سی، ایل ایل بی،



سلیمانی زبان

ترکی کردستان کا جنوبی حصہ سلیمانیہ کے نام سے مشہور ہے - یہان جو زبان بولی جاتی ہے وہ مختلف زبانون خاصکر عربی - ترکستانی اور فارسی کے اختلاط باہمی سے پیدا ہوئی ہے - رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل کے ایک نامہ نگار مسٹر ای - بی - سون ( ) اس سرزمین مین کئی ماہ تک رہ چکے ہین اور زبان کو سیکھا ہے - اس مضمون مین جو کچھ لکھا جا رہا ہے زیادہ تر انھین کے فیض عام کا نتیجہ ہے -

سلیمانی زبان اور اُسکے قواعد کُردی زبان سے بہت کچھ مشابہ ہین جو کردستان کے اور حصون مین بولی جاتی ہے -

شوان - قاراداغ - بانا - سردشت (جو سلیمانیہ کے سرحدی حصے ہین) کے کردیون کی زبان اس زبان سے مختلف ہے -

ترکی الفاظ کثرت سے اس زبان مین ملینگے - کچھ تو اس وجہ سے کہ ترکستان یہان سے قریب ہے اور کچھ اسلئے کہ ایک زمانہ گذرا ترکون کے ایک گروہ نے کرکوک اور آلتون کیوپرو کے اضلاع مین جو سلیمانیہ کے مغرب مین واقع ہین بود و باش اختیار کرلی اور وہان کے اصلی باشندون سے مل جل گئے -

سلیمانیہ ملک کا آخری جنوبی حصہ ہے جہان خاص کردی زبان بولی جاتی ہے - اس سے آگے جنوب یا مشرق کی طرف بڑھئے تو قدیم فارسی اور رائی اور گورانی وغیرہ سننے مین آئیگی - چونکہ دریاے سروان اور اورامانی و جوانرو کے پہاڑ درمیان مین حائل ہین اسلئے قدرتی طور پر یہ زبانین سلیمانی سے مخلوط نہ ہوسکین -

سلیمانیہ کو ۱۷۸۸ء مین سلیمان بابن نے آباد کیا تھا جو فرقہ بابن سے تعلق رکھتا تھا

باہنی اب بھی کُردستان کے بعض حصون مین خاصکر اربِل کے قریب موجود ہین۔ اِنکا سلسلۂ نسب ہکاری قوم سے مِلا ہوا ہے جو کسی زمانے مین سب سے زبردست کُردی قوم تصور کی جاتی تھی۔

اِس طرح مُکری زبان جسکا ذکر اوپر آچکا ہے جنوب مین شہرزور تک پھیل گئی جہان پہلے کسانون کی بستی تھی۔ اور اورمانی بولی جاتی تھی۔

اب زیادہ تر وہ سُنیون کا فرقہ ہے جسکی زبان خاص کُردی ہے۔ شیعون کی زبان کوری سے ملتی جلتی ہے۔ مُکری سوج بلاق کے گرد و نواح اور مشرق مین رائج ہے۔ جہان ترکون کی آبادی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سلیمانیون کو بطلس۔ ارض روم اور بایزید کے رہنے والون سے گفتگو کرنے مین زیادہ دقت نہین مگر اورمانی اور گورانی سمجھنا اُنکے لئے بہت مشکل ہے۔ حالانکہ اُنکے جوار ہی مین بولی جاتی ہین۔

غیر صحیح تلفظ کے باعث جو سُقم عموماً زبان مین پیدا ہو جاتا ہے وہ سلیمانی زبان مین بھی موجود ہے لیکن جیسا کہ یہان کے باشندے خود کہتے ہین اسکی وجہ وہ یہودی اور کلدانی ہین جنھون نے اسلام قبول کر کے کُردی زبان اختیار کرلی اور بے شمار عربی اور شامی الفاظ اس زبان مین شامل کر لئے۔

سلیمانی محاورات اور قواعد کی تعیین ایک حد تک شاعرون نے کردی ہے۔ نثر تو اس زبان مین بہت کم ہے نظمین البتہ کافی تعداد مین ہین۔

اس زبان کا تلفظ بہت مشکل ہے روزمرہ کی بول چال نے الفاظ کی ہیئت بھی بدل دی ہے۔ اکثر مقام پر حرف (د) گر گیا ہے۔ مثلاً

مایَن	دراصل	مادیَن	تھا	بمعنے	گھوڑی
لےیا	"	لیَدا	"	"	مارو
لیَام	"	ایدام	"	"	مین دیتا ہون
کام	"	کدام	"	"	کوَن
جوُ	"	جوُد	"	"	یہودی

حرف (د) کبھی کبھی لام سے بھی بدل جاتا ہے

مثلاً "کلی لکا" دراصل "کلید کا" تھا بمعنے کنجی فارسی لفظ کلید سے نکلا ہے۔

حرف (ب) جیساکہ اور زبانون مین بھی قاعدہ ہے عموماً "و" سے بدل جاتی ہے۔

جیسے قُرواق فی الحقیقت قرباق تھا بمعنے مینڈک

عروا " عربا " " عرب

دووال " دُمبل " " پھوڑا

مگر "وفر" (بمعنے برف) مین "ب" "و" سے نہین بدلی ہے بلکہ ژند کی فارسی قائم رکھی گئی ہے جو "وفرا" ہے۔

"ست" کا ہے گا ہے۔ مبدل بہ "ز" ہوجاتی ہے۔

مثلاً "دست" سے "دز" ہوگیا۔

"ہ" جو فارسی مین اکثر محذوف ہوگئی ہے اس زبان مین ابھی تک موجود ہے۔

مثلاً ہنجمن فارسی مین انجمن ہے ژند مین ہنجمن ہی تھا

ہنگوین " " انگبین ہوگیا ہے بمعنے شہد

ہَور " " اَبر ہوگیا ہے " بادل

ہُشتر " " اُشتر " " اونٹ

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سلیمانی زبان مین "حائے حُطّی" نہین ہے۔ جہان جہان اہلِ فارس نے "س" کو "ہ" سے بدل دیا ہے۔ اس زبان نے قائم رکھا ہے۔

مثلاً ماسی جو ژند مین مَسیا تھا اب فارسی مین ماہی ہوگیا

یا آسن فارسی مین آہن ہوگیا اور سنسکرت مین اَیاس ہے۔

فارسی یا عربی مین اکثر الفاظ جو "خ" سے شروع ہوتے ہین اس زبان نے کسیقدر اُنکی صورت مین تغیر پیدا کردیا ہے اور "خ" کی جگہ "ہ" یا "ک" ہوگیا ہے۔

مثلاً "کر" فارسی مین خر ہے یا "ہشک" فارسی مین "خشک" ہے۔

یا مثلاً "ہویر" عربی مین "خمیر" ہے۔

اب کچھ گرامر پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ پہلے یہ بتلا دینا اچھا ہوگا کہ اسم کے آخر مین "آن" زائد کر دینے سے جمع بنجاتی ہے۔ جیسے "پند" سے "پندان" معنے خیالات۔ مگر جس لفظ کے آخر مین "ا" "ی" یا "و" ہو تو اسمین "آک" یا صرف "ک" بڑھا کر "آن" شامل کرتے ہین تاکہ تلفظ صاف ہو سکے۔ مثلاً گورا سے گوراکان ہو گیا۔

"یائے وحدت" کے بجائے اس زبان مین "ک" ہوتا ہے اور حرف ماقبل کا کسرہ ہوتا ہے۔

فارسی مین بولتے ہین "قاطرے خریدم" یعنی مین نے ایک خچر خریدا۔ سلیمانی زبان مین کہینگے "استرکم کرّی" "م" بمعنے "مین" یا مثلاً پیاوِک ہات۔ بمعنے ایک آدمی آیا لیکن اگر کسی اسم کے آخر مین "کہ" ہو تو وہ اِسم مخصوص ہو جاتا ہے۔ مثلاً پیاوکہ بمعنے وہ آدمی۔

علامت اِضافت "ی" ہوتی ہے جو مضاف و مضاف الیہ کے درمیان آتی ہے مثلاً "منالی کچم" معنے میری لڑکی کا بچّہ (منال = بچّہ۔ "ی" علامت اضافت۔ کچ = لڑکی۔ م = میرا)

یا مثلاً "روجی ہوین" معنی گرمی کا دن (روج = دن۔ "ی" علامت اِضافت ہوین = گرمی) یہ خیال رہے کہ مضاف ہمیشہ پہلے ہوتا ہے اور مضاف الیہ بعد کو جیسا کہ فارسی زبان کا بھی قاعدہ ہے۔

جار و مجرور کا قاعدہ اس زبان مین عجیب ہے۔ ہر مجرور کے آخر مین "دا" ضرور ہوتا مثلاً "ہاتم لدہ دا" بمعنے مین اس دہات سے آیا "ل" لفتحہ حرف جار ہے بمعنے سے یا تک۔

یا مثلاً "راکردوہ بُوشاردا" = وہ شہر کو بھاگ گیا۔ "بُو" حرف جار ہے = کو یا تک۔

اگر کسی اسم کے آخر مین لاحقہ "اولا" یا "ک" یا "کہ" ہو تو وہ علامت تصغیر جیسے میشولا = چھوٹی مکھی میش = مکھی۔

یا " میرولا = چھوٹی چیونٹی - میورا = چیونٹی -

اب اسکے بعد اسماء کی ایک فہرست دیجاتی ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ کون لفظ دوسری زبان سے لیا گیا ہے اور کون لفظ خاص کردی یا سلیمانی ہے -

سلیمانی الفاظ	معنے	کیفیت
خوشک	بہن	فارسی مین خواہر ہے "ہر" "شں" سے بدل گیا "ک" علامتِ تصغیر ہے -
با	ہوا	فارسی لفظ باد ہے "د" محذوف ہوکر "با" ہوگیا -
مان گشو	شعاعِ مہتاب	یہ کردی لفظ ہے -
باران	بارش	فارسی مین بھی بجنسہ یہی لفظ ہے -
تیر	اولا	فارسی مین تگرگ ہے سلیمانی زبان "گ" بھی اکثر گر جاتا ہے -
آگر	آگ	سنسکرت مین اگنی ہے دیگر کردی زبانون مین بھی آگر ہی مستعمل ہے -
آگردان	آتش دان	"دان" فارسی لاحقہ ہے -
پلیتہ	بتی	فارسی مین فتیلہ ہے مگر قدیم فارسی پلیتہ ہی ہے - عربی مین فتیل ہے -
منال	بچہ	کردی لفظ ہے - دراصل مندال تھا -
کچ	لڑکی	ترکی زبان مین " قز" کہتے ہین -
ژن	عورت	فارسی مین زن ہے -
مرد	مرد	فارسی لفظ بھی یہی ہے - مگر ہی زبان مین اسکے معنے شوہر کے ہین -
ہتاو	سورج	فارسی مین آفتاب ہے -
دم	منھ	شمالی کردستان مین "دن" کہتے ہین -
سردل	دل	سنسکرت مین "ہردے" ہے -
دار	درخت	ژند مین "دارو" تھا -
کوچک	چمچہ	ترکی مین قاشق ہے -

ہوتا ہے کہ کبیر صاحب بچپن ہی سے رامانند جی کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے اصول کے اتنے پکے تھے کہ ماں باپ کو بھی اُن پر سخت حیرت ہوتی تھی۔ باپ اکثر اُن کو کپڑا بیچنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ کپڑے کا تھان فروخت کر رہے تھے کہ ایک سادھو نے آکر سوال کیا کہ مجھے کپڑا دو۔ کبیر صاحب نے آدھا تھان دینا چاہا مگر اُس نے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ یہ پورا ہوگا۔ آپ نے اُسے سارا تھان دیدیا۔ مگر دل مین ڈرے کہ باپ ناراض ہونگے اور اسی ڈر کے مارے کئی دن گھر سے نکلے رہے۔ آخر کار جب باپ کو پتہ چلا کہ کبیر اس خیال سے گھر نہین آتا تو اُنکو ڈھونڈھکر گھر لائے اور اُنکے اس کام پر خوشی کا اظہار کیا۔ کبیر صاحب کی شاعری پر مفصل تبصرہ کی تو اس مختصر مضمون مین گنجائش نہین مگر اتنا کہدینا ضروری ہے کہ کبیر صاحب کی نظمین حُسن کی تلاش اور امن و راحت کے تجسّس کی تصویرین ہین بعض سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن کا مصنف روح القدس سے فیض پاتا ہے اور اسی سے ہمکلام ہے۔ بعض روحانی جوش اور وجد کا آئینہ ہین۔ ان کے علاوہ ایسے بھی ہین جنمین حسن کا جلال برس رہا ہے اور جن مین محبت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ کبیر صاحب کی اِنشا ایک ایسی روح کی درد بھری التجا ہے، جو خدا سے لَو لگائے بیٹھی ہو۔ اُن کی نظمین روحانیت سے لبریز ہین۔ اُنکے گیت حسن اور زندگی کے برکات کی طرف دُنیا والون کی راہنمائی کرتے ہین۔ غرضکہ کبیر صاحب کی جذباتی شاعری اپنے حسن و شیرینی مین مختلف الانواع ہے۔ اُنکا جذبۂ عشق "جو نصف فرشتہ ہے اور نصف پرند" روحانیت کے شفاف آسمان پر اُڑتا ہے۔ اور زمین و آسمان، نیچر اور خدا، دنیا اور دنیا سے اس پار کا نظارہ حسن دیکھتا ہے۔ اُنکی نظمین کیا ہین بہ نہایت سادہ انسانی جذبات معصوموں کے سے پاک خیالات سادہ ترین معاشرتی غم و مسرت اور خدا کی طرف روح کی خالص اور سادہ ترین آرزوئین ہین۔

کبیر صاحب کی موت کا افسانہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ کہتے ہین کہ جب وہ مرے تو اُن کی لاش کے متعلق ہندو مسلمانون مین جھگڑا پڑا۔ ہندو کہتے تھے کہ ہم انھین جلائین گے اور مسلمان کہتے تھے کہ ہم انھین دفن کرین گے۔ آخر جب چادر اُٹھائی گئی لاش غائب تھی۔ صرف چند پھول پڑے ہوئے تھے جو فریقین نے آپس مین تقسیم کر لئے۔

ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور نے اُن کی نظمون کا انگریزی مین ترجمہ کیا ہے - مین اُنھین اُردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کرکے ہدیۂ ناظرین کرتا ہون "گر قبول اُفتد زہے عز و شرف"

(۱)

مین اُسکی بانسری کے دلخوش کُن نغمے سُنتا ہون مگر برداشت نہین کر سکتا، پھول کھلتے ہین اگرچہ موسم بہار نہین، اور شہد کی مکھی کو بھی دعوت کا پیغام ملتا ہے، آسمان گونجتا ہے - بجلی کوندتی ہے اور میرے دلمین لہرون کا تلاطم اُٹھتا ہے، مینھ برستا ہے اور میرا دل اپنے آقا کی یاد مین محو ہو جاتا ہے، جہان دنیا بڑھتی اور گھٹتی ہے، جہان چھپے ہوئے جھنڈے ہوا مین لہراتے ہین وہان میرا دل بھی پہونچ جاتا ہے - کبیر میرا دل مَر رہا ہے مگر اُسمین جان ہے،

(۲)

اے میرے دل! تو نے دیارِ محبت کے رازون کو نہ پایا - تم جہالت مین آئے اور جہالت مین چلے گئے۔
اے میرے دوست! تمنے اس زندگی کے ساتھ کیا کیا، تمنے اپنے سر پر پتھرون کے بھاری بوجھ کو اُٹھا لیا ہے، مگر کیا تم جانتے ہو کہ کون اسے ہلکا کریگا -
تمہارا دوست دریا کے دوسرے کنارے پر تمھارا منتظر ہے - مگر تم خیال نہین کرتے کہ اُس تک کس طرح پہونچ سکوگے - کشتی ٹوٹ گئی ہے - لیکن پھر بھی تم کنارے پر بیٹھے ہوئے ہو، اور لہرین تمھین برباد کر رہی ہین، تم اکیلے ہو، تمھارا کوئی مونس نہین، تمھین اپنے اعمال کی سزا بُھگتنی پڑے گی -
کبیر صرف اُسکی مدد ڈھونڈھ جو تجھے ہمیشہ مدد دینے کے لئے تیار رہے -

(۳)

جب مین اپنے محبوب سے جدا ہوتا ہون تو میرا دل غم سے بھرا ہوتا ہے -
مجھے دن کو چین نہین آتا - مجھے رات کو نیند نہین آتی - آہ! مین اپنا غم کسکے سامنے بیان کرون
رات اندھیری ہے، اور وقت گذر رہا ہے - کیونکہ میرا آقا موجود نہین ہے -
مین اُٹھ بیٹھتا ہون اور خوف سے کانپنے لگ جاتا ہون -
اے میرے دوست سُن! یہان سوائے محبوب دلنواز کے اور کوئی چیز تسلی دینے والی نہین -

افتخار الرسول بدر

یونان کا ایک گمنام حکیم

حکیم اکلیوبول جزیرۂ اڈواس کے مشہور شہر لندہ مین پیدا ہوا، بچپن ہی سے طبیعت حکمت کی طرف مائل تھی، چنانچہ تھوڑی ہی سے عمر مین یونان کے بڑے بڑے حکمار مین اسکا شمار ہونے لگا، تعلیم فلسفہ کے لیئے وہان کے عام قاعدے کے مطابق مصر چلا گیا، تعلیم سے فارغ ہوکر ایک مدت کے بعد پھر اپنے وطن واپس آیا، اور ایک متمول خاندان کی نہایت مشہور عورت سے شادی کرلی، اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جسکا نام اقلومین تھا۔ حکیم اکلیوبول نے خود نہایت محنت و مستعدی کے ساتھ اسکو تعلیم دی وہ جوان ہوکر اپنے ہمعصر حکمار سے سبقت لے گئی۔ اور اس زمانے کے بڑے بڑے جادو نگار انشا پرداز دان اور نکتہ رس لوگون مین اسکا شمار ہونے لگا، اسمین ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے باپ کی طرح اہم سے اہم مسائل فلسفہ کو نہایت آسان و سادہ الفاظ مین (کبھی ضرب المثل اور کبھی چیستان کی شکل مین) حل کر دیا کرتی تھی، باوجود ان کمالات کے انکسار و عجز اتنا تھا کہ جو شخص اسکے باپ سے ملنے آتا، رسم کے مطابق اسکے پاؤن[1] دھویا کرتی۔

یہ حکیم خاندان ہرقول سے منسوب تھا، اسکے باپ کا نام اوجراس ہے، اسکی پیدائش کے وقت اکرسیوس شہر لایا پر حکمران تھا، جوان ہوکر یہ خود ایک چھوٹی سی ریاست کا حکمران ہوگیا۔ اور اپنے اس فرض کو اس عمدگی اور دیانت داری سے انجام دیا کہ تمام رعایا کے دل اسکے گرویدہ ہوگئے، اس نے اپنی اس چھوٹی سی سلطنت مین اتحاد و اخوت کا وہ سامعہ نواز صور پھونکا کہ سب ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہوگئے، اور یہ چھوٹی سی ریاست گویا ایک خاندان بن گئی۔

---

[1] یونان کی یہ ایک قدیم رسم تھی جسے اہل یونان انتہائی ادب سمجھتے تھے۔

یہ حکیم پستہ قد، قوی الجثہ اور بارعب تھا، شجاعت وبہادری کے ساتھ ساتھ نیک دل، باوضع، راست باز، متین وخاموش تھا، امن پسندی اور صلح جوئی اسکا خاص جوہر تھا وہ دوسرے بوالہوس بادشاہون کی طرح اپنی عزیز رعایا کا خون ہلاکت کی دیوی پر چڑھتے ہوئے نہین دیکھ سکتا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اُس سے تمام ریاستون سے اتحاد تھا۔ شہر مین مسافرون اور سیاحون کے لئے بہت سے مسافر خانے تھے جنھین آرام پہونچانا وہ اپنا سب سے پہلا فرض خیال کرتا تھا، یتیم بچون اور بیکس بیواؤن، ناچار ومصیبت زدہ لوگون کی اعانت ودستگیری اُسکا نصب العین تھا، وہ خود بھی دنیا وغم دنیا سے آزاد رہکر ایک معمولی آدمی کی طرح زندگی بسر کرتا تھا وہ جس طرح اپنی بیوی سے محبت اور بچون پر شفقت کرتا، اُسی طرح اہلِ وطن پر بھی جان دیتا تھا۔

حکیم سولون جو اپنے زمانے کا ایک مشہور ومعروف حکیم گذرا ہے۔ حکیم اکلیوبول کا ہم مرتبہ وہمعصر تھا۔ اسکے ہزارون شاگرد معتقد تھے، جب حکیم اکلیوبول نے سُنا کہ اسنے وطن ترک کردیا ہے تو اسکے آیندہ مصائب وتکالیف کے خیال سے بہت متاثر ہوا اور اُسے اپنی ریاست مین بُلانے کے لئے اس مضمون کا ایک محبت بھرا خط لکھا جس سے اُسکی شرافت ونیکدلی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

محترم دوست! مین جانتا ہون کہ تمھین ترکِ وطن کے بعد اپنے شہر سے زیادہ آرام ملیگا اور تمھارے لاکھون شاگرد، معتقد اور دوست اپنے گھرون کو تمھارا گھر سمجھین گے، لیکن مین نہایت محبت وخلوص کے ساتھ یہ اپیل کرتا ہون کہ تم میری ریاست شہر لنڈہ مین چلے آؤ، جسکی آغوشِ محبت تمھین قبول کرنیکے لئے ہر وقت تیار ہے، جہان آنے کے بعد تمھین دوسری ریاستون سے کسی قسم کا خوف نہ کرنا چاہیے، کیونکہ یہ خود بھی ایک آزاد وخود مختار ریاست ہے، اگر خدانخواستہ کسی قسم کی مخالفت ہوئی بھی تو باور کرو کہ تمھاری عزیز زندگی کو مین اپنی زندگی سمجھون گا۔

شہرت کا سبب | اسکی شہرت کا خاص سبب یہ تھا کہ اسنے حکمائے مصر کے اقوال، طریقہ نصیحت اور فلسفیانہ انداز بیان کا نہایت غور سے مطالعہ کیا تھا۔ حکمائے مصر عموماً نصیحتون کو "چیستان" کی شکل مین پیش کرتے تھے جو موثر ہونے کے علاوہ بہت جلد زبان زد خاص وعام ہوکر غیرفانی ہوجاتی تھین، اسنے بھی مصر سے یونان واپس آکر اسی طریقۂ بیان کو اختیار کیا جو وہان کے لوگون مین بہت مقبول ہوا اور اسکی شہرت مین چار چاند لگ گئے، یونانی حکما مین یہ سب سے پہلا

شخص ہے جس نے یونان مین چیستان گوئی کو رائج کیا، یہان تک کہ وہ اپنے تمام خطوط مین بھی
جو وہ اپنے عزیزون یا دوستون کو لکھتا، اسی طرز بیان سے کام لیتا تھا۔ مثال کی طور پر
اسکی ایک "چیستان" ذیل مین درج کیجاتی ہے، وہ کہتا ہے

مین بارہ بیٹون کا باپ ہون، انمین سے ہر ایک لڑکے کے تیس تیس لڑکیان ہین، ان
لڑکیون مین بعض تو نہایت حسین وجمیل ہین، اور بعض نہایت ہی مکروہ، و بدنما، یہ سب کی سب
غیر فانی ہین ... مگر پھر بھی ہر ایک کی عمر ایک دن سے زیادہ نہین ہوتی"

اسکا حل۔ "سال، مہینے، اور دن" ہے۔

شاہ میداس کی تعریف مین جو کتبے اُسکی قبر پر لکھے ہوئے ہین وہ اسی نکتہ رس حکیم اور سحر طراز
ادیب کی دماغ سوزی کا نتیجہ ہین،

آخر کار قدرت کے غیر اختیاری قانون "موت" نے ستر برس کی عمر کے بعد اسکے لبون پر
ہمیشہ کے لئے مہر سکوت لگادی جس سے عرصہ تک شہر لنڈہ ماتم کدہ بنا رہا۔ اگرچہ اس حکیم کو
مرے ہوئے ایک مدت ہوچکی ہے، لیکن اُسکے وہ زرین مقالات ابتک زندہ ہین جو اُسنے
وقتاً فوقتاً اہل وطن کے لئے لکھے تھے، اُن مین سے بعض ذیل مین نقل کئے جاتے ہین۔

دنیا مین احمقون کی تعداد ہر چیز سے زیادہ ہے حقیقی بزرگی یہ ہے کہ انسان ظلم و تعدی سے
دور رہے، ہر شخص کو اپنی حیثیت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہئے، دوست اور دشمن دونون کے
ساتھ نیکی سے پیش آؤ، جو ارادہ کرو اُسپر گھر ہی مین کافی غور کرلو، کسی سے بے ادبی اور گستاخی
سے پیش نہ آؤ، کم بولو اور زیادہ سوچو، اپنے کامون مین پہلے اُن لوگون سے مشورہ کرو جنھین
تم اپنے سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہو، دشمن سے حتی الامکان صلح کرلو، جبر و تشدد سے کسیکی کوئی چیز نہ چھینو،
دنیا مین سب سے زیادہ ذلیل اور احمق وہی ہے جو دوسرے کی محبوب چیز خود مانگے، ایسے بے شرم و نادان شخص کو دنیا حقارت
سے دیکھتی ہے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت مین کوشش کرو، غریبون پر ہنستے وقت اپنے مستقبل کو یاد رکھو، اگر
زمانے کی ہوا تمھارے موافق بھی ہو تو کاہل و سست نہ بنجاؤ۔ اور اگر خلاف ہو تو بیقرار نہو، ہمیشہ اپنے ہی
خاندان مین شادی کرو، باپ کو چاہئے کہ ایک خاص حد تک اپنے بیٹون کی عزت کرے، اپنی بیوی کی تعریف
اسکی باتون کو غیر محرم سے بیان کرنیوالا اُس شخص سے بھی زیادہ ذلیل ہے جو بازاری عورتون سے جا بجا منفعت کرتا ہی۔

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

لاگ کی آگ

(۱)

چتوڑ کی دھاک تمام راجپوتانہ میں بندھی تھی اور مسلمان فرمانروا ہمیشہ اسکے فتح کرنے کی کوششیں کرتے رہے - غیاث الدین تغلق بادشاہ کے عہد حکومت میں پے در پے حملے ہوئے مگر جیسی کامیابی چاہئے نصیب نہوئی - ۱۳۲۱ء کے قریب کے حملے بڑے معرکے کے حملے تھے انھیں میں سے کسی ایک حملے میں بوندی کے نارائن داس بھی مدد کے لئے آئے تھے - رانا رائے مل والی چتوڑ اور نارائن داس والی بوندی کے دلیر سپاہیوں نے شاہی فوج کو پسپا کر دیا اور یہ بلا کچھ دنوں کے لئے ٹل گئی -

رانا رائے مل نے واپسی پر دعوت مدارات اور طرح طرح کی شکرگذاری کے علاوہ آپس کے تعلقات قائم رکھنے کے لئے اپنی لڑکی کی شادی نارائن داس سے کر دی - اس گہرے تعلقات میں بہت سے راز مضمر تھے - اس لڑکی کے بطن سے ایک لڑکا شجاع اور ایک لڑکی شجاع بائی پیدا ہوئی - رائے مل والی چتوڑ کے بھی ایک لڑکا رانا رتن سنگھ تھا - باپ کے مرنے کے بعد تاج و تخت کا یہی مالک ہوا - اور ۱۳۳۲ء میں رائے مل کے مرجانے کے بعد شجاع بھی باپ کی گدی پر بیٹھا -

شجاع اور شجاع بائی میں غیر معمولی انسیت تھی - شجاع نیک اور بہادر تھا - دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ عزیز اگر کوئی چیز تھی تو وہ شجاع بائی تھی - ایک مرتبہ وہ چتوڑ گیا - وہاں اسکی خاطر مدارات میں غیر معمولی خلوص سے کام لیا گیا - آپس کے تعلقات قائم رکھنے اور رشتۂ محبت مضبوط کرنے کے خیال سے اُسنے شجاع بائی کی شادی رانا رتن سنگھ سے کر دی - اور رانا رتن سنگھ نے بھی اپنے خاندان میں شجاع کی شادی کر کے اس تعلقات کو اور زیادہ مضبوط کر دیا -

بہن کی محبت شجاع کو بے چین کئے رہتی تھی اور وہ اکثر اُسکے دیکھنے کے لئے چتوڑ جایا کرتا تھا - شجاع بائی بھی ہمیشہ اُسکے دیدار کی طالب رہا کرتی تھی - جہاں زیادہ دن گذرے آدمی پر آدمی آنے شروع ہوئے اور شجاع کو تمام کام بند کر کے جانا پڑا -

حقیقت یہ ہے کہ انسان محبت کے ہاتھوں کچھ ایسا مجبور ہو جاتا ہے کہ اسکو سوائے اُس دھن کے اور سب کچھ ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔ شجاع نے بارہا اپنی بہن کو بُونڈی بُلانے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہا۔

اُس زمانہ میں آپس کے خوشگوار تعلقات کی وجہ سے مسلمانوں کے حملے زیادہ خطرناک ثابت نہیں ہوتے تھے۔ بات یہ تھی کہ ایک دوسرے پر ہمیشہ جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا اور سب مِل کے اسلامی فوج کا مقابلہ کرتے تھے۔ رانا رتن سنگھ کی تمام باتیں شجاع کو پسند تھیں مگر جب وہ رخصتی کے بارے میں تذکرہ کرتا اور سوکھا جواب پاتا تو اُسکو سخت تکلیف محسوس ہوتی مگر لیا کرتا مجبور تھا۔ وہ خود جاکر بہن سے مِل لینا ہی مناسب سمجھتا تھا۔

(۲)

رانا رتن سنگھ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ذرا چڑچڑا۔ کینہ پرور اور ضدی واقع ہوا تھا اُسکو اپنی توہین اشارتاً کنایتاً بھی گوارا نہ تھی۔ جان دینا اسکے لئے آسان تھا مگر انتقام نہ لینا دشوار تھا۔ ایکمرتبہ جبکہ شجاع چتور میں موجود تھا شجاع بائی نے اپنی طرف سے دعوت کی۔ رانا رتن سنگھ اور شجاع دونوں کھانا کھا رہے تھے اور شجاع بائی دونوں کے آگے ضرورت کی تمام چیزیں رکھ رہی تھی شجاع نے بے تکلف اپنے آگے کی تمام چیزیں کھالیں مگر رانا رتن سنگھ معمولی طور پر ساتھ دیکر رہگیا۔ جب پان کھانے کے لیے دونوں شجاع بائی کے کمرے میں آئے تو شجاع بائی نے اپنے شوہر کو مخاطب کرکے کہا کہ "دیکھا میرے بھائی نے کھانے کی تمام چیزیں شیروں کی طرح کھالیں اور آپ لڑکوں کی طرح اُنسے کھیلتے ہی رہ گئے۔"

بات تو تھی معمولی مگر رانا رتن سنگھ کے تیور بدل گئے۔ ابرو پر بَل آگیا۔ آنکھیں غصہ سے لال لال ہوگئیں۔ غصہ کو ضبط کرکے صرف اسقدر کہا کہ "دیکھوں گا تمھارے شیر کو" شجاع بائی کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ فوراً کافور ہوگئی اور چہرہ پیلا پڑ گیا۔ شجاع رانا کے رنگ روپ کو دیکھکر بھانپ گیا کہ بات بےموقع ہوئی۔ رانا کے دل سے یہ ملال نکالنے کے لیے مسکرا کر کہنے لگا۔

شجاع۔ کیا آپ کو اس مذاق سے کچھ رنج پہونچ گیا؟ ایسی مذاق کی باتوں کا خیال نہیں کیا جاتا۔

رانا۔ (چہرے کی حالت درست کرتے ہوئے) نہیں نہیں مجھے ہرگز رنج نہیں پہنچا واقعی

آپ شیر ہیں۔

شجاع۔ کیا کھانے پینے ہی پر بہادری کا خاتمہ ہے۔ زیادہ کھانا تو درحقیقت عیب میں داخل ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں اگر شجاع بائی کے مذاق سے آپ کو رنج ہوپہنچا ہو تعجب ہے کہ اسنے اتنے دنوں میں بھی آپ کا مزاج نہیں پہچانا۔

رانا۔ مزاج پہچاننے کی اسمیں کوئی بات نہیں۔ مجھے ایسے مذاق کی پرواہ نہیں۔ آپ فضول بدگمان ہو رہے ہیں۔

اسوقت تو یہ معاملہ رفت گذشت ہوگیا مگر رانا کے دل میں یہ بات ہمیشہ نوک نشتر بنکر کھٹکا کرتی تھی۔ ہنسی دل لگی یا مذاق سے تفریح روح تو ضرور ہوتی ہے مگر ایسے لوگ جو قدرتاً چڑچڑے۔ ضدی۔ مردہ طبیعت واقع ہوتے ہیں وہ اپنے لئے تیر و تفنگ سے بڑھکر سمجھتے ہیں اور ایسے ایسے ناخوشگوار واقعات ظہور میں آجاتے ہیں کہ جنکا گمان بھی نہیں ہوتا۔

شجاع کی موجودگی میں رانا رتن سنگھ بمشکل اپنے جوش کو دبائے رہا اور کوشش کرتا رہا کہ دلی ملال کا اظہار کسی طرح نہونے پائے لیکن شجاع کے چتوڑ سے چلے جانے کے بعد آمد و رفت خط و کتابت سب بند ہوگئی۔ شجاع کے آدمی آئے بہن کے خط گئے مگر رانا نے کچھ جواب نہیں دیا۔ ہاں زیادہ تر اسکا وقت فوج کی ترتیب میں صرف ہونے لگا۔ اور یہی مشغلہ اسکے لئے دلچسپ مشغلہ بنگیا۔

(۳)

شجاع بائی کہنے کو تو کہہ گئی مگر شوہر کی بے رخی اور اسکے خطرناک انجام سے ہمیشہ کانپتی رہی۔ رتن سنگھ نے محل میں بھی آنا جانا بند کردیا۔ شجاع بائی کو موقع نہیں ملتا تھا کہ اس سے تنہائی میں ملکر اپنے قصور کی معافی چاہے۔ فوج کی تیاری کا حال سن سن کر اسکا خون خشک ہوا جاتا تھا لیکن اسکو یہ علم نہ تھا کہ فوج کی ترتیب کیوں اور کس لئے دیجاتی ہے۔ اسنے اپنے بھائی کو اس امر کی اطلاع دی کہ "رانا اسوقت فوج کی تیاری میں مصروف ہیں۔ محل میں آمد و رفت قطعی نہیں ہے۔ میرا دل گھبرایا کرتا ہے۔ آگے لگے اس نتیجہ کو جبکہ میرے منھ سے ایک مذاق کا جملہ نکل گیا۔ میں نے ہر چند کوشش کی مگر یہ نہ معلوم ہوسکا کہ فوج کی تیاری کیوں ہوتی ہے"۔

شجاع کو خط ملا بہن کی اس پریشانی سے اسکا دل بھر آیا مگر کیا کرتا رانا کے دل پر کیا اختیار تھا

اُسنے رانا کو خط لکھا کہ "عرصہ سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا جس سے تردد ہے۔ سنا ہے کہ آپ اسوقت فوج کی تیاری میں مصروف رہا کرتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے مجھے بھول گئے ہیں۔ فوج میں غیرمعمولی اضافہ سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو آپ خود کہیں حملہ کرنے والے ہیں یا کسی کے حملہ کرنے کی خبر معلوم ہوئی ہے۔ آپ صاف صاف لکھئے تاکہ میں بھی آپکے اوپر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہوں"

رانا کو یہ خط ملا پڑھکر خاموش ہو رہا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خیال ہوا کہ ہو نہو شجاع بائی نے اسکو اطلاع دی ہے۔ اِسنے اب یہ انتظام کردیا کہ کوئی شخص بوندی نہ جانے پائے راستہ میں پہرہ دار مقرر ہوگئے۔ اس طرح سے آمد و رفت مسدود ہوگئی۔

رانا ایک دن محل میں آیا۔ شجاع بائی کو اس سے بہتر موقع اور کیا تھا وہ پاس گئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"پران ناتھ اس ابلا کی چوک کو بھول جایئے۔ میں نے بڑا دوش کیا"

- رانا۔ دوش کیا اور اسکی چھما کیسی۔ ہنسی دلگی کے رشتے ناتے میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔

شجاع بائی۔ جیون آدھار! اگر دوش اور اپرادھ نہیں تو آج اتنے دن کے بعد کیوں درشن دیئے ہیں

رانا۔ مسلمانوں کے حملے کی خبر پے در پے آئی اسلئے فوج کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔

شجاع بائی۔ ایشور آپ کی سہایتا کریں۔ بھائی جی کو اسکی خبر بھیجی گئی ہے یا نہیں۔

رانا۔ جب تک میں اُنکو آدمی سمجھتا تھا تب تک ہر کام میں صلاح لیا کرتا تھا مگر جب سے تم نے "غیر" بنایا ہے تب سے مجھے اُنسے ڈر لگتا ہے"

شجاع بائی روتی ہوئی پیروں پر گر پڑی اور جو لفظ ٹوٹی پھوٹی آوازوں سے بنے اُنکا مطلب یہی تھا کہ "پران ناتھ چھما کیجئے"

رانا بجائے اسکے کہ اسکو معافی بخشتا اور اُٹھا کر پاس بٹھا لیتا سخت ترشروئی سے "مکاری سخت مکاری"" تریا چرتر زبردست تریا چرتر" کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

پھاگن کا مہینہ ہندوؤں کے لئے نہایت خوشی کا مہینہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اس مہینہ میں خون کی روانی میں نئی لہر پیدا ہو جاتی ہے سردی سے تنگ آئے ہوئے غربا بھی اس موسم میں لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

گھر گھر خوشیاں منائی جاتی ہیں رنگ اُڑتے ہیں مگر بہت سی حسرت نصیب ہستیاں ایسی بھی ہیں جنکو اس موسم میں بھی خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں۔

رانا رتن سنگھ نے مدتوں کے بعد شجاع کو یاد کیا اور اس مضمون کا خط لکھا کہ میں پھاگن کے مہینہ میں شیر کا شکار کھیلنے آؤنگا آپ تیار رہئیے گا۔ شجاع نے بھی بغیر کسی پس و پیش کے سادے لفظوں میں یہ جواب دیا کہ آپ خوشی سے تشریف لائیے میں جملہ انتظام کئے رہونگا۔

پھاگن کے آخری مہینہ میں معہ ترتیب یافتہ فوج کے رانا رتن سنگھ نے دریائے جہلم کے کنارے جہاں سے جنگل قریب تھا ڈیرا جمایا۔ کل انتظام پہلے ہی سے شجاع نے درست کر رکھے تھے جانے کے دوسرے دن شکار کی ٹھہری۔ رانا رتن سنگھ ایک طرف اور دوسری طرف شجاع چل نکلا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جبکہ دونوں میں ایک فرلانگ کا فاصلہ رہگیا۔ رانا رتن سنگھ نے شجاع پر تیر چلانے شروع کئے۔ پہلے شجاع کی سمجھ میں یہ معمہ نہ آیا مگر متواتر تیر کے آنے سے سمجھ گیا کہ یہ تیر تیر قضا ہیں اور میرا ہی شکار کھیلنے رانا آیا ہے۔ اِن سے بچنے کی فکر لازم ہے چنانچہ اُسنے تیروں سے حفاظت شروع کی اور تقریباً کل تیر بیکار کر دیئے۔ جب رانا رتن سنگھ نے یہ دیکھا تو جھپٹ کر تلوار کا ہاتھ مارا جس سے شجاع زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ خون کی روانی سے طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد بیہوش ہو گیا۔ اور رتن سنگھ اُسکو مُردہ سمجھکر اپنے خیمے کی طرف چلدیا۔

تھوڑی دیر بعد شجاع کو ہوش آیا اور وہ شالے سے زخم باندھ کر اُٹھ کھڑا ہوا ہمت مردانہ ابتک اُسی شان سے رگوں میں دوڑ رہی تھی تلوار کھینچکر رانا رتن سنگھ کو للکارا۔ وہ بھی تعجب کے ساتھ اُسکو دیکھ کر بکر ترذا لقہ موت چکھانے کے لئے بھر پڑا اور پوری طاقت سے تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ مگر اس مرتبہ شجاع نے اُسکا وار خالی دیکر اُسکو گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا اور چھاتی پر چڑھ کر رانا کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لیکن زخم کی تکلیف سے تڑپ تڑپ کر خود بھی

آغوش اجل میں سو رہا۔

یہ افسوس ناک خبر برقی لہر کی طرح بوندی اور چتوڑ پہونچ گئی۔ شجاع بائی پیارے بھائی اور شوہر کی حالت سنتے ہی بیہوش ہوکر گر پڑی۔ جب ہوش آیا تو فوراً اُس جنگل میں پہونچی جہاں ارمان و محبت کے دو پتلے خون کی ہوئی کھیل کر ہمیشہ کے لئے سو رہے تھے۔ اور شوہر کی لاش پر گر کر بیہوش ہوگئی۔

ایک طرف شجاع کی بیوی بھی اپنے شوہر کی لاش پر بیہوش پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد چتا کا سامان تیار ہوا اور دونوں دیویاں اپنے اپنے پران پتی کے لاشے کو زانو پر لیکر آگ کے درخشاں شعلوں میں پنہاں ہوگئیں

دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھ گئی اور ایک تودہ خاکستر تھا اور بس۔

ع لاگ کی آگ بُری ہوتی ہے جلنے کے لئے۔

منظور الحق کلیم اعظمگڈھی

جذبات نازک و

آہ! اے میرے دل، مجھے اُن خواب ہائے گذشتہ کو بھول جانے دے جو کہ پریشان ہو چکے ہیں

ہاں مجھے اس جنگل میں گری ہوئی سُرخ و سفید پتیوں اور کلیوں کا ایک چتا بنا دے تاکہ میں اُن منتشر خوابوں کو آگ کی شعلہ افروز شعلوں سے جلا دوں۔

بس تھک گئی ہوں آہ! اے میرے دل، میں عرصہ تک خواب محبت کے گراں بوجھ برداشت کرنے سے تھک گئی اب مجھے آرام کرنے دے۔

ہاں مجھے اُسکی خاک کو منتشر کرنے دے تاکہ میں کچھ لمحوں تک اُنکا ماتم کرسکوں۔

لیکن ہاں اے میرے دل مجھے فوراً اُٹھکر ایک مرتبہ پھر دنیاوی جھگڑوں کے مجمع میں دیوانہ وار پھرنا چاہئے۔

اے میرے دل مجھکو اُٹھنے دے تاکہ میں اُن خوابوں کو جمع کروں، جو کہ باقی رہ گئے ہیں۔

سنو! کہ میں زندگی کے مصائب و آلام کو اپنے غم انگیز نغمے سے فتح کروں گی۔

ثاقب کانپوری

ترقیوں کی حیرت انگیز رفتار

(از ڈاکٹر حکیم سید علی کوثر چاندپوری)

انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ وہ اپنے ہر آئندہ وقت کو گذشتہ سے زیادہ شاندار اور روشن دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا کی تمام حساس قومیں اس زرین اصول کو اپنے بہترین اور قابل رشک قوائے عمل سے آئے دن استوار کرتی رہتی ہیں۔ انکا دور ماضی اگر آغاز مستقبل کے وقت دیکھا جاتا ہے تو ان دونوں زمانوں کی وجہ انفصال نہایت دلآویز نظر آتی ہے ہم دیکھتے ہیں ماضی جن جذبات ترقی کو لیکر آیا تھا وہ ان اسباب عروج کے مقابل بہت ہی پست اور مبتذل تھے جو اب موجودہ زمانہ کے محیر العقول وسائل و ذرائع کے ساتھ پیش ہو رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے ایک بیدار قوم کے بہت جلد بام ارتقا پر پہونچ جانے کی۔ یہی اور صرف یہی سبب ہے دلدادگان ترقی کو ایسے مقام اعلی پر فائز کر دینے کا جو بہت بلند ہوتا ہے عوام کے نقطۂ نظر سے۔

اقوام یورپ کے ابتدائی حالات تاریخ پر نظر ڈالنے سے ڈاروِن کی تحقیق کے صحیح مان لینے میں کوئی معقول عذر باقی نہیں رہ جاتا۔ خصوصاً اسوقت جبکہ ہم ان کے موجودہ طرز معاشرت تمدن اور دیگر اجزاء زندگی وغیرہ پر منصفانہ خیال آرائی کرتے ہیں تو یہ باور کرنے کی کوئی خاص نفی ہمارے پاس نہیں رہ جاتی کہ اک . . . . . . تمیں انسانیت کے انتہائی مدارج پر پہونچکر اپنے قابل تقلید حسیات سے دنیا کو محو حیرت نہیں بنا سکتا۔

اپنے اسلاف اور ان کے نہایت قیمتی، بکار آمد، کارناموں کو ہم اپنے واقعات زندگی اور سوانح حیات پر منطبق کرنے کے بعد آسانی اور افسوس سے کہہ سکتے ہیں۔

کوئی تعجب خیز امر نہ ہوگا۔ اگر کچھ دور آگے چلنے پر ڈاروِن کی مضحکہ انگیز تحقیق کا صحیح عکس ہمارے

افرادِ قوم پر بسہولت منعکس ہو جائے "

بلکہ میرے نزدیک تو یہ کہدینا بھی زیادہ دشوار نہیں کہ ہم اب بھی اِن بیمانہ او صاف کے سچے آئینہ دار ہیں جو ایک قوم اور زندہ قوم کے لئے سب سے زیادہ باعث ننگ کہے جاسکتے ہین - وہ وقت ہمین یاد ہے جبکہ اصحابِ ذوق اکتساب معلومات کی غرض سے مضطربانہ ہمارے دروازون پر دستک دیا کرتے تھے - اور انکی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ملجا ہمارے خزانہائے علم کے سوا دنیا کی بسیط فضا مین کوئی دوسرا مقام نہ ہوتا تھا - اور آج یہ حسرتناک سین بھی ہمارے سامنے ہے کہ زمانے کے روشن دماغ حضرات اپنی بصیرت افزا' اختراعات دکھا کر ہمین دعوت عمل دینا چاہتے ہین - مگر ہم ہیں کہ جمودِ غفلت آرا' اور برودت کرب انگیز کی زبردست چٹانون مین اس بری طرح دبے ہوئے ہین کہ سر اُٹھانا تو کجا جنبش لب بھی دشوار ہے' اگر کسی طرف سے کوئی خفیف سی آواز حمیت کانون مین پہونچتی بھی ہے تو ہماری وہ قوت سماعت جسپر خود جمود و غفلت کی تاریکیان مستولی ہین اسقدر جلد اسکو اپنی جامد کیفیات مین تبدیل کرلیتی ہے کہ ہجوم تاثرات کی معمولی سے معمولی ضرب بھی قلب تک نہین پہونچتی -

قاعدہ ہے کہ جب کسی ذی روح جسم کی وہ خوبصورت وجہ امتیاز جسے قوت حِس کہتے ہین زائل ہو جاتی ہے اور اسکے خیالات پر پستی و تنزل کا ادبار مسلط ہو جاتا ہے تو صاحبان مغز کی بیدار مغزیان دکھا کر اسکو گرم کیا جاتا ہے اور سینہ مین ان تمام آثار حیات کے لبریز کرنے کی سعی کی جاتی ہے جو بقائے زیست کے لئے ازبس ضروری ہین' کیونکہ یہی ایک ایسا طریق علاج ہے جسکو ان موقعون پر آخری چارہ کار کہا جا سکتا ہے - اور جس سے مردہ' ناکام حیات دلون مین گرمی حمیت پیدا ہو جانے کی کافی امید کیجا سکتی ہے -

اس پسندیدہ اُصول کار کے بعض شیرین ثمرات' دلربا نتائج کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے ہم بھی چاہتے ہین کہ آج کی صحبت مین ناظرین کے دماغی قوی کو دیگر افراد ملک کی داستان بلند پردازی سنا کر وقف حیرت و استعجاب بنا دین - دو رِ تمدن کے مختلف مدارج پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انسان کو کسقدر وسیع اختیارات مرحمت فرمائے ہین - انسان اور وہ انسان جو محض پتون مین چھپا رہنا ستر پوشی کا بہترین ذریعہ خیال کرتا تھا

آج ہزاروں متنوع الالوان کپڑے بھی اسکے ترقی یافتہ تمدن کے مقابل ناکافی نظر آتے ہین۔ اور وہ انسان جو کسی وقت اس قسم کی ترقیاں، قلب ماہیت سے زیادہ اہم جانتا تھا۔ اسوقت سقفِ آسمان کے نیچے کوئی چیز ایسی موجود نہین جو اسکے کرشمہ ہائے دماغ کی شرمندۂ احسان نہ بنی ہو، دنیا جانتی ہے جس طرح ایک عدیم البصر آنکھ کا کام کان سے نہین لے سکتا، اسیطرح یہ امر بھی حدود امکان سے باہر اور بالکل باہر ہے کہ آلات سماعت کے افعال اعضائے بصر سے پورے کئے جاسکین۔ لیکن اکتشافات جدیدہ ثابت کرتے ہین کہ یہ خیال فرسودہ ہوچکا۔ اور فی الحقیقت اس قابل نہین رہا کہ اربابِ خرد اپنے لمحاتِ عزیز اس اعتنائے بے حاصل مین صرف کرین۔ ابھی حال مین امریکہ کی انسانی اور سرگرم جماعت کے نہایت قیمتی مساعی نے یہ عجیب و غریب حقیقت بے نقاب کرکے ہمارے سامنے پیش کی ہے کہ ہر ایسا شخص جو اپنے کسی حس کے باطل ہوجانے پر لذائذ و نعمات دنیوی سے دستکش ہوچکا ہو بہت آسانی اور سہولت سے زائل شدہ حس کے وظائف و اعمال موجودہ حواس سے حاصل کرسکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ مین ایک حیرتناک تجربہ جو ہیلن کلر نامی عورت پر کیا گیا ہے خاص طور سے قابل ذکر ہے،

ہیلن کلر ۱۸۸۰ء مین پیدا ہوئی لیکن بدقسمتی سے دو سال کے اندر ہی اس نے باصرہ، سامعہ، اور قوت گویائی کو خیرباد کہدیا۔ علاج مین تمام امکانی کوششین صرف کی گئین مگر کامیابی نہوئی حتی کہ یہ عدیم المثال لڑکی اپنی عمر کے سات سال ختم کرچکی،

اس تاریک دور کے گذر جانے پر وہ ایک حیات تازہ کی مالک بنی۔ یعنی تعلیم و تربیت مین اسنے ایسی تعجب خیز دستگاہ پیدا کی کہ کسی دوسرے کو آسانی سے میسر نہین ہوسکتی، اسنے مختلف علوم مین کمال پیدا کیا، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، زبانون پر عبور حاصل کرنیکے علاوہ، فلسفہ، ڈاکٹری وغیرہ کی ڈگریان لین اور چند کتابین تصنیف کین جنمین سے کئی مقبول بھی ہوئین، مگر آپ کو حیرت ہوگی، آپ کو تعجب ہوگا، جب آپ یہ معلوم کرینگے کہ اسنے یہ تمام باتین لامسہ اور شامہ کے ذریعہ حاصل کین اور انھین دو قوتوں کے اندر ان سارے حواس کی طاقتین سلب کرلین جو بیکار ہوچکے تھے۔

اب یورپ و امریکہ کی باقاعدہ درسگاہین گونگون، بہرون کی تربیت و تدریس کی ذمہ دار ہین۔ اور صرف اشارون سے انھین سب کچھ سمجھا دیا جاتا ہے۔

کثرت مناکحت

ایک زمانہ تھا کہ ہندوؤں کے دوسری بیوی کرنے میں بہت سی رکاوٹیں تھیں شاستروں نے طرح طرح کی پابندیاں لگا دی تھیں - انگریزی زمانہ میں عدالتوں میں یہ فیصلہ ہوگیا کہ ہندو کے لئے کوئی تعداد بیویوں کی نہیں - جتنی ہدایتیں شاستروں میں درج ہیں وہ اختیاری ہیں - لابدی اور ضروری نہیں ہیں - عملاً ہندوؤں کے یہاں ایک سے زیادہ شادیاں بدون کسی خاص باعث کے نہیں کرتے - راجگان اور رؤسا البتہ شوقیہ ایک سے زیادہ شادیاں کرلیتے ہیں - ڈاکٹر گوڑ اور مسٹر مین نے اپنی تصانیف ہندو لا میں دکھلایا ہے کہ رفتہ رفتہ عدالتوں نے شاستروں کے قیود نرم کردئیے - گویا اسوقت یہ قانون سمجھا جائے کہ ہندو کو کوئی پابندی نہیں - یعنی کثرت مناکحت جائز ہے - یہ زمانہ حال کی برکتوں میں سے ہے کہ قانون مردہ بدست زندہ ہے - جس طرح سے شارح مقنن اور میر عدالت تعبیر کردیں وہی مستند قانون بنجاتا ہے -

ہمکو بعض اوقات حیرت ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے قانون کے مطابق جو چار بیویوں سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا اسکی کوئی تمثیل آیا اور جگہ بھی ہے - شارع اسلام نے ایسی پابندیاں لگا دی ہیں کہ درحقیقت ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے - (اگر احکام کی پوری پابندی کی جاوے) - جب ہم پورانوں کا مطالعہ کر رہے تھے تو بعض میں یہ پڑھا کہ برہمن کے لئے بھی چار بیویاں تک جائز ہیں - پابندیاں کوئی درج نہیں - ہم ذیل میں حوالہ جات درج کرتے ہیں -

اگنی پوران صفحہ ۵۹۲ } میں لکھا ہے کہ برہمن کے لئے چار - کھتری کے لئے ۳ - ویش کے
استلک صفحہ ۸۷۳ } لئے دو اور شودر کے لئے صرف ایک بیوی جائز ہے -

سانکھ سنیا صفحہ ۱۶۱۶ - میں لکھا ہے کہ برہمن کے لئے ۴ - کھتری ۳ ویش اور شودر
کے لئے صرف ایک بیوی جائز ہے -
منوجی کے قانون کے رو سے تو پابندیاں بہت سخت تھیں مثلاً کوئی شخص ۸ برس تک
انتظار کئے بغیر بصورت لاولدی کے دوسری بیوی نہیں کر سکتا تھا - بلکہ پہلی بیوی کی
رضامندی کے بدون دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا - موجودہ تعبیروں نے کل پابندیوں
کو موقوف کر دیا ہے - کیا مصلحان ملک اس کمی کی طرف کچھ توجہ فرمائیں گے -

شمیم

رباعیات محروم

(۱)

کس درجہ غم آفریں ہے عالم دل کا
ہمکو تو عدوئے جان ہوا غم دل کا
دل ماتم آرزو میں مضطر تھا کبھی
اب ہم ہیں اور آہ ! ماتم دل کا

(۲)

ایام شباب یاد آتے ہیں مجھے
وہ نقش بر آب یاد آتے ہیں مجھے
اتنی وہ ہو گئیں کبھی کی باتیں
بھولے ہوئے خواب یاد آتے ہیں مجھے

(۳)

دنیا میں برائے مردم کم مقدار
اہل شوکت ہیں باعث صد آزار
راہوں میں رہروان منزل کے لئے
اڑتی ہوئی گرد چھوڑ جاتے ہیں سوار

(۴)

معدوم اُسے نہ مان جو ہے مستور
ظلمت کے مقابلے میں موجود ہے نور
اے منکر ذات حق ذرا کھول آنکھیں
فانی ہم ہیں تو کوئی باقی ہے ضرور

(۵)

ہنگامہ ترا ہی گرم ہر اک سو ہے
تیرے دم سے ہے جتنی ہاؤ ہو ہے
دل سے ہیم یہی صدا اٹھتی ہے
تو ہی تو ہے جہاں میں تو ہی تو ہے

شُدّھی

ایک جواب

مئی کے زمانہ مین ملکانہ راجپوت مسلمانون کی شُدّھی کے عنوان سے منشی پریم چند نے اُس تحریک پر کچھ نکتہ چینی کی ہے جو ہندوؤن کے ہر ایک طبقہ کو ایک پلیٹ فارم پر لے آئی ہے جسمین آریہ سماجی۔ سناتن دھرمی۔ جینی اور سکھ سب شریک ہین۔ اودھ کے تعلقہ دار آگرہ کے زمیندار۔ شہرون کے پڑھے لکھے ہندو۔ گانوٴن کے ان پڑھ راجپوت۔ پنجاب کے جوشیلے کارکن۔ صوبہ جات متحدہ کے عام باشندے۔ دولت مند سیٹھ اور غریب پنڈت سب اسمین حصہ لینا فخر سمجھ رہے ہین۔ بھارت دھرم مہامنڈل۔ کاشی کی پنڈت منڈلی۔ امرتسر لاہور اور دوسری جگہون کے پنڈتون کی آشیرباد اِس مین شامل ہے۔ جس کی کارروائی پر کشتری مہاسبھا آگرہ۔ کشتری پرانتک سبھا فیض آباد اور راجپوتون کی اور بیشمار کانفرنسین صاد کر چکی ہین۔ منشی پریم چند کی نکتہ چینی دو تین باتون پر منحصر ہے۔ ایک تو وہ سرے سے مذہبی تبلیغ کے مخالف نظر آتے ہین۔ اسلئے وہ ہندوؤن کی اس کوشش کو مذموم قرار دیتے ہین۔ دوسرے وہ مردم شماری کے اندراجات کی بنا پر اس بات پر اصرار کر رہے ہین کہ یہ مسلمانون کی شدھی ہے۔ اسلئے ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے یہ تحریک ناموزون ہی نہین بلکہ ضرر رسان ہے۔ تیسرے وہ اس تحریک کو سوراجیہ کی جگہہ ہندو راجیہ کا نشان قرار دیتے ہین۔ ضرورت ہے کہ آپ کی نکتہ چینی پر ذرا غور سے نظر ڈالی جائے تاکہ آپ کے دلمین اور کانگریس کے چند اور سرگرم کارکنون کے دلمین جو خیالات اِس تحریک کے بارے مین پیدا ہو گئے ہین۔ اُنکی جانچ ہو سکے۔ سب سے پہلے تبلیغ مذہب مین آپ کی بیرخی کا سوال ہے۔ آپ نے مذہب کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ ٹھیک سہی۔ لیکن اُس سے یہ لازم نہین آتا کہ تبلیغ کا کام بند کر دیا جائے۔ بلاشبہہ مذہب عبد و معبود کے رشتۂ اتحاد کا نام ہے۔ لیکن کیا

اِس دقیق مسئلے کو بغیر کسی روشن دماغ پیشوا کی مدد کے عام طور پر لوگ سمجھ سکتے ہین - اگر آپ کی منطق ٹھیک مانی جائے تو دنیا کے سارے روشن خیال پادری، دقیقہ رس مولوی - اور نکتہ سنج پنڈت بیکار ٹھہرتے ہین - آپ یہ مانتے ہین کہ اس بارے مین ہندوؤن نے سبق مسلمانون سے سیکھا - لیکن اسپر بھی آپ مسلمانون کی ہدایت کے لئے ایک لفظ تک کہنے کو تیار نہین ہین - جن لوگون کی آپ وکالت کر رہے ہین اُنکا تو یہ خیال ہے کہ تبلیغ کا کام کسی حالت مین بھی (ہندو مسلم اتحاد ہو یا نفاق - غیر قوم کا راج ہو یا سوراجیہ) بند نہین کیا جا سکتا عیسائی بھی تو یہ کام کر رہے ہین - اُنکے لئے آپ کیا راستہ تجویز فرماتے ہین - ابھی ایک بدھ مشن مالابار مین آیا ہے - اُسکی آمد پر نہ تو آپ چراغ پا ہوتے ہین اور نہ کانگریس ہی نے ملامت کا کوئی لفظ استعمال کیا ہے - کیا غریب ہندو ہی اس ہندو مسلم اتحاد کے اس ہندوستانی اتفاق کے واحد ٹھیکہ دار ہین کہ اُنکا قول و فعل ہی ملامت کا نشانہ بنے - مسلمان بنگال کی پہاڑیون مین ہندوؤن کو مسلمان بنانے مین مصروف ہین - کیا آپ نے یا کانگریس کمیٹی یا خلافت کمیٹی نے اِس بات پر نوٹس لیا - اتحاد کی لکیر پیٹتے پیٹتے اتنے دن ہو گئے لیکن کیا کچھ کوشش ہندوؤن کے تحفظ کی بھی کی گئی ؟ آپ کو شائد معلوم نہو جسوقت کانگریس نے اچھوتون کے اُٹھانے کا ریزولیوشن پاس کیا تو پنجاب خلافت کمیٹی نے جملہ خلافت کمیٹیون نے ان اچھوت ہندوؤن کو مسلمان بنانے کی دعوت دی تھی - اسپر کانگریس نے کیا کیا تھا ؟ غضب تو اب ہوا - جب ہندوؤن نے بھارتیہ ہندو شدھی سبھا بنا کر اس کام مین ہاتھ ڈالا - آپ کہتے ہین کہ یہ کام اب اجتماعی طور پر ہو رہا ہے - اسلئے قابل ملامت ہے - کیا مسلمان اور عیسائی اجتماعی طور پر کام نہین کر رہے ہین ؟ اگر آپ اس معاملہ مین کم واقفیت رکھتے ہین - اسکا نزلہ غریب ہندوؤن پر نہ گرائیے -

آپ نے دوسرا الزام ہندوؤن کے سر پر یہ تھوپا ہے کہ جہان مسلمان سب دنیاوی خیالات کو دور کرکے ہندوؤن کو صرف جہنم کی آگ سے بچانے کے لئے ہی اُنھیں مسلمان بناتے ہین - وہان لامذہب ہندو ملکانون کو کوئی مذہبی بشارت تو دے نہین سکتے - صرف سیاسی اغراض کے لیئے اپنی تعداد بڑھانی ضروری سمجھکر شدھی کے کام مین لگے ہوئے ہین

بھلا شدھی کے کام کرنیوالون مین سے کتنے ایسے ہین جنھون نے پہلے سیاسی اغراض کیلئے کام کیا ہے - مہاتما ہنس راج اس میدان کے شاہ سوار ہین - یا سوآمی دیانند - بی - اے - ذرا کام کرنے والون کی فہرست پر نظر توڈالئے اور پھر بتلائے کہ یہ کام مذہبی دیوانے کر رہے ہین یا بیوقوف سیاست دان ہ ایک بات صاف ظاہر ہے کہ ہندو حلقہ مین اس کام کی مخالفت وہی لوگ کر رہے ہین جنکے دماغ پر سیاسی اغراض کا بھوت بُری طرح سوار ہے - جنھون نے آج تک اس بات کی ذرا پروا نہین کی کہ ہندو دوزخ مین جاتے ہین یا جہنم مین - جنھون نے خلافت کمیٹیون کے کام کے لئے دھوان دھار لیکچر دئے ہین اور شاید روپیہ بھی اکٹھا کیا ہو - لیکن جنھون نے آج تک ہندوؤن کے لئے ہندو ہونے کی حیثیت مین کوئی کام نہین کیا ہے - ہان یہ وہی لوگ ہین جنھون نے آخیر دم تک مالابار مین آریہ سماج کے جانے کی مخالفت کی تھی اور جو موقع بے موقع مولپلاؤن کے ظلم کی داستانون کی سچائی سے انکار کرتے رہے ہین - اسلئے کہ سیاسی اغراض سے پُر ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے ڈھونگ کو صدمہ نہ پہونچے معاف فرمائیے شدھی کے مسئلہ پر لکھنے کے پیشتر اگر آپ صورت حالات کا ملاحظہ شدہ شدہ گاؤن مین جاکر کر لیتے تو شاید آپ کو سیاسی اغراض کا بھوت نہ ڈراتا -

آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ملکانے مردم شماری کے کاغذون مین مسلمان درج ہین اسلئے وہ مسلمان ہی ٹھہرے اور اسلئے مسلمانون کو اُنکے ہندو ہونے سے صدمہ پہونچنا ضروری ہے - آپ کی معصومانہ ناواقفیت کا کوئی علاج نہین - آگرہ ضلع کے گزیٹیر سے اخبارون مین اقتباسات نکلے - مولانا آزاد سُبحانی اور بابو پرشوتم داس ٹنڈن کی تحقیقات نے اُنکو نہ ہندو اور نہ مسلمان قرار دیا - مولانا آزاد نے اس سوال پر بحث کرنے سے ہی انکار کر دیا - لیکن پھر بھی ملکانے مسلمان ہی رہے - آپ کہتے ہین کہ اُنکے رسم ورواج بھاڑ مین جائین - صرف مردم شماری کی بات صحیح ہے - ٹھیک بہت ٹھیک - نہ معلوم سرکار کی شائع کی ہوئی معلومات کے لئے آپ نے یہ محبت کب سے شروع کی ہے - ایک بات آپ اور بڑے پتہ کی بتاتے ہین - ہندوؤن مین بھی ایسے آدمی ہین جو کئی مسلمان رسمون کے پیرو ہین - اچھی بات ہے آپ ایسے لوگونکو نکال دیجئے - جو کبھی سید ہوتے ہوئے پھر ہندو سکئے گئے ہون - جنکا سید دین سے

مجلسی تعلق قائم ہو جو اپنے فرقون کے نام ویسے ہی قائم رکھتے ہون - ایسے لوگون کو جب مسلمان اپنے مین شامل کرلینگے تو سچ مانیئے وہ ہندو جو اس قسم کی باتون مین دلچسپی لیتے ہین - ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کی دھمکی نہ دینگے اور نہ مسلمان مولویون کو غازی کا رتبہ دلانے کی کوشش کرینگے - لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایسے ہندو عدیم الوجود ہین - آپ جنکا ذکر مثال کے طور پر کر رہے ہین اُنکی اور ملکانون کی حیثیت مین زمین و آسمان کا فرق ہے - ملکانہ ٹانک راجپوت ہین تو دوسری طرف ہندو ٹانک راجپوت بھی ہین - یہی نہین اُنکی اندرونی شاخین بھی قائم ہین اور ایک ہندو ایک ملکانہ کو چچا مانتا ہے -

اب آپ الزام دیتے ہین کہ ہندوؤن نے اس تحریک کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے مین پہل کی - پھر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی معلومات نہ معلوم کتنی پرانی ہین۔ اگر آپ مالابار کے فساد سے پہلے لکھتے جبکہ ہندوؤن کو زبردستی مسلمان نہین بنایا گیا تھا - اور پھر اُس پر ایک دو کو چھوڑ کر کسی ذمہ دار مسلمان لیڈر نے ہندوؤن سے ہمدردی کی ہوتی اور مسلمان علما نے موپلاؤن کو غازیون کا خطاب دیکر اُنکے لئے اپیل نہ کی ہوتی تو شاید آپ کا الزام بجا ہوتا - اگر آپ ملتان کے فسادات سے پیشتر لکھتے جبکہ ہندوؤن کی مقدس کتابین جلائی نہین گئی تھین - اُنکی مقدس عمارتون کو مسمار نہین کیا گیا تھا - اُنکی عورتون کی بے حرمتی نہین کی گئی تھی تو شاید ہندو آپ کی بات مان لیتے - اگر آپ پنجاب مین میان فضل حسین کی زیر سرپرستی مسلم راج کے عملاً شروع ہونے سے پہلے لکھتے تو بھی آپ کی بات قابلِ اعتبار ہوتی - لیکن اب تو آپ بے سُرا راگ الاپ رہے ہین - معلوم نہین آپ نے اِن باتون کو بھلا دیا ہے - یا آپ ایسی چار دیواری مین رہتے ہین جہان ہندوؤن کی شکایات پہونچ ہی نہین سکتین - لیکن نہین آپ خود لکھتے ہین -

”جن صوبون مین مسلمانون کی آبادی زیادہ ہے وہان ہندوؤن کو آسایش اور اطمینان میسر نہین - اُنکی لڑکیان - اُنکی بیوائین ہمیشہ اسلامی دست برد کا شکار ہوتی رہتی ہین“۔

اگر ہندو مسلم اتحاد کے یہی معنی ہین تو ایسے اتحاد کو دور سے سلام - ہندو بھی بڑے خوش قسمت ہین - مار بھی کھاتے ہین اور پھر ایسے ناصح بھی موجود ہین جو کہ صبر کا اُپدیش کر رہے ہین

گویہ اُنکی طاقت سے باہر ہے کہ صورت حالات کے بہتر ہونے کا کوئی پیغام ہندوؤن کو سنا سکین۔

آپ تیسرا الزام یہ دیتے ہین کہ شدھی کے سلسلے نے نہین بلکہ اسیر جملہ ہندوؤن کے اتفاق نے مسلمانون کو شبہہ مین ڈال دیا ہے۔ خوب فرمایا اگر مسلمانون کو راضی رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہندو ہندو آپسمین جھگڑے رہین۔ اگر کانگریس سوراجیہ کو اُسوقت حاصل کرسکتی ہے۔ جب سناتن دھرمی آریہ سماجیون سے دور بھاگین۔ تو ہندوؤن کو سوچنا پڑیگا کہ اُنھین اپنے لئے کیا انتظام کرنا چاہئے۔ ایک بات آپ نے ٹھیک کہی تعداد ہی سب کچھ نہین ہے اگر یہی سب کچھ ہوتی تو ہندوؤن کی یہ دُردشا نہ ہوتی لیکن مخالفین تو اسی بات مین خوش ہین کہ ہندو اپنے آپ کو ایک نظام مین بھی نہ باندھ سکین۔ پنجاب کے مسلمان اخبارون نے مالوی جی کے اس معاملہ پر تقریرون پر جو شور مچایا تھا وہ صاف اس بات کا ثبوت ہے۔

آپ ہندوؤن سے مذہبی رواداری کے نام پر اپیل کرتے ہین کہ وہ اس تحریک کو بند کردین۔ یہ اپیل ایک مایوسانہ لہجہ مین ہے۔ ہم خوش ہین کہ آپ نے اس بات کو محسوس کیا ہے کہ شدھی مین حصہ لینے والے اس کام سے باز نہین آنے کے۔ لیکن آپ نے اسکے حامیون کی تعداد کا اندازہ غلط لگایا ہے۔ جن لوگون نے اسکے لئے ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ اکٹھا کر کے دیا۔ جس طبقہ مین سے اسکے دو سو سے زیادہ کارکن آئے ہین وہ شدھی کی اہمیت کو سمجھ چکا ہے۔ اُنکے لئے ہندو مسلم اتحاد کے نام پر گمراہ کن اپیلین کسی کام کی نہین۔ اور سچ پوچھو تو یہی وہ لوگ ہین جنھون نے ہندوؤن کی مصیبتون مین آج تک اُنکا ہاتھ بٹایا ہے۔

آپ اس تحریک سے ہندو مسلم اتحاد کو صدمہ پہونچنے اور اُس سے کانگریس کا کام بند ہونے کی ناخوشگوار خبر سناتے ہین۔ کیا کانگریس کے لئے کام کرنا ہندوؤن پر احسان کرنا ہے؟ کیا سوراجیہ کے نزدیک ترین لانے کے لئے کوشش کرنا اُنکو شکر گزار بنانا ہے؟ اگر نہین تو پھر یہ ڈراوا کیسا۔

وقت ہے کہ سیاسی میدان مین کام کرنیوالے اور خاصکر سیاسی کامون مین حصہ لینے والے ہندو اس بات کو سمجھ لین کہ ہندوؤن کی کمزوری ملک کے لئے نقصان دہ ہے جب تک ہندو کمزور رہین اور مسلمانون کو یہ یقین ہے کہ وہ کمزور رہین اُسوقت تک ہندو مسلم اتحاد بے معنی ہے۔

مہر رام شرما۔ ایم۔ اے

طالب بنارسی

منشی وناٸک پرشاد صاحب مرحوم طالب بنارسی بنارس مین پیدا ہوئے، بنارس ہی مین تعلیم پائی اور زندگی کی آخری گھڑیان بھی بنارس ہی مین گزرین، گو بسلسلۂ ملازمت اکثر آپ کا قیام بمبئی مین رہا لیکن جب وقت آپہونچا خاک وطن نے کشش کی، بنارس آئے اور وہین ۱۰ ر نومبر سنہ ۱۹۱۹ء کو انتقال فرمایا، مرحوم کو اُردو شاعری کے اعتبار سے جو کامیابی نصیب ہوئی وہ محتاج بیان نہین، ادبی مذاق رکھنے والے اصحاب بخوبی جانتے ہین اور خود آپ کا کلام شاہد ہے، آپ کے طبیعت کی روانی خدا داد تھی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ جو کچھ کہتے تھے خوب کہتے تھے۔ اُردو کے علمی رسالون اور اخبارون مین آپ کا کلام قدردانی کے ساتھ شائع ہوتا تھا - فارسی، ہندی، اُردو، انگریزی زبانون مین آپ کو اچھی مہارت تھی اور قریب قریب سب زبانون مین آپ نے مشق سخن کی ہے۔

مرحوم اپنے وقت کے ایک پُرگو شاعر تھے۔ نظم کے علاوہ نثر مین بھی آپ نے خوب خوب مضامین لکھے ہین، جذبات انسانی کی تصویر کھینچنا اور اُس سے دلون کو متاثر کرنا آپکا خاص حصّہ تھا۔ نظم کے ہر صنف مین آپ کا کلام پایا جاتا ہے۔ غزل، رباعی، مثنوی، وغیرہ وغیرہ سب کچھ آپ کی تصانیف مین موجود ہین۔

عربی اور سنسکرت مین بھی آپ نے اپنے شوق علمی کے بدولت قابلیت حاصل کرلی تھی

آپ کی گفتگو عالمانہ ہوتی تھی اور اس سے آپ کی ادبی دستگاہ کا پورا ثبوت ملتا تھا۔

آپ کے وسیع الخیالی اور خوش خلقی نے شاعرانہ خیالات کو اور بھی قابل قدر بنادیا تھا

شاعری کے علاوہ آپ نے ملک کی ڈراما نویسی مین بھی بڑی مہارت حاصل کی تھی، اِس فن مین آپ نے وہ کمال حاصل کیا کہ آج آپ کے لکھے ہوئے ڈرامون سے بڑی بڑی کمپنیان اپنی

اسٹیجون کو زینت دے رہی ہین، آپ کے ڈرامے مقبول خاص و عام ہوئے، آپ کا ایک ڈراما انگلستان مین بھی ترجمہ ہو کر کھیلا گیا ہے۔

آپ کا ظریفانہ کلام بھی ایک خاص شان رکھتا تھا، اور اہل ذوق کے دلون مین چٹکیان لیا کرتا تھا، ظرافت کے ساتھ بیان و زبان کی پاکیزگی اور بندش کی چستی بھی قابل قدر تھی۔

ارباب ذوق شاید یہ مژدہ مسرت کے ساتھ سُنین گے کہ آج کل آپ کے شاگرد رشید منشی بیلی رام صاحب آپ کی مفصل سوانح عمری لکھ رہے ہین امید ہے کہ آپ کی کوششین بار آور ہونگی، اور اس فدائے ادب کے ادبی کارنامے دنیائے ادب مین ایک خاص نظر سے دیکھے جائین گے۔

جناب بہادر نگم اکبر پوری

شراب محبت

اے محبوب میری آنکھون اور سادہ لوح دلین اب سوائے تمھارے علم کے اور کچھ نہین ہے۔ ہر جگہ ہوا سے بھرے ہوئے آسمانون اور پھولون سے بھری ہوئی زمین پر۔ مین تمھارے چہرہ کے تبدیل ہوتے ہوتے حسن کو ہزارون شکلون مین دیکھتا ہون۔

میری بیخود نظرون مین تمھین سب سے بڑی اور مسرت بخش حقیقت ہو۔ تمھین صبح کے ستارہ کی رونق، اور سمندر کے نغمون کی روح ہو۔ تمھین بہار کی عطر بیزی کے سبب اور خرمن زمانہ کے قیمتی سرمایہ ہو۔ اے محبوب میری سادہ لوح روح اور عقل کو اب سوائے تمھارے اور کچھ نظر نہین آتا۔ اسکے نزدیک زندگی کے پاک سرچشمہ کی (جسمین میری روح کو اب بھی مختلف اوقات مین آرام و آسائش حاصل ہے) کوئی قیمت نہین۔

اے تیز دھار والی تلوار! اے بیش قیمت تاج، اور اے میرے رنج و خوشی کے مندر میرے تمام رنج و آلام کا انحصار تمھارے ایک ابرو کے اشارے مین پنہان ہے۔ اور میری تمام مسرتین تمھاری ایک نگاہ مین محدود ہین۔ تم میری حیات کا سرچشمہ ہو، اور میری موت کی حقیقت بے نقاب،

(ترجمہ) عالی لکھنوی

ریویو کتب

(مزدور کی بیٹی)

اس سبق آموز اور عبرت انگیز ناول کے مصنف مسٹر شمس الدین حسن ایڈیٹر ریلوے یونین نیوز ہیں، یہ جسقدر دلچسپ ہے اُسیقدر تعجب انگیز بھی ہے، دلچسپی واقعات پر منحصر ہے لیکن تعجب انگیزی مصنف کی عبارت پر، مزدور کی بیٹی، دراصل روز ا لیمرٹ، کی ہوبہو نقل ہے۔ روز ا لیمرٹ، رینالڈ کا ناول ہے، اسکے مترجم جناب آثر لکھنوی ہیں، مسٹر شمس الدین صاحب نے ستم یہ کیا ہے کہ اصل قصہ کے علاوہ قریب قریب عبارت بھی وہی آثر لکھنوی کی نقل کردی ہے۔ نام البتہ بدل دیئے ہین۔ کیا ادبی دنیا مین ایسی جرأت قابل ستائش قرار دیجا سکتی ہے ہم ذیل مین دونون کتابون سے چند سطرین نقل کرتے ہین، تاکہ ناظرین کو اندازہ ہوجائے کہ روز ا لیمرٹ اور مزدور کی بیٹی دونون ایک ہین صرف نام کا فرق ہے۔ روز ا لیمرٹ مین ایک پادری کی لڑکی کا قصہ لکھا ہے، ایک موقع پر اُس سے ایک دولتمند اور آوارہ مزاج نوجوان اظہار عشق کر رہا ہے، اُس واقعہ کے متعلق وہ خود یہ کہتی ہے۔

"یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھ سے عشق آمیز گفتگو کی، میرے خیالات نے کبھی تو وہ سبز باغ دکھایا کہ جسکی انتہا نہین، مین سوچنے لگی، اگر مین نے ایک ایسے دولتمند رئیس سے عقد کیا تو اپنے باپ کو اس تہلکہ افلاس سے نجات دلانے کے علاوہ سسرال کو بھی اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ عہدہ دلا سکون گی"

مزدور کی بیٹی مین بھی ہیروئن کو یہی موقع پیش آیا ہے اور وہ کہتی ہے۔

میری تمام زندگی مین یہ سب سے پہلا موقع تھا کہ مین نے اس قسم کی بیہودہ گفتگو کسی نامحرم سے کی ہو، اس گفتگو نے مجھے مسشن کردیا، میرے خیالات نے وہ سبز باغ تیار کئے کہ جنکی انتہا نہین ہوسکتی، مین نے خیال کیا اگر مین ایسے امیرزادے سے فی الواقع شادی کرون۔

تو مین اپنے باپ کو مفلسی سے نجات دلا سکتی ہون اور اپنے بھائی کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلا سکتی ہون"

ایک ایڈیٹر کے لئے یہ جرم ناقابل عفو ہے۔ تقطیع چھوٹی حجم ۲۰۰ صفحہ قیمت ایک روپیہ ۱؎ ملنے کا پتہ۔ منیجر یونین گزٹ بک ڈپو۔ اندرون موچی دروازہ (لاہور)

سیاحت ہوا

دائرۂ ادبیہ لکھنؤ کے سلسلۂ اشاعت مین علمی ناولون کی اشاعت بھی شامل ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی سیاحت ہوا ہے۔

سیاحت ہوا مین ہوائی پرواز کے متعلق ایک دلچسپ افسانہ ہے جسمین اس علمی مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سائنس کے خشک مسائل کو واقعات مین اس طرح سمو دیا ہے کہ جزو داستان بن گئے ہین، اصل ناول فرانس کے شہرۂ آفاق ناولسٹ جولیس ران کے زور قلم کا ممنون ہے، جسکو مولوی سید محمود اعظم صاحب فہمی نے اُردو مین ترجمہ کیا ہے، ترجمہ کی خوبی سے سیاحت ہوا مین ایک مستقل تصنیف کا رنگ پیدا ہو گیا ہے کاغذ نفیس کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ملنے کا پتہ۔ دائرہ ادبیہ لکھنؤ۔

آنند مٹھ

یہ سیاسی ناول بنگالی زبان کے سرمایۂ ناز فسانہ نگار بنکم چندر چیٹرجی کے زور قلم کا نتیجہ ہے، اسمین بنگال کے اُن سیاسی سادھوؤن کے حالات و خیالات بیان کئے گئے ہین جو افغانون کی حکومت کے خلاف سرگرم کار تھے۔ حقیقتاً یہ ناول قومی اور ملکی خدمات کا معلم ہے، اسکا مطالعہ ملک اور اہل ملک کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے، اسکو ڈاکٹر گوکل چند فارنگ ایم اے۔ بی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا پنجاب نے بنگال سے اردو مین ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ مین اکثر سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ موجود ہین اسوجہ سے بعض جگہ اُردو کی سلاست پر حرف آ گیا ہے۔ تقطیع چھوٹی حجم ۲۱۵ صفحہ قیمت ایک روپیہ چار آنہ ۱؎ ملنے کا پتہ۔ منیجر گیان پرکاش مندر پوسٹ ماچھرہ ضلع میرٹھ۔

چیتراولی

انڈین پریس الہ آباد نے چیتراولی کے نام سے ۱۶ تصویرون کا ایک مرقع نہایت عمدہ اور دیدہ زیب شایع کیا ہے - یہ تصویرین بہترین مصورون کی بنائی ہوئی ہین، حسن طباعت نے اور بھی چار چاند لگا دیئے ہین - بعض تصویرین خصوصیت سے قدر کے قابل ہین تیسری تصویر مصوری کا بہترین نمونہ ہے، جسمین ایک مزار کے قریب ایک حسینہ سربہ زانو بیٹھی ہے، اور دوسری عورت ہاتھ مین پھول لئے کھڑی ہے - اُسکے ہاتھ سے خود بخود پھول چھوٹ کر نیچے گر رہے ہین، قبر پر لکھا ہے، اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ہر تصویر کے متعلق آخر مین ایک نوٹ بھی دیا گیا ہے، جسکے پڑھنے کے بعد تصویر کی شان بڑھ جاتی ہے - لطف النسا کی تصویر بھی ایک مرقعۂ عبرت ہے، سراج الدولہ کی قبر کے پاس لطف النسا ایک عالم استغراق مین بیٹھی ہے، یہ تصویر عورت کی وفاداری اور شوہر پرستی کا آئینہ ہے،

چندرکھی کے نام سے جو تصویر دی گئی ہے وہ خصوصیت سے قابل قدر ہے - واقعی مصوری خاموش شاعری ہے - اس مرقع کی قیمت عہ مقرر ہے -

ملنے کا پتہ - انڈین پریس الہ آباد -

(اعظمی)

الہلال

یہ مذہبی، سیاسی، علمی، اخلاقی اور ادبی مضامین کا قابل قدر رسالہ ہے - جو دھلی سے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شایع ہوتا رہتا ہے - اسکے قلمی معاونین کا حلقہ وسیع ہے، جسمین ملک کے اکثر مشاہیر ارباب قلم شامل ہین -

تقطیع $\frac{۲۰}{۲۲}$ حجم ۳ جز، کاغذ عمدہ، کتابت، طباعت دیدہ زیب، باوجود ان خوبیون کے قیمت سالانہ صرف عہ مقرر ہے -

ملنے کا پتہ - دفتر الہلال دھلی -

قریۂ ویران

اِس سے قبل کئی بار اس دلچسپ نظم کے مختلف ٹکڑے ہدیۂ ناظرین ہو چکے ہین -
اصل واقعہ یون ہے کہ جب اُمرا و تجّار کے ظلم سے اوبرن کے کسان اُجڑ کر شمالی امریکہ
مین چلے گئے تو اُنکو طرح طرح کی آفتون کا سامنا کرنا پڑا اور یہان آکر بلاؤن مین گھر گئے ،
گولڈ اسمتھ نے اس نظم مین انھین غریبون کی مصیبتون کا مرقع پیش کیا ہے اور سید راحت حسین
صاحب اسے اردو لباس پہنانے کی کوشش کر رہے ہین - ترجمہ کی روانی قابل داد ہے کاش
جناب مترجم اس نظم کے ترجمے کو چھوٹے چھوٹے حصون مین منقسم کر کے بے لطف نہ بنائے -

بند ۲۱

اے حسین اوبرن کیا تیری زنانِ مہ لقا
اپنی بدبختی سے ہین رنج و الم مین مبتلا
تیغ کی ایذائین اُٹھا کر ہو کے فاقون سے نڈھال
خود پرستون سے کیا کرتی ہین روٹی کا سوال ۳۴۰
کچھ یہی حالت نہین جب سے چھٹا پیارا وطن
بلکہ اس سے بھی زیادہ اُنکے ہین رنج و محن
کالے کوسون اُس طرف دنیا کے ہین مرکز گزین
بیچ مین ہے نصف کرہ کی محدّب سرزمین
جادہ پیما ناتوان قدمون نے ساتھ اُنکا دیا
چلتے چلتے حارّہ خطّے مین جا کر دم لیا

(منزلین ہین پُر خطر اور آفتون کا سامنا)

درد و غم پر اُن کے نوحہ خوان ہے نہرِ التما

دلربا منظر کہان دل چسپیان وہ اب کہان

کتنی درد انگیز ایذائین یہان ہین الامان

مشتعل سورج پھرا کرتا ہے سر پر جلوہ گر

شعلۂ جوّالہ ہین اُسکی شعاعین سر بہ سر

کوئی لا سکتا نہین تابِ شعاعِ آتشین

دوڑتی ہین آگ برساتی ہوئی سوئے زمین

دھوپ کی شدّت سے مرغانِ چمن خاموش ہین

دم بخود ہین پیاس سے اور کنج مین روپوش ہین

وہ گھنے جنگل کی تاریکی جہان دبکے ہوئے

اونگھتے چمگادڑون کے جھنڈ ہین لٹکے ہوئے

دامنِ صحرا مین زہریلی فضا چھائی ہوئی

لہلہاتے سبز پودون پر بہار آئی ہوئی

زہر آلودہ وہ کالے بچھوؤن مین شانِ مرگ

کرتے پھرتے ہین فراہم چارسو سامانِ مرگ

ہر قدم پر دل دھڑکتا ہے یہ ہوتا ہے یقین

کینہ کش پھنکارتے افعی نہ جگ جائین کہین

گھات مین بیٹھا ہے شیرِ گرسنہ بھی بیقرار

ہر گھڑی ہے اُسکو صیدِ بیخبر کا انتظار

(ظالم و بے رحم اور سفّاک قاتل الامان)

شیر سے بھی بڑھکے ہین خونخوار باشندے یہان

خاک اُڑاتی مثل دیوانون کے ہین ہر سو دوان
چرخ کھاتی تند و پُر آشوب کالی آندھیان
ایک کر دیتی ہین دم مین عالمِ ارض و سما
جڑ درختون کی نظر آتی ہے بالائے فضا
ہائے یہ رُوداد ہے اِک داستانِ دلشکن
آہ وہ دلکش مناظر آہ وہ پیارا وطن
(دامنِ کہسار مین بھولی ہوئی وہ شاخسار)
سر دُھنے پر وہ سبزون کے لہکنے کی بہار ۳۶۰
پُر فضا وہ کُنج وہ گنجان شاخین رازدار
چوم جاتے تھے جنھین جھونکے ہوا کے بار بار
طائرون کی نغمہ سنجی چہچہون کا وہ خروش
رازدارانِ محبت کے وہ سچّے پردہ پوش
یعنی تھین خلوت سرائے حُسن و اُلفت جھاڑیان
وہ محبت آفرین دل چھپ کے ملتے تھے جہان

(باقی آیندہ)

سیّد راحت حسین بی اے

جذباتِ بسمل

اِن دنون حال عجب ہے ترے دیوانون کا
دامنون کا ہے ٹھکانا نہ گریبانون کا

اِک نگاہِ غلط انداز اِدھر بھی ساقی
خون ہو جائے نہ ظالم مرے ارمانون کا

سرِ محفل تری رنگینیٔ جلوہ کی بہار
خاتمہ آج کئے دیتی ہے ایمانون کا

جل بُجھے، خاک ہوئے، اُف بھی نہ نکلی منہ سے
تیری محفل مین عجب حال تھا پروانون کا

فضل اللہ بسمل

جذباتِ ریاض

کلامِ تازہ لسان العصر حضرت ریاض

تا عمر مزے دورِ مے و جام کے اُٹھے
ہم قبر سے پیاسے مئے گلفام کے اُٹھے

ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جو خم و جام کے اُٹھے
میخانے سے کچھ ڈھیر مرے نام کے اُٹھے

ہم جا کے تہِ دام ڈبے پاؤں پھر آئے
قسمت سے کنارے بھی کچھ اُس دام کے اُٹھے

کل اُسکی گلی مین کوئی سو بار گئے آئے
تا صبح نہ بیٹھے کہین، ہم شام کے اُٹھے

میخانے مین جا کر عوضِ دُرد لگا آئے
جب دام نہ کچھ جامۂ احرام کے اُٹھے

یہ کہکے شبِ وصل ہمین چھیڑ رہے ہین
پہلو سے ہمارے کوئی دل تھام کے اُٹھے

اِس قصد سے موسیٰ کو غش آیا ہے اُٹھا لائین
کچھ سایہ نشین آج ترے بام کے اُٹھے

ملتا ہے کیا لذّتِ دُشنام نے ایسا
مُنھ چومنے عاشق تری دُشنام کے اُٹھے

فرہاد سے کوئی نہ بڑھا تیشہ زنی مین
اُٹھنے کو کئی آدمی اِس کام کے اُٹھے

ہم سائلِ میخانہ نہین کم کے و جم سے
جلوے سے اگر پی تو مزے جام کے اُٹھے

جب کہہ کے ریاض اُسنے پکارا سرِ محفل
بن بن کے کئی آدمی اِس نام کے اُٹھے

بہارِ شفق

از برق دہلوی - بی - اے - منشی فاضل - ایس - اے - ایس

ہے جلوہ بہارِ شفق آسمان پر
پردہ سے مہر جلوہ فگن ہے جہاں پر
صہبائے سرخ یا یہ خمِ نیلگوں میں ہے
یا برق بیقرار تڑپ کر سکوں میں ہے

لایا ہے رنگ خونِ شہیدانِ نامراد
یا مشتعل فرشتوں میں ہے آتشِ فساد
یا آگ لگ رہی ہے کسی لالہ زار میں
یا گرم کارزار ہے یہ نور و نار میں

کیا آسماں کو لعل لگے ہیں خدا کی شان
یا ہے نظر کو شعلۂ جوالہ کا گماں
بھیگا ہے جنکی آب سے رنگِ گلاب سرخ
یا دامنِ فلک پہ گری ہے شراب سرخ

لالے کے پھول دامنِ چرخِ بریں میں ہیں
یا پارہ ہائے آتشِ گل، گلزمیں میں ہیں
یا معدنِ عقیق کی ضو ہے نظر فروز
یا آسماں پہ ہے کرۂ نار جلوہ سوز

پہنے قبائے سرخ کوئی شعلہ فام ہے
یا چرخ فتنہ ساز یہ آتش بجام ہے
یا روئے آتشیں کا ہے جلوہ نقاب میں
یا آفتاب ڈوب گیا ہے شہاب میں

پہونچا ہے اڑ کے تا فلک اخضری گلال
یا روئے مہر پر ہے یہ سرخیٔ انفعال
یا کاسۂ فلک میں یہ ہولی کا رنگ ہے
غصے سے لال، روئے حسینِ فرنگ ہے

لیلائے شب ہے محملِ زریں میں جلوہ گر
مستِ مئے نظارہ نہ ہو برق کیوں نظر
رکھے ہیں آس پاس مئے آتشیں کے جام
جوشِ شباب پر ہے عروسِ بہارِ شام

برق دہلوی

تو کہاں ہے

نور پاشی کر رہی ہے چاندنی مہتاب کی	اور سکوتِ محویت سے آسماں معمور ہے
ہو گیا فرشِ زمیں گویا کہ دریا نور کا	جسکا ہر ذرہ تحیر خیزیٔ صد طور ہے
شیوۂ صبر و سکوں سے پھر بھی میں بیگانہ ہوں
تو کہاں ہے جلد آ تیرے لئے دیوانہ ہوں

کرتی ہے بادِ سحر پھولوں سے جب اٹکھیلیاں	بامِ گردوں سے نمایاں ہوتے ہیں آثارِ صبح
ننھے ننھے طائروں کی پیاری پیاری بولیاں	جنکے نغموں سے ہے افزوں گرمیٔ بازارِ صبح
ڈھونڈتی ہیں میری آنکھیں تجھکو اے زہرہ جبیں
کر رہی ہے یاد تیری دل مرا اندوہگیں

اور سکوتِ شام میں باہم ملیں جب پیار سے	چھوٹی چھوٹی لہریں پانی کی وہ نازک نازنیں
صاف اور شفاف پانی پر مقدس آفتاب	ڈالتا ہے بامِ گردوں سے شعاعِ دلنشیں
تیرے جلوے کے لئے آنکھیں ہیں وقفِ جستجو
تیرے عارض تک پہونچنے کی انھیں ہے آرزو

وہ چٹکنا باغ میں غنچوں کا ہنگامِ سحر	اور شاخِ گل پہ بلبل کی ترنم ریزیاں
حیرت افزا سبزۂ نوخیز کا نظارہ جب	فرشِ بستاں پر کرے پیدا تحیر خیزیاں
تو کہاں ہے راحتِ دل مایۂ صبر و سکوں
آ کہ دکھلاؤں تجھے میں داغہائے لالہ گوں

اے مرے مہرِ درخشاں اے مجھے جاں سے عزیز	تجھ سے روشن ہے مرا یہ خاکدانِ زندگی
اے مرے درمانِ دردِ دل سکونِ اضطراب	اے مرے عیسیٰ نفس روحِ روانِ زندگی
اے مسیحا کچھ تسلی دے دلِ بیمار کو
ہاں مری آنکھیں ترستی ہیں ترے دیدار کو

احمد شبیر حیرت

داستانِ غم

غم سے نجات ہو چکی، ہستیٔ ناگوار کو
موت اب اختصار کر، مدّتِ انتظار کو

بھول گئے تھے عیش مین کل جو مآل کار کو
آج وہ رو رہے ہین کیون گردشِ روزگار کو

اب نہین دلمین رنگِ خون گریۂ غم کو کیا کرون
خون کہان سے لاکے دون، دیدۂ اشکبار کو

راحت و غم سے کیا غرض، اُنکی خوشی سے ہے خوشی
ہمنے نثار کر دیا، جبر یہ اختیار کو

جلوہ گہِ حیات ہے، اصل مین منظرِ فنا
مرگ ہے جانِ زندگی، دیدۂ اعتبار کو

غم کہ ہے جانِ زندگی اسکو کبھی فنا نہین
لاؤ بدل لون اِس سے مین ہستیٔ مُستعار کو

شام سے مضطرب ہی دل رات پہاڑ ہو گئی
آج قرار آگیا! گردشِ روزگار کو

کشمکشِ حیات سے، مر کے نجات ہو نہ ہو
خیر اک آسرا تو ہے، قلبِ اُمیدوار کو

ضبط ہی مایۂ سکون، ہان اسے مانتا تو ہون
آہ مگر مین کیا کرون، اس دلِ بیقرار کو

رنگ اُڑیگا مثلِ بُو، پھول بنینگے داغِ دل
دورِ خزان مین دیکھنا مستیٔ بہار کو

حاصلِ کیفِ انبساط، نشۂ غم ہے یاد رکھ
خونِ جگر سمجھ کے پی، بادۂ خوشگوار کو

ایک تمھارے واسطے، سب سے وہ ہاتھ اُٹھا چکا
تم نہ اُٹھاؤ بزم سے احسنِ خاکسار کو

احسن سنبھلی

لطف سخن

مرزا جعفر علیخان اثر لکھنوی

کنکھیون سے دل پر نظر کرنیوالے — یہ ناوک نہین ہین اثر کرنیوالے
شب غم تڑپ کر بسر کرنیوالے — اِدھر کی ہین دنیا اُدھر کرنیوالے
تپکنے لگے دل کے سب داغِ کہنہ — مری بیکسی پر نظر کرنے والے
تم آئے مگر ہائے کسوقت آئے — کہ تیار ہین جب سفر کرنیوالے
ذرا بیکسون سے خبردار رہنا — زمانے کو زیر و زبر کرنے والے
کہین اُٹھ بھی جائے یہ پردہ دوئی کا — اِدھر دیکھ! او دل مین گھر کرنیوالے
جنھین سانس لینے کی طاقت نہین ہے — مہماتِ اُلفت ہین سر کرنیوالے
مجھے شوق تقدیر لایا یہان تک — خطاؤن سے اے درگذر کرنیوالے
کبھی جن سے تسکین ہوتی تھی دل کو — وہی نالے اب ہین ضرر کرنیوالے
مسیحا بنے پھر رہے ہین جہان مین — مرے خون سے دامن کو تر کرنیوالے
خلش سے تمنا کی آزاد کر دے — دعاؤن مین پیدا اثر کرنیوالے
یہ کیا ہے نہین دیکھتے آنکھ اُٹھا کر — لحد پر اثر کی گذر کرنیوالے

غزل منشی جگت موہن لال رَوان

وہ خوش ہوکے مجھ سے خفا ہو گیا — مجھے کیا اُمیدین تھین کیا ہو گیا
کوئی چارہ سازون سے کہدے مرے — کہ میرا مرض لا دوا ہو گیا
مرے جذبِ دل کی کمی کھل گئی — اگر تیر اُنکا خطا ہو گیا
کسی غیر سے کیا توقع کہ جب — میرا دل ہی دشمن مرا ہو گیا
کہان سے کہان لائی قسمت مری — کس آفت مین مین مبتلا ہو گیا
کسی نے جو پوچھا مرا حالِ درد — مرا درد اس سے سوا ہو گیا
روان تو کہان اور کہان رہِ عشق — تجھے کیا یہ مردِ خدا ہو گیا

علمی نوٹ اور خبرین

فارسی کی قدردانی راجہ مہندر پرتاپ نے تجویز پیش کی ہے کہ ایشیا کے لئے ایک مخصوص زبان ہونی چاہیئے، موصوف کی رائے مین موجودہ زبانون مین صرف ایک فارسی زبان ہے، جو اِس ضرورت کے لئے انتخاب کیجاسکتی ہے۔ کیونکہ ایشیا کی زبانون مین اسکو ایک خاص امتیاز اور تفوق حاصل ہے۔

ایران جیسے قدیم ملک کی مادری زبان فارسی ہے، سنسکرت سے اسکا گہرا تعلق ہے، افغانستان اور بخارا مین اسکو ملکی زبان کی حیثیت حاصل ہے، ہندوستان اور ترکی مین بھی فارسی مدتون سرکاری زبان رہ چکی ہے، آج بھی اُن ممالک مین کچھ نہ کچھ اسکا رواج ہے، ترکستان کے چینی بھی فارسی زبان کا مطالعہ نہایت ذوق شوق سے کرتے ہین، جاپان کا ایک محقق کہتا ہے کہ جاپانی بھی فارسی زبان سے نکلی ہے۔ اِنھین خصوصیات کی بنا پر راجہ مہندر پرتاپ صاحب نے یہ رائے پیش کی ہے۔

اسمین شک نہین کہ فارسی دنیا کی اکثر زبانون سے سہل ہے، اِسکے صرف و نحو کے قواعد آسان ہین۔ اسلئے عام طور پر اسکا حاصل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہین، چونکہ فارسی مین عربی کے الفاظ بھی کثرت سے شامل ہو چکے ہین، اسلئے ممکن ہے کہ مصر اور شمالی مغربی افریقہ مین بھی یہ بین الاقوامی زبان تسلیم کر لیجائے، مگر اسکا یہ مطلب نہین کہ اسکی تعلیم تمام پبلک اسکولون مین بھی عام کردیجائے بلکہ صرف بین الاقوامی سیاسات مین جانیوالون کو پڑھنی پڑیگی، دیکھئے اِس تجویز کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

ہندوستان مین اندھون کی تعلیم بعض حضرات کا خیال ہے کہ ہندوستان مین اندھون کی تعلیم کو رواج دینا چاہیئے، بعض مقامات پر اسکے متعلق کچھ کوشش بھی ہوئی مین لیکن کوئی خاص

کامیابی نہین ہوئی،

اسمین شک نہین کہ علم کی روشنی ہی ایک ایسی چیز ہے جو ان غریبون کو ظلمات سے نکال سکتی ہے لیکن ابھی ہندوستان مین آفتاب علم کی کرنین ایسی مدھم ہین کہ اندھے تو اندھے خدا نے جنھین دو آنکھین دی ہین وہ بھی ایک حد تک اس جہان افروز روشنی سے محروم ہین، سب سے پہلے تو یہان تعلیم کو عام بنانے کی کوشش ہونی چاہیئے، علم کی روشنی عام ہوگی تو اندھون کی آنکھون پر بھی اسکا اثر پڑیگا۔

بعض مغربی ملکون مین جہان اندھون کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہے، وہان تعلیم بالکل عام ہے، اور قریب قریب ہر شخص تعلیم یافتہ ہے۔ اندھونکی تعلیم کے لئے بھی مدارس قائم ہین اور باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے، چنانچہ امریکہ مین اندھون کے لئے کتابین چھاپنے کے دو بڑے کارخانے قایم ہین، ایک بمقام بوسٹن قایم ہی جو غیر سرکاری ہے، اور دوسرا جسکا نام "امریکن پرنٹنگ ہاؤس فور دی بلائنڈ" ہے، بمقام لوئس وائل قائم ہے، اس مطبع کو گورنمنٹ سے دو لاکھ روپیہ سالانہ امداد ملتی ہے۔ اس مطبع مین اُبھرے ہوئے حرفون مین رسالے اور کتابین چھپتی ہین اور اندھون کو تعلیم دینے والے مدرسون مین مفت تقسیم ہوتی ہین، اُبھرے ہوئے حرفون مین چھپنے کی وجہ سے ضخامت بہت بڑھ جاتی ہے، اور اسی اعتبار سے قیمت بھی، جو کتاب معمولی ٹائپ مین چھپکر پانچ روپیہ کو بکتی ہے، وہی اُبھرے ہوئے حرفون مین چھپکر پچاس روپیہ کی ہوجاتی ہے اور ضخامت چھ گُنی بڑھ جاتی ہے۔

جو رسالے اندھون کے لئے چھپتے ہین اُن سب مین "ویلگر میگزین" بہت مشہور ہی، جو اندھون کو مفت تقسیم کیا جاتا ہے، کتابون کی قیمت چونکہ گران ہوتی ہین، اسلئے ہر اندھا نہین خرید سکتا، بلکہ لائبریریون سے لیکر اپنی ضرورت پوری کرتا ہے، درخواست کرنے پر لائبریریون سے کتابین اُسکے پاس بھیجدی جاتی ہین، اور ڈاکخانہ اُن کتابون کے لئے محصول ڈاک معاف کردیتا ہے۔

لندن مین اندھون کا سب سے بڑا اور بہترین کتبخانہ ہے، کتابین اُبھرے ہوئے حروف (برلی) مین چھپی ہین، برلی وہ حروف تہجی ہین جنکو ۱۸۲۱ء مین برلی صاحب نے ایجاد کیا ہے،

برنی صاحب فرانس کے رہنے والے تھے، اور خود بھی اسی بلائے تاریک مین مبتلا تھے۔

اِن حروف تہجی سے الفاظ بنانے کا یہ طریقہ ہے کہ چھ نقطون کو ایک قطار مین جما لیتے ہین جو تین نقطون کے برابر گہرے، اور دو نقطون کے برابر چوڑے ہوتے ہین، انھین نقطون کے مختلف اتصال سے تمام الفاظ بنتے ہین جنھین اندھے ہاتھ رکھکر معلوم کر لیتے ہین۔

امریکہ مین متعدد مدرسے اندھون کی تعلیم کے لئے قائم ہین، اور انمین سے بہت سے اندھے فارغ التحصیل ہوکر نہایت فارغ البالی سے زندگی بسر کر رہے ہین، ایک اندھون کے سکول کی رپورٹ مین لکھا ہے کہ ہمارے یہان تقریبًا ایکہزار سے زیادہ اندھے مندرج رجسٹر ہین جنمین سے دو سو سند حاصل کر چکے ہین، اور باقی کامیابی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہے ہین، پاس شدہ اندھے مختلف کام انجام دے رہے ہین، اور بعض بعض دوسرے مدرسون مین معلم ہین،

اِن حالات کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوسکتا ہے کہ امریکہ مین اندھون کی تعلیم کے لئے جو انتظامات ہین، اُس پیمانے پر یہان آنکھ والون کے لیے بھی نہین ہین۔ تا بہ کوران چہ رسد،

مئی نمبر مین کلام جوہر، جو تنقید شائع ہوئی ہے، اُسکے متعلق مولوی عبد الماجد صاحب بی اے تحریر فرماتے ہین۔

> کلام جوہر پر جو ریویو شایع ہوا ہے اُسمین یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے، کہ مولانا کے بعض مصرعون کا حرف بہ حرف دوسرے شاعرون کے کلام سے توارد ہوگیا ہے۔
>
> اِس غلط فہمی کی تصحیح ضروری ہے، دوسرے شاعرون کے جو مصرعے کلام جوہر مین نظر آتے ہین وہ بربنائے توارد نہین، بلکہ حضرت جوہر نے بالقصد انھین اپنے کلام مین ضم کیا ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح طور پر یون کہنا چاہیئے کہ دوسرون کے بعض مصرعہ لیکر انھین پر اپنی غزل تیار کی ہے، اور جا بجا اُن مصرعون کو اپنے کلام مین شامل کرتے گئے ہین۔ چھندواڑہ کی نظر بندی کے زمانہ مین متعدد غزلین کہی تھین، اور انھین سب سے اول، میرے نام کے عنایت نامون مین تحریر فرمایا تھا ان مین دوسرون کے مصرعون کو ہمیشہ علامات اقتباس ( ) کے اندر درج فرمایا ہے۔

غالب کی مشہور غزل اس زمین مین ہے، خدا اور سہی، جفا اور سہی: ایک شعر یہ ہے ؎

بت ہو تم پھر تمھین پندارِ خدائی کیون ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

جوہر اپنے مکتوب گرامی مین عنوان پر یہ مصرعہ لکھتے ہین، "تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی۔"
نیچے اپنی غزل درج کرتے ہین اور اس مین اس مصرعہ پر پیش مصرعہ اپنی طرف سے لگاتے ہین،

رب عزت کے لئے ابھی کوئی رہنے دو خطاب
تم خداوند الخ

اور اپنے اسی خط مین اس دوسرے مصرعہ کو علامات اقتباس کے اندر تحریر کرتے ہین۔
یہ ایک مثال مین نے لکھدی - اس طرح کی متعدد مثالین میرے نام کے خطوط مین محفوظ ہین۔
"سلام کے بعد" والے حضرت آسی کے جس مطلع توارد کا ذکر کیا گیا ہے، اُسکی بھی بعینہ یہی صورت ہے یعنی یہ مطلع حضرت جوہر کا کسی معنی مین بھی نہین، حضرت آسی ہی کا ہے، جوہر نے اسے اپنی غزل کا عنوان بناکر اسپر اپنی غزل کہی ہے - یہ محض چھاپنے والون کی بے توجہی اور غلطی ہو کہ اُنھون نے اس قسم کے اقتباسات کو کتابت مین جوہر کے کلام سے ممتاز نہین کیا - مولانا اگر آزاد ہوتے، اور پروف اُنکی نظر سے گذرے ہوتے تو اُنھون نے یقیناً ان غلطیون کی اصلاح کردی ہوتی - والسلام - عبدالماجد

ریاست بڑودہ کی "علم دوستی"

سنہ ۱۹۱۱ء ریاست مین ۲۷۵ کتبخانے تھے مگر اب انکی تعداد ۶۲۸ ہے، کتابین پہلے ۵۵،۲۳۶ تھین لیکن اب ۲۹۳۶۹۸ ہین، اسی نسبت سے ناظرین کی تعداد مین بھی اضافہ ہو رہا ہے، خاص بڑودہ کے کتبخانے مین ۹۰ ہزار سے زیادہ کتابین ہین - ناظرین کے ذوق و شوق کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۲ء مین ۸۰ ہزار کتابین لائبریری سے مطالعہ کے لئے باہر گئین، مرکزی کتب خانہ بڑودہ مین عورتون کے لئے الگ کتبخانہ ہے، اس کتبخانہ سے دس ہزار سے زیادہ کتابین مطالعہ کے لئے باہر جا چکی ہین۔

یہان سفری کتب خانے بھی ہین جو ذوق مطالعہ کے حقیقی رہنما ہین، ان کتبخانون نے ایک سال مین دس ہزار سے زیادہ کتابین مطالعہ کے لئے تقسیم کی ہین، کاش دوسرے والیان ریاست اور ذی حوصلہ رؤسا کتب خانون کی ضرورت اور اہمیت پر نظر فرماتے اور ہندوستان کے ہر گوشے مین اس قسم کے کتبخانے قایم ہو جاتے۔

علمی حوصلہ افزائی

تاریخ عالم شاہد ہے کہ اکثر ارباب ہنر نا قدر دانی زمانہ کا شکار ہوئے، علم حاصل کیا،

شہرت نصیب ہوئی، مگر دولت سے بے بہرہ اور افلاس مین مبتلا رہے، انجام کار اپنے ابنائے جنس کی نا قدر دانیون کا گلہ کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

وہ ممتاز اہل قلم جنھین اپنے زمانہ مین معراج کمال نصیب ہو چکی تھی (اور آجتک جنکے کمالات سے دنیا فیض اُٹھا رہی ہے) عموماً مفلسی و تنگدستی مین گرفتار تھے، عمر بھر دنیاوی دولت و ثروت سے متمتع نہوئے، اکثر یہ بھی ہوا کہ جیتے جی اُنکا نام بھی مشہور نہ ہوا، البتہ مرنے کے بعد اُنکے کارنامے قدر کی نگاہون سے دیکھے جانے لگے اور اُنھین وہ عزت نصیب ہوئی جسکے وہ زندگی مین آرزومند تھے

واقعات کا مطالعہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہی کہ علم کو دنیاوی دولت سے زیادہ لگاؤ نہین، اسباب کچھ ہون لیکن ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آتا ہے کہ ارباب علم ناقدردانئ زمانہ کو عمر بھر روتے گئے۔

ہندوستان کے نامور شعراء و اہل علم بھی ہمیشہ تقدیر کا شکوہ کرتے رہے، اگر کسی ذی حوصلہ اُولوالعزم شخص نے اُنکی حوصلہ افزائی بھی کی تو اُنکے کمالات کے مقابلے مین اُسکی کچھ حقیقت نہ تھی،

یہان وہی پرانی روش آج بھی قائم ہے، اور علم کی ویسی ہی کسادبازاری ہے، لوگ مزدوری کرنا اچھا سمجھتے ہین لیکن ایک عالم اور ادیب بننا پسند نہین کرتے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج سنسکرت زبان قریب قریب ہندوستان سے رخصت ہو چکی ہے، اُردو زبان جسنے بادشاہون کے محلون مین پرورش پائی ہے، فنا ہو رہی ہے، اگر کسی نے بدقسمتی سے اُردو ادب مین آگے بڑھنے کی جرأت بھی کی تو زمانہ کی ناقدردانیون نے اُسے پیچھے ڈھکیل دیا اور ابنائے زمانہ کو ایک مضحکہ کا موقع ملگیا۔

حقیقت یہ ہی کہ بجز قدردانی و حوصلہ افزائی کے علم کی اشاعت نہین ہوتی، یورپ جسکی علمی ترقی آج ساری دنیا کو محوِ حیرت بنا رہی ہے اسی کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہان اہل علم کی حوصلہ افزائی اسقدر عام ہی جسکی مثال دنیا کے اور خطون مین نہین مل سکتی۔

خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد یوسف صاحب جعفری لکچرار عربی فارسی کلکتہ یونیورسٹی کا پٹنہ مین ۹ رجون کو طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

باہتمام منشی دیا نرائن نگم زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قوت بڑھانیوالی عجیب طاقت دینے والی تمام قسم کے جریان اور سلسل البول دور کرنیوالی ہمالیہ پربت کی اکسیر اعظم دوا

شدھ سلاجیت

اسکے استعمال سے خواب میں احتلام ہونا اور دھات کا پتلا پڑجانا تمام قسم کے جریان اور پیشاب کا زیادہ آنا بدن کی سستی و درد کمر۔ تھکاوٹ۔ بھوک کم لگنا۔ دماغی طاقت کا کم ہوجانا۔ کھانسی اور معدے سے خون آنا۔ گٹھیا ہوجانا۔ تمام بدن میں درد ہونا۔ بواسیر خونی و بادی۔ سفید کوڑھ۔ سوزاک جدید و کہنہ اور مرگی کی بیماریوں کو دور کرتا ہے۔

قیمت ۵ تولہ ۱۲؍   ۱۰ تولہ ۱۲؍   خرچہ ڈاک ۵؍
قیمت ۲۰ تولہ ؍   ۴۰ تولہ ؍   ” ” ۱۰؍

برہمی بوٹی ٹکا

اسکے تھوڑے ہی دن استعمال کرنے سے یادداشت بہت تیز ہوجاتی ہے اور حافظہ کو جسم کی خوبصورتی اور گٹھن کو۔ آنکھوں کی روشنی بڑھانے کو بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ وکیل۔ بیرسٹر۔ طلبہ۔ ڈاکٹر۔ منیجر۔ انجنیر غرض یہ کہ دماغ کا کام کرنے کے لیے ہر انسان کو ضرور استعمال کرنی چاہیے۔ یہ گونگاپن کوڑھ۔ یرقان۔ بواسیر کھانسی تلی سوجن وغیرہ کو آرام کرتی ہے اور موٹی آواز کو صاف اور باریک کرتی ہے قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ ؏ خرچ ڈاک ۵؍ تین ڈبیوں کے خریدار کو خرچہ ڈاک معاف۔

سوزاک کی دوا

اس دوا کے سات روز استعمال کرنے سے کیسا ہی نیا اور پرانا سوزاک ہو فوراً آرام ہوجاتا ہے دو خوراک دوا کھاتے ہی پیشاب کی جلن۔ کرک اور پیلی رنگت جاتی رہتی ہے دھار کے ساتھ پیشاب ہونے لگتا ہے مواد و خون بند ہوجاتا ہے سات روز استعمال کرنے سے سوزاک بالکل صحت ہوجاتی ہے قیمت صرف دو روپیہ ؏ خرچہ ڈاک ۵؍ (نوٹ) پرچہ ترکیب استعمال ہر دوا کے ہمراہ روانہ کیا جاتا ہے۔

المشتہر

منیجر ہمالیہ ڈپو۔ مراد آباد۔ یوپی

۲۱۱۰۸ ب

۱۱۱۸۵ د

زمانہ ۱۹۱۶ء ۱۳۰۵

جلد ۲۶

زمانہ

[illegible]

[illegible]

۵۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان یا حاشیہ [illegible]

۶۔ قلمی نسخے اور [illegible] کی کتابیں جاری نہ کی جائیں گی [illegible]

[illegible] کتاب کا واپس [illegible] لازم ہے۔

[illegible]